
کالا چاند
سکندر اعظم کی سرزمین یونان میں بسنے والے
غیر قانونی پاکستانی مہاجرین کی داستان
رضوان علی گھمن
یورپ کی سیاحت کے شوقین افراد کے لیے
ایکشن رومانس اور ایڈوانچر سے بھرپور سفر نامہ

کالاچاند

ترکی کی بلند و بالا پہاڑیوں اور یونان کے ٹھنڈے سمندر کی آغوش میں

موت کی نیند سونے والے پاکستانی مہاجرین کی داستان

مہاجرین کے اصل دکھ سے آشنا کرواتا ایک بہترین سفرنامہ

ایک منفرد انداز سے لکھا گیا رومانٹک سفرنامہ

رضوان علی گھمن (جرمنی)

Whatsapp: *0049-152-11229099*
Facebook: *Rizwan Ali Ghuman*

پیش لفظ

کالا چاند بنیادی طور پر یونان میں رہنے والے پاکستانی مہاجرین کی داستان ہے۔سکندر اعظم کی سرزمین یونان ماضی میں ایک عظیم الشان اور دنیا کا طاقت ورترین ملک ہوا کرتا تھا۔ یونان یورپ کا پہلا مرکزی ملک ہے۔ایشیائی اورافریقی ممالک سے روزانہ سینکڑوں کی تعداد میں مہاجرین اس ملک میں داخل ہوتے ہیں۔ دس ہزار سے زائد چھوٹے بڑے جزائر پر مشتمل یہ خوبصورتی کی دولت سے مالا یورپی ملک غریب اور جنگ زدہ مسلمان مہاجرین کو مذہبی اور سیاسی بنیادوں پر پناہ فراہم کرتا ہے۔

یونان میں ایک مزدور کی ماہانہ آمدن ڈیڑھ لاکھ تک بن جاتی ہے۔اسی وجہ سے یہ پاکستانی نوجوانوں کے لئے ایک پُرکشش ملک ہے۔لیکن آج کے موجودہ دور میں مسلمان مہاجرین کو بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ترکی، یونان اوراٹلی کے سمندر ایسے سینکڑوں مہاجرین کو زندہ نگل چکے ہیں جو اچھے مستقبل کا خواب آنکھوں میں لئے سمندر کراس کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کالا چاند ناول ایسے ہی مہاجرین کی داستان ہے۔

میں اپنی اس کتاب کو یونان میں پاکستانی کمیونٹی کے چیئرمین جاوید اسلم آرائیں کے نام کرنا چاہتا ہوں۔ ایک صحیح پاکستانی لیڈر کی جھلک جاوید بھائی کے چہرے پر نظر آتی ہے۔ یونان میں رہنے والا ہر پاکستانی مہاجر اس شخص کی بہادری اور جرأت کو بخوبی جانتا ہے۔ جاوید اسلم آرائیں پاکستانی مہاجرین کے حقوق کے لئے آواز اٹھانے کے جرم میں درجنوں بار یونانی جیل کی ہوا کھا چکے ہیں۔ان کا پاسپورٹ کینسل ہوا، بلیک لسٹ ہوئے لیکن پھر بھی غریب مہاجرین کی مدد سے پیچھے نہیں ہٹے۔

یونانی مہاجرین پر لکھی گئی کتاب جاوید بھائی کے ذکر کے بغیر ادھوری ہو گی۔ جاوید اسلم آرائیں کی جدجہد کو انسانی حقوق کی سب سے بڑی تنظیم ایمنٹی انٹرنیشنل نے بھی مانا ہوا ہے۔ جاوید بھائی کو ایمنٹی انٹرنیشنل کی طرف سے بین الاقوامی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا ہے۔ کاش! پاکستان کے ایوانوں میں بھی ایسے ہی حکمران ہوتے تو آج ہم مہاجرین یوں پوری دنیا میں دربدر دھکے نہ کھا رہے ہوتے۔

کالا چاند ناول پاکستان کے ایک نوجوان مہاجر راضی کی داستان ہے۔ جو اپنے محبوب کو پانے کے لئے کے تاریک راستوں کا مسافر بن جاتا ہے۔ وہ کراچی سے نکلتا ہے اور ایران کے ریگستانوں اور ترکی کی پہاڑوں کی خاک چھانتا ہوا یونان پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ یونانی بارڈر پر موجود نہر کے کنارے پر وہ اپنے منہ بولے بھائی احمد سے جدا ہو جاتا ہے۔ احمد ترکی میں پکڑا جاتا ہے جبکہ راضی بارڈر کراس کر جاتا ہے۔ کالا چاند ناول میں آپ اس سے آگے کے سارے سفر کے واقعات کو تفصیل سے پڑھیں گے۔

کتاب کا کوئی جملہ یا پیراگراف اگر برا لگے تو برائے مہربانی نظر انداز کر دیں۔ بحیثیت انسان میں غلطی کر سکتا ہوں۔ پاکستان کی محبت اور درد اپنے دل میں محسوس کرتا ہوں اس لئے میری کتاب میں آپ کو بہت سی جگہوں پر یہ درد نظر آئے گا۔ اگر کتاب پسند آئے تو اپنے دوستوں اور چاہنے والوں سے ضرور شیئر کریں۔ آپ کی محبت ہی میری حوصلہ افزائی ہو گی۔ شکریہ!

رضوان علی گھمن

میں نہر کراس کر کے یونان میں داخل ہو گیا اور آہستہ آہستہ بارڈر سے دور ہونے لگا۔ احمد مجھ سے جدا ہو گیا تھا، میں واپس ترکی جانا چاہتا تھا لیکن میرا مقصد اور ایمان کی محبت مجھے واپس جانے نہیں دے رہی تھی۔ میں نے اپنا گھر ایمان کے لئے چھوڑا تھا اور اب ہر حالت میں مجھے آگے ہی بڑھنا تھا۔ اس لئے میں مسلسل آگے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

ابھی صبح کے 4 بج رہے تھے اور میں بارڈر سے کافی دور آ گیا تھا۔ مجھے جلد سے جلد جتنا ممکن ہو سکتا تھا بارڈر سے دور ہونا تھا۔ یہاں پر ابھی بھی خطرہ تھا۔ یونانی آرمی والے پکڑ لیتے تو وہ ترکی کی طرف پکڑ کر ڈیپورٹ کر دیتے۔ خطرہ یہاں پر بھی اتنا ہی تھا۔ اگر پکڑا جاتا تو ترکی اور پھر پاکستان ڈی پورٹ ہونا لازم تھا۔ اس لئے میں تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔

صبح کے 6 بجے کے قریب میں نے ریلوے لائین کو کراس کر لیا۔ یہ ریلوے لائین الیگزینڈروپلی سے نکلتی تھی اور پورے ترکی بارڈر کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی بلغاریہ چلی جاتی تھی۔ یہ ریلوے لائین ترکی اور بلغاریہ دونوں ملکوں کو یونان سے ملاتی تھی۔

قارئین میں سے کچھ لوگوں کو شاید حیرت ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ پورا یورپ ایسے ہی بنا ہوا ہے۔ ان ملکوں میں بارڈر لائین صرف ایک لائین کے علاوہ کچھ نہیں ہوتی۔ یہ لوگ بغیر کسی روک ٹوک کے روزانہ ہزاروں کی تعداد میں ایک دوسرے کے ملک میں داخل ہوتے ہیں۔ یونان کے بارڈر صرف ہم مہاجرین کی وجہ سے سیل ہیں ورنہ یونانی عوام کو پورے یورپ میں بغیر پاسپورٹ کے کہیں بھی جانے کی اجازت ہے۔ یہ لوگ صرف بس یا ٹرین کا ٹکٹ خریدتے ہیں اور ڈائریکٹ دوسرے ملک چلے جاتے ہیں۔ شاید ایک دن ہمارے پاکستان کے حالات بھی ٹھیک ہو جائیں اور ہم پاکستانی بھی بغیر پاسپورٹ کے اپنے ہمسایہ ممالک میں جا سکیں۔

میں نے ریلوے لائین کو کراس کر لیا۔ میں یونان کے ایک سرحدی گاؤں ''ساکوس'' سے گزر رہا تھا۔ یونانی علاقے میں مکئی کے کھیت نہیں تھے۔ یہاں پر ہر طرف گندم کے کھیت ہی پھیلے ہوئے تھے۔ میں کھیتوں کے درمیان سے گزر رہا تھا۔ ابھی صبح کی روشنی پھیلنے میں کچھ ٹائم رہ گیا تھا۔ یہاں پر چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں۔ میں ایک پہاڑی پر چڑھ گیا اور جھاڑیوں میں جا کر بیٹھ گیا۔ مجھے سارا دن یہیں گزارنا تھا۔ یہ پہاڑی

گاؤں سے تقریباً تین کلومیٹر کے فاصلے پر تھی اور یہاں پر دیکھ لئے جانے کا کوئی امکان نہیں تھا اس لئے میں یہیں بیٹھ گیا۔

تقریبا ایک گھنٹے تک مجھے اپنے ارد گرد کسی کے چلنے کی آہٹ محسوس ہوئی تو میں چوکنّا ہو گیا اور محتاط ہو کر نیچے لیٹ کر جھاڑیوں سے باہر دیکھنے لگا۔ مجھے فوجی بوٹ نظر آئے اور میرے اوسان خطا ہو گئے۔ مجھے دیکھ لیا گیا تھا اور وہ سب آہستہ آہستہ جھاڑیوں کی طرف بڑھ رہے تھے تا کہ مجھے پکڑ سکیں۔ وہ سب میرے لئے یہاں تک آئے تھے۔ اس لئے جھاڑیوں میں چھپا رہنا فضول تھا۔ وہ تھوڑی دیر میں ہی میرے سر پر پہنچ جاتے اور مجھے گردن سے پکڑ لیتے۔ اس لئے میں جلدی سے جھاڑیوں سے باہر نکلا اور ان کی مخالف سمت میں بھاگنے لگا۔

انہوں نے مجھے بھاگتے ہوئے دیکھ لیا اور وہ بھی میرے پیچھے بھاگنے لگے۔ انہوں نے رائفلیں کندھے سے اتار لیں تھیں اور اونچی آواز میں مجھے شوٹ کرنے کی دھمکی دے رہے تھے لیکن مجھے اپنی جان کی کہاں پرواہ تھی۔ اگر موت کا اتنا ہی خوف ہوتا تو کبھی بھی پاکستان سے باہر نہ نکلتا۔ میں اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر پاکستان سے باہر نکلا تھا۔ یونان سے واپس ڈی پورٹ ہونا موت کے برابر تھا اور میں ان فوجیوں سے جان بچا کر بھاگ رہا تھا۔

فوجی تعداد میں پانچ کے قریب تھے۔ وہ مسلسل میرے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ میں پہاڑی سے نیچے اترا تو یہاں پر بھی فوجی کھڑے تھے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی میری طرف بھاگے۔ میں نے ان کو دیکھ کر اپنا راستہ بدلہ اور دوسری طرف بھاگنے لگا۔ یہاں پر کچی سڑکوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ ہر دو یا تین کھیتوں کے بعد سڑک نکلتی تھی۔ آرمی کی تین گاڑیاں تھیں۔ وہ میرے دائیں اور بائیں دونوں اطراف سے آگے نکل گئیں جبکہ پیچھے پیادہ فوجی تھے۔ آگے جا کر گاڑیاں رک گئیں اور انہوں نے آگے سے راستہ بلاک کر دیا۔

صرف 15 منٹ کی کوشش سے ہی ان لوگوں نے مجھے پکڑ لیا اور زمین پر لٹا کر بوٹوں سے میری تواضع کرنے لگے۔ میں نے ان فوجیوں کو 15 منٹ تک بھگایا تھا اور اب یہ فوجی اپنا سارا غصہ میرے اوپر نکال رہے تھے۔ میں زمین پر ان کی لاتیں اور ٹھڈے برداشت کر رہا تھا اور میری آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے۔

زندگی نے سیدھا چلتے چلتے ایک بار پھر بریک لے لیا تھا۔فوجی مسلسل مجھے گالیاں دے رہے تھے اور ٹھڈے مار رہے تھے اور میں زمین پر پڑا اپنی بے بسی پر ماتم کر رہا تھا۔ مجھے ان کی گالیاں اور ٹھڈے اذیت نہیں دے رہے تھے۔اس سے کہیں زیادہ ذلّت میں اپنی زندگی میں برداشت کر چکا تھا۔ مجھ پر اب کسی بھی قسم کی ذلّت اثر ہی نہیں کرتی تھی۔صرف ڈی پورٹ ہونے کی بے بسی ہی مجھے رُلا رہی تھی۔ان فوجیوں نے بڑی محنت سے مجھے گھیرا ڈال کر پکڑا تھا اور اتنی محنت انہوں نے مجھے چھوڑنے کے لئے تو نہیں کی تھی۔ وہ مجھے بارڈر پر ترکی آرمی کے حوالے کر دیتے اور ترکی سے میں ڈائریکٹ پاکستان ڈی پورٹ ہو جاتا۔ میں یورپی یونین کی سرحد کے اندر آ کر ڈی پورٹ ہونے لگا تھا۔

دس پندرہ منٹ تک مار مار کر جب ان فوجیوں کے دل کی بھڑاس نکل گئی تو انہوں نے میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈالی اور مجھے اٹھا کر گاڑی میں بٹھا لیا۔ان فوجیوں نے ایک عارضی کیمپ اور ستیادہ گاؤں سے باہر لگایا ہوا تھا۔وہ مجھے لے کر وہاں چلے گئے۔

یہ ایک چھوٹا سا احاطہ تھا۔جس کے ایک طرف پانچ کمرے بنے ہوئے تھے۔ احاطے کی تقریبا 10 فٹ کی اونچی دیواریں تھی جن کے اوپر خاردار تار لگی ہوئی تھی۔اندر صرف دو کمرے دفتر کے طور پر استعمال ہوتے تھے جبکہ باقی تینوں کمرے سیل تھے۔جن کے آگے لوہے کی سلاخوں والے دروازے لگے ہوئے تھے۔ یہاں پر مجھ سے پہلے بھی پچاس کے قریب لڑکے پکڑ کر لائے گئے تھے۔ یہ سارے لڑکے پاکستان، افغانستان اور کچھ عرب ممالک سے آئے ہوئے تھے۔

مجھے پہلے ایک کمرے میں لے جایا گیا جہاں ایک فوجی افسر میز کی دوسری جانب بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے اس فوجی افسر کے رینک کا پتہ نہیں کیونکہ ان لوگوں کی وردی کے سٹار کچھ مختلف ہوتے ہیں۔اس کے کندھے پر دو پٹیاں لگی ہوئی تھی۔

پاکستان میں تو دو پٹیوں والے نائیک رینک کے جوان ہوتے ہیں۔ یہ آفیسرز نہیں ہوتے لیکن یہاں پر دو پٹی والے آفیسرز ہی ہوتے ہیں۔لیکن بحرحال مجھے زیادہ تفصیل کا علم نہیں ہے۔اس آفیسر نے مجھے میرا نام اور ملک کا پوچھا تو میں نے اسے غلط نام اور غلط شہریت بتائی۔ جسے اس نے بغیر تصدیق کے لکھ لیا اور مجھے باقی لڑکوں کے ساتھ سیل میں بند کر دیا گیا۔ یہاں پر پہلے بھی پچاس کے قریب لڑکے موجود تھے۔

ابھی تقریباً آٹھ بجے تھے۔ ناشتہ ان پولیس والوں نے 9 بجے کے قریب دیا۔ یہ ویسا ہی ناشتہ تھا جیسا ترکی میں ملتا ہے۔ بریڈ، جام، ابلا ہوا انڈا اور جوس کا ایک پیکٹ۔ دوسرے لڑکوں کو صبح 4 بجے کے قریب پکڑا تھا۔ یہ لڑکے بارڈر کراس کر کے گاڑی میں بیٹھ گئے تھے لیکن ان کی قسمت خراب تھی۔ گاڑی صرف 10 منٹ ہی چلی تھی اور پکڑی گئی۔ ڈرائیور گاڑی چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ وہ نہیں پکڑا گیا تھا لیکن لڑکے سارے پکڑے گئے تھے۔ ان لڑکوں کے نام وغیرہ لکھ لیے گئے تھے۔ آج رات کو ہم سب کو ترکی ڈی پورٹ کر دیا جانا تھا۔

ناشتہ کر کے میں سیل کی ایک دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ ماضی ایک بار پھر پوری شدت سے یاد آ رہا تھا۔ ایمان کی بہت یاد آ رہی تھی۔ اس کی معصوم سی شرارتیں یاد آ رہی تھیں، اسکی محبت یاد آ رہی تھی اور میں زیرِ لب مسکرا رہا تھا۔ باقی لڑکے میری حالت دیکھ کر افسوس کر رہے تھے۔ انہیں لگ رہا تھا شاید میں پاگل ہو گیا ہوں۔ واقعی میں پاگل ہو گیا تھا۔ پچھلے سات مہینے کی ساری محنت ضائع ہو گئی تھی اور میں پاکستان ڈی پورٹ ہو رہا تھا۔

ناشتے کے بعد ان لوگوں نے شام کے چھ بجے کے قریب جا کر کھانا دیا۔ یہ لوگ کھانا صرف 2 ٹائم کا دے رہے تھے۔ رات کو بارہ بجے کے قریب ہم سب لڑکوں کو باہر نکال کر ایک بڑی فوجی گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ یہ چاروں طرف سے مکمل بند تھی۔ باہر بھاگنے کا کوئی چانس نہیں تھا۔ یہاں سے بارڈر 15 منٹ کے فاصلے پر ہی تھا جبکہ گاڑی 20 منٹ میں بارڈر پر پہنچ گئی۔

میں گاڑی سے نیچے اترا اور اپنے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ یہاں پر آرمی کی 6 گاڑیاں تھیں۔ نہر کے اوپر ایک چھوٹا سا پل بنا ہوا تھا جہاں سے دو گاڑیاں آسانی سے گزر سکتی تھیں۔ یونانی آرمی کی گاڑیاں پل کے اوپر یونانی سرحد کی طرف کھڑی ہوئی تھیں۔ میرے سامنے دوسری طرف ترکی کی ایک بڑی پولیس کی گاڑی اور دو چھوٹی کاریں کھڑی تھیں۔ ہم سب لڑکوں کو پانچ پانچ کے گروپ میں پل کے دوسری طرف بھیجا جانے لگا۔ میری باری چھٹے گروپ میں تھی۔ میں باقی لڑکوں کے ساتھ آہستہ آہستہ پل کراس کر کے ترکی کی طرف جانے لگا۔ یورپ سے ہو کر میں واپس ایشیاء کی طرف جا رہا تھا۔

ہم پانچ لڑکوں کے ساتھ پانچ آرمی والے بھی سفر کر رہے تھے۔ ایک ایک لڑکے کے حصے میں ایک ایک فوجی تھا۔ ان فوجیوں نے ہمیں چاروں طرف سے گھیرا ہوا تھا اور وہ ہمیں اسی گھیرے میں لیکر آگے بڑھ

رہے تھے۔ میں نے ان فوجیوں کے درمیان میں سے نہر کی طرف دیکھا۔ یہاں پر دونوں طرف پچاس کے قریب فوجی اور پولیس والے کھڑے تھے۔ جو ترکی اور یونان دونوں اطراف میں موجود تھے۔ لیکن جب اتنی سختیاں برداشت کر کے یہاں تک پہنچ گیا تھا تو پھر اتنی آسانی سے اس طرف جانے کو دل نہیں کر رہا تھا۔ اتنی جلدی ہار ماننے کو دل نہیں کر رہا تھا۔

''راضی صاحب! کچھ تو کرو!'' میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

ہم سب لڑکے پل کے درمیان آ گئے تھے۔ میں نے فوجیوں کے درمیان سے باہر جھانکا اور پھر اچانک پوری قوت سے ایک طرف والے فوجی کو دھکا دے دیا۔ فوجی اس اچانک حملے کے لئے تیار نہیں تھا اس لئے وہ سڑک پر گر گیا۔ میں نے جلدی سے اس کے اوپر سے چھلانگ لگائی اور پل کے کنارے پر آ گیا۔ صرف پانچ فٹ نیچے 50 فٹ چوڑی نہر پورے زور وشور سے بہہ رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ دوسرے فوجی سنبھلتے اور میری طرف بڑھتے، میں نے پل سے نیچے نہر میں چھلانگ لگا دی۔ مجھے ایک سیکنڈ لگا نہر کے پانی تک پہنچنے میں اور میں نے ایک لمبا سانس لے کر پانی میں غوطہ لگا دیا اور تیزی سے پانی کے اندر ہی اندر آگے کی طرف بڑھنے لگا۔ میں جلدی سے اس جگہ سے زیادہ سے زیادہ دور نکل جانا چاہتا تھا۔

تقریباً دو منٹ تک میں مسلسل پانی کے اندر ہی اندر آگے بڑھتا رہا۔ آخر میرے پھیپھڑوں نے کام کرنا بند کر دیا۔ میں سانس لینے کے لئے جیسے ہی اوپر نکلا اسی وقت مجھے پانی میں کچھ لوگوں کے کودنے کا احساس ہوا۔ میں جلدی سے پھر پانی کے اندر چلا گیا لیکن اس بار ان کو اندازہ ہو چکا تھا اور وہ چار پانچ فوجی جنہوں نے مجھے دیکھتے ہی نہر میں چھلانگ لگائی تھی وہ کنارے پر صرف میرا دوبارہ اوپر نکلنے کا ہی انتظار کر رہے تھے۔ جیسے ہی میں سانس لینے کے لئے اوپر اٹھا انہیں میری جگہ کا اندازہ ہو گیا۔

باہر کنارے پر کھڑے دوسرے فوجیوں کے پاس سرچ لائٹیں تھیں اور ان کی روشنی میں پوری نہر روشنی میں نہائی ہوئی تھی۔ مجھے باہر سر نکالتے ہی دیکھ لیا گیا اور ان فوجیوں نے اگلے ہی پل میں مجھے پھر سے پکڑ لیا۔ ان فوجیوں نے مجھے سر کے بالوں سے پکڑا اور دوبارہ پانی میں ڈبو دیا۔ انہوں نے کنارے تک پہنچنے میں چار پانچ منٹ لگا دیئے اور مجھے ایک لمحے کے لئے بھی باہر سر نہیں نکالنے دیا۔ مجھے دس بارہ غوطے آئے۔ پانی میرے پیٹ میں چلا گیا تھا۔ میں پانی سے باہر سر نکالنے کے لئے زور لگاتا رہا لیکن وہ تعداد میں بہت زیادہ

تھے اور ان لوگوں نے ایک سیکنڈ کے لئے بھی میرا سر باہر نہیں آنے دیا۔ میں نے ان فوجیوں کو آدھی رات کو ٹھنڈے پانی میں چھلانگ لگانے پر مجبور کیا تھا اس لئے اب وہ بھی بدلہ لے رہے تھے۔

نہر کے کنارے پر لا کر انہوں نے مجھے باہر اچھالا تو کنارے پر کھڑے دوسرے فوجیوں نے مجھے پکڑ لیا۔ میں کنارے پر آتے ہی زور زور سے سانس لینے لگا۔ غوطوں کی وجہ سے میں ادھ مرا سا ہو گیا تھا اس لئے بغیر کوئی حرکت کئے لیٹا رہا۔ نہر میں چھلانگ لگانے والے فوجی نہر سے باہر آئے تو انہوں نے مجھے پکڑ کر کھڑا کیا اور دوبارہ پل کی طرف لے جانے لگے۔ باہر نکل کر انہوں نے مجھے مارنے سے گریز کیا تھا۔ یہاں پر دو ملکوں کی سیکورٹی فورسز معمور تھیں اس لئے انہوں نے انسانی حقوق کی خلاف ورزی نہیں کی۔ وہ خاموشی سے مجھے چلاتے ہوئے دوبارہ پل پر لے آئے۔

جس فوجی کو میں نے دھکا دے کر نہر میں چھلانگ لگائی تھی وہ پل کے ایک پلّر سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوا تھا اور مسلسل مجھے گھور رہا تھا۔ ایک چھوٹا سا مہاجر لڑکا اس کو گرا کر بھاگ گیا تھا۔ یہ اس کے لئے بہت شرم کی بات تھی۔

''سوری سر! ایک کوشش کرنا تو میرا حق بنتا ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے اونچی آواز میں کہا تو اس نے نفرت سے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ باقی سارے فوجی مسکرانے لگے۔

اس بار پانچ کی بجائے دس فوجی مجھ اکیلے کو نہر کا پل کراس کروا رہے تھے۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا ترکی کی حدود میں داخل ہو گیا۔ اس طرف ترکی پولیس کھڑی تھی۔ انہوں نے مجھے رسیو کیا اور گیلے کپڑوں کے ساتھ ہی گاڑی میں سوار کروا دیا۔ میرے گیلے کپڑوں کی وجہ سے دوسرے لڑکے مجھ سے دور دور کھڑے ہونے کی کوشش کر رہے تھے لیکن ایک گاڑی میں پچاس لڑکے بہت زیادہ تھے۔ جب باقی لڑکے بھی گاڑی میں سوار ہو گئے تو ہم ایک دوسرے سے جڑ کر کھڑے ہوئے تھے۔ میرے ساتھ جڑ کر کھڑے لڑکے مسلسل مجھ سے لڑ رہے تھے کیونکہ میری وجہ سے ان کے کپڑے بھی گیلے ہو گئے تھے۔

پولیس والے ہمیں لے کر ایک بار پھر ایلسیلی آ گئے۔ یہ وہی احاطہ تھا جہاں کل میں احمد کے ساتھ تھا۔ مجھے اور احمد کو کل یہیں سے فوجی گاڑی میں ایڈرن کی طرف لے جایا گیا تھا جہاں سے میں یونان پہنچ گیا اور احمد پکڑا گیا تھا۔ دوسرے دن میں یونان سے پکڑا گیا اور آج رات واپس ترکی ڈی پورٹ ہو گیا۔

یہاں پر مجھے پھر احمد مل گیا۔ وہ ابھی تک اسی کیمپ میں موجود تھا۔ کل رات کو کوئی ڈنکی نہیں پکڑی گئی تھی اس لئے انہوں نے احمد کو اکیلے ایڈرن نہیں بھیجا تھا۔ اس کیمپ میں احمد کے علاوہ تین اور لڑکے تھے جو جنگل میں مختلف جگہوں پر چھپے ہوئے تھے اور رات کو باہر نکلتے ہی پکڑے گئے تھے۔ احمد مجھے دیکھتے ہی بھاگ کر میرے گلے لگ گیا اور زور زور سے رونے لگا۔

''بھائی! خدا نے ہم دونوں کی قسمت ایک ہی کاغذ پر لکھ دی ہے۔ اس لئے بار بار وہ تجھے مجھ سے ملا رہا ہے۔'' وہ مسلسل میرے گلے سے لگا رو رہا تھا اور میں آہستہ آہستہ اس کی پیٹھ تھپتھپا کر اسے دلاسے دے رہا تھا۔

احمد مجھے ایران میں ملا تھا۔ میں نے اس کے گاؤں میں تقریباً دو مہینے سبزی کا کام کیا تھا۔ 18 سالہ اس کردلڑکے سے مجھے بہت محبت تھی۔ اس لڑکے کی وجہ سے میں ایران سے لے کر استنبول تک پہنچا تھا۔ اس کا چچا ایجنٹ تھا اور اس نے احمد کی وجہ سے مجھ سے استنبول تک ایک روپیہ بھی نہیں لیا تھا۔ (احمد کی ساری داستان میں اپنی دوسری کتاب ''مہاجر'' میں لکھ چکا ہوں۔ میری داستان پہلی کتاب ''دوسرا خدا'' سے شروع ہوتی ہے اور دوسری کتاب مہاجر پر ختم ہو جاتی ہے۔ انٹرنیٹ پر موجود میری دونوں کتابوں کو پہلے پڑھ لیں تو آپ کو اس سفر کا زیادہ مزہ آئے گا)

''راضی بھائی! مجھے آپ سے محبت ہے۔ دنیا کا کوئی بارڈر کوئی قانون ہم دونوں بھائیوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کر سکتا۔'' وہ ابھی تک میرے گلے سے لگا رو رہا تھا۔ میں نے اس کو اپنے سینے سے الگ کیا اور دونوں ہاتھوں سے اس کے چہرے کو تھام لیا۔ اس کی بڑی بڑی روشن آنکھوں میں بڑے بڑے آنسو تھے۔

''احمد! خدا نے مجھے تین بھائی دیئے ہیں لیکن مجھے ان تینوں بھائیوں میں سب سے زیادہ پیار تجھ سے ہے۔ تو میرا کچھ بھی نہیں لگتا۔ حالانکہ تمہارا اور میرا ملک بھی ایک نہیں ہے، زبان بھی ایک نہیں ہے۔ لیکن پتہ نہیں کیوں مجھے بھائی کہنے میں جو مزا آتا ہے اسے شاید میں لفظوں میں بیان ہی نہیں کر سکتا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں آتے ہوئے آنسوؤں کو صاف کیا اور اس کا ماتھا چوم لیا۔ ہم دونوں کمرے کی ایک دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد ایک پولیس والا ایک ٹراؤزر اور ایک موٹی سی جرسی لے کر آ گیا۔

''نام کیا ہے تمہارا اور کس ملک سے آئے ہو؟'' اس نے میرے ہاتھ میں کپڑے پکڑاتے ہوئے پوچھا۔

''عمران علی، ایران سے آیا ہوں۔'' میں نے اس کے ہاتھ سے کپڑے لے لئے۔

پولیس والے بھی آخر انسان ہی ہوتے ہیں۔ انہیں میرے گیلے کپڑوں کا احساس تھا۔ میں ساری رات ایسے ہی گیلے کپڑوں میں رہتا تو صبح تک بیمار ہو جاتا۔ انہیں مجھ پر ترس آ گیا اور انہوں نے ایک ٹراؤزر اور جرسی پہننے کے لئے دے دی۔

''وہ تم ہی تھے جس نے کل گاڑی سے چھلانگ لگا دی تھی اور نہر کراس کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے؟ تم ایک بار اس لڑکے کے لئے واپس بھی آئے تھے لیکن پھر واپس چلے گئے؟'' پولیس والے نے اشتیاق سے پوچھا۔

''نہیں، وہ کوئی اور لڑکا ہوگا۔۔۔ میں وہ نہیں ہوں۔'' میں نے نارمل لہجے میں اسے جواب دیتے ہوئے کہا۔

''نہیں! میں نے تمہیں پہچان لیا ہے بلکہ سب نے تجھے پہچان لیا ہے۔ تم دونوں کی داستان کل سے پورے کیمپ میں پھیلی ہوئی ہے۔ ہم سارے پولیس والے کل سے اس لڑکے کی خدمت کر رہے ہیں اور اس کا دل بہلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ واقعی اس دنیا میں ابھی بھی کچھ بے لوث محبتیں ہوتی ہیں۔'' پولیس والے نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

ساری دنیا ہی محبتوں کو مانتی تھی لیکن جس شخص سے محبت تھی صرف وہی ایک تھی جسے اس محبت کا پتہ نہیں تھا۔ یا شاید محبت کی تھوڑی اور آزمائش باقی تھی۔ میں نے اپنا گھر بار، ماں باپ سب کچھ اس محبت کے لئے چھوڑ دیئے تھے۔ اس محبت کی خاطر آج ساری دنیا کے دھکے کھا رہا تھا۔ اسی محبت کو ابھی تک ترس نہیں آ رہا تھا۔ ایمان آج بھی میرے دل میں بستی تھی۔ میں اس ایک لڑکی کے لئے اپنی پوری زندگی تباہ کر سکتا تھا۔ مجھے ایمان سے اتنی محبت تھی جس کا شاید کوئی عام انسان اندازہ بھی نہیں لگا سکتا۔ یہ وہی محبت تھی جو مجھے ایلسلی گاؤں کے اس ٹھنڈے سیل میں سردی سے کپکپا رہی تھی۔

”نہیں سر! میں وہ لڑکا نہیں ہوں۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔“ میں خاموشی سے کپڑے بدلنے لگا۔

مجھے ڈر تھا کہ کہیں پولیس کی کسٹڈی سے فرار ہونے کا کوئی جرم لگا کر ہم دونوں کو جیل نہ بھیج دیں کیونکہ ایسا کوئی بھی کیس رجسٹر نہیں ہوتا تھا۔ ہر روز لڑکے پولیس کے ہاتھوں سے فرار ہو جاتے تھے۔ ویسے بھی ہم کون سا کوئی خطرناک مجرم تھے۔ بس غریب ملکوں کے غریب سے لڑکے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جج ہمارا کیس ہی نہیں سنتے تھے۔ صرف پولیس یا آرمی والے ہی کبھی کبھار مارتے تھے اور اچھا خاصہ مارتے تھے۔ جج یا بڑے پولیس آفیسرز چونکہ پڑھے لکھے لوگ ہوتے ہیں اور یہ ہم غریب لڑکوں پر ترس کھا جاتے ہیں۔ مجھے ان سب چیزوں کا پتہ تھا لیکن پھر بھی میں جان بوجھ کر کوئی مصیبت مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ ان کے پاس میرے بھاگنے کا کوئی ثبوت نہیں تھا اور وہ کبھی بھی یہ ثابت نہیں کر سکتے تھے تو پھر میں کیوں مان جاتا۔

”میرے دوست! ابھی جب تم دونوں کے نام اور شہریت لکھی جائے گی تو اپنا ملک لبنان بتانا! ہم یہاں سے لبنان لکھ کر بھیجیں گے۔ استنبول میں تمہیں 40 دن کا سٹے مل جائے گا۔ تم ان چالیس دنوں میں پھر بارڈر کراس کرنے کی کوشش کرنا، شاید اگلی بار کامیاب ہو جاؤ۔“ پولیس والے نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور خاموشی سے باہر چلا گیا۔ میں نے کپڑے تبدیل کر لئے تھے اور گیلے کپڑے باہر کھڑے ایک پولیس والے کو دے دیئے جس نے انہیں باہر لگی ایک تار پر لٹکا دیا۔

رات کافی ہو چکی تھی اور ہم دونوں ایک کونے میں جا کر لیٹ گئے۔ تقریباً چار گھنٹے تک مسلسل باتیں کرتے کرتے احمد کو نیند آ گئی اور وہ سو گیا۔ احمد کے سونے کے بعد میں بھی سونے کی کوشش کرنے لگا اور نیند سے لڑتے لڑتے آخر کار تقریباً صبح کے چار بجے کے قریب میں بھی سو گیا۔

آٹھ بجے ترکی پولیس والوں نے ہمیں جگا دیا اور ناشتے کا لفافہ دینے لگے۔ میں نے اپنا اور احمد کا لفافہ رسیو کیا۔ احمد ابھی تک سو رہا تھا اور میں نے اسے سونے دیا۔ پولیس والے ایک ایک لڑکے کو باہر لے جا کر اس کا نام اور پتہ لکھ رہے تھے۔ ڈیڑھ بجے کے قریب پہلے میری باری آئی تو میں اٹھ کر باہر چلا گیا۔ میں نے اپنا ملک لبنان ہی بتایا۔ میں ایک بار اس پولیس والے پر اعتبار کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے اپنا نام اور پتہ لبنان کا ہی بتایا۔

ملک شام کے مغربی کنارے پر لگنے والا یہ چھوٹا سا عرب ملک ہے جس کی جنوبی سرحد اسرائیل کو لگتی

ہے۔لبنان سے صرف دو سو کلومیٹر کے فاصلے پر قبرص جزیرہ ہے۔جس پر ترکی اور یونان دونوں ملکوں نے دعویٰ کیا ہوا ہے۔اس دور میں یہاں کے سٹوڈنٹ ویزے لگتے تھے۔قبرص میں بھی مزدوری اچھی بن جاتی تھی۔اس کے علاوہ لوگ قبرص سے یونان کی سپیڈ بوٹ کی گیم بھی کرتے تھے۔

میں نے اپنا ایڈریس لبنان کا ہی لکھوایا تھا جسے اس پولیس والے نے خاموشی سے لکھ لیا۔

''اے سنو!'' میں واپس جانے کے لئے مڑا تو اس نے مجھے آواز دی۔

''تم اور وہ ایرانی لڑکا بھائی ہو؟ اس رات نہر تم نے ہی کراس کی تھی؟'' اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں سر! وہ میں نہیں تھا۔'' میں نے اس بار پھر انکار کر دیا۔

''راضی، اس رات احمد تجھے راضی کے نام سے ہی پکار رہا تھا اس لئے ہمیں معلوم ہے تمہارا نام راضی ہے۔یقین کرو پچھلے دو سال سے میں یہاں ڈیوٹی دے رہا ہوں۔ہم نے ہزاروں کی تعداد میں لڑکوں کو پکڑا ہے اور ڈی پورٹ کیا ہے۔یہ ہمارا کام ہے اور ہمیں اسی کام کے پیسے ملتے ہیں۔لڑکوں کو پکڑ پکڑ کر اور ان کی چیخ و پکار سن سن کر ہمارے دل سخت ہو چکے ہیں۔ہم پر کوئی بھی چیز اثر نہیں کرتی لیکن یقین کرو اس رات سے لے کر آج تک میں ٹھیک سے سویا نہیں ہوں۔اندر بیٹھے ہوئے اس لڑکے احمد کی چیخیں ابھی بھی میرے کانوں میں گونج رہی ہیں۔اس رات تم دونوں کی بے بسی دیکھ کر ہم سب کا سکون غارت ہو گیا تھا۔تم تو اس رات چلے گئے تھے لیکن پیچھے اس لڑکے کی بے بسی دیکھ کر ہمیں اپنی اس نوکری سے ہی نفرت ہو گئی ہے۔ہماری پولیس کی نوکری تمہیں چھوڑ نہیں سکتی۔ہم فرض کے ہاتھوں مجبور ہیں لیکن کم از کم آپ سے معافی تو مانگ سکتے ہیں اور اس لئے میں تم سے معافی مانگ رہا ہوں۔'' مجھے اچانک ہنسی آ گئی اور میں مسکرانے لگا۔زندگی کبھی کبھی بہت بڑا مذاق کر دیتی ہے اور انسان اپنی بے بسی پر بے اختیار مسکرانے لگتا ہے۔مجھے بھی ہنسی آ گئی تھی اور میں مسکراتا چلا گیا۔

''میرے دوست! آپ ٹھیک تو ہیں؟'' پولیس والے کو میری ذہنی کیفیت پر شک ہونے لگا۔

''ہاں! میں ٹھیک ہوں سر۔۔۔بس ایسے ہی کچھ یاد آ گیا۔'' میں نے اپنی آنکھ سے نکلنے والے آنسو کو

ہاتھ سے صاف کیا اور واپس سیل میں آ گیا۔

میرے بعد احمد نام و پتہ لکھوانے کے لئے چلا گیا۔ میں نے اس کو بھی لبنان کا پتہ لکھوانے کا کہا تھا۔ احمد چونکہ کرد تھا اس لئے اسے عربی زبان بھی آتی تھی اور لبنان میں عربی زبان ہی بولی جاتی تھی۔ اس نے مجھے اپنا بھائی لکھوایا۔ دو بجے کے قریب ایک بڑی فوجی گاڑی ہمیں ایڈرن لے جانے کے لئے آ گئی۔ گاڑی کے اوپر اس بار ترپال لگی ہوئی تھی اور پیچھے چار پولیس والے بیٹھے ہوئے تھے۔ اس بار بھاگنے کا کوئی موقع نہیں ملا تھا اور ہم دونوں ایڈرن آ گئے۔

یہاں پر ایک بڑا اور مستقل کیمپ تھا۔ ایک لاکھ ستر ہزار کی آبادی والے اس شہر کو یونانی زبان میں آوریانو پولی بھی کہتے ہیں۔ یہ شہر یونان اور بلغاریہ کے بارڈر پر موجود ہے۔ یہاں کی 73 فیصد آبادی کا انحصار زراعت پر ہے۔ ہمیں اس شہر کے کیمپ میں صرف ایک دن رکھا گیا۔ دوسرے دن ہمیں پولیس کی بند گاڑی میں استنبول پہنچا دیا گیا۔ استنبول میں ہمیں دو دن رکھا گیا اور تیسرے دن ہمارے ہاتھ میں 40 دن کا سٹے پکڑا کر ہمیں چھوڑ دیا گیا۔

میں احمد کا ہاتھ پکڑ کر کیمپ کے باہر کھڑا تھا اور حیران ہو رہا تھا۔ مجھے سٹے ملنے کی امید نہیں تھی۔ استنبول میں ہمارا لبنان کا اندراج کرنے والے پولیس والے کو بھی پتہ تھا کہ ہم لبنان کے نہیں ہیں۔ وہ آدمی بہت اچھا تھا۔ وہ دوسرے پاکستانی یا افغانی لڑکوں کو بھی لبنان کا رہائشی لکھ رہا تھا۔ استنبول کی گورنمنٹ صرف لبنان کے شہریوں کو سیاسی پناہ دے رہی تھی اور ہم پاکستانی اور افغانی لڑکے اس موقع کا پورا فائدہ اٹھا رہے تھے۔ اس پورے کیمپ میں لبنانی تو پانچ فیصد بھی نہیں تھے لیکن کاغذوں میں 90 فیصد سے زائد لبنانی اس کیمپ میں رہ رہے تھے اور سیاسی پناہ لے رہے تھے۔

ہم دونوں باقی لڑکوں کے ساتھ کیمپ سے باہر نکلے اور مین شہر جانے والے راستے پر پیدل چل پڑے۔ ہم دونوں کے پاس ترکی کرنسی موجود تھی۔ ترکی اور یونان کی پولیس جیسی بھی ہے، اچھی ہے یا بری، ان میں کرپشن اور رشوت بالکل نہیں ہے۔ رشوت کا تصور بھی ان دونوں ملکوں کی پولیس کو نہیں ہے۔ آپ کی جیب میں ایک روپیہ ہے یا ایک لاکھ، کسی پولیس والے کی جرأت نہیں ہوتی کہ وہ آپ سے لے لے۔

یورپ میں جتنے بھی عوامی محکمے ہیں ان میں رشوت کا تصور ہی موجود نہیں ہے۔ سرکاری ملازم عوام کی

عزت کرتے ہیں۔ اگر کسی ملازم کے خلاف دو تین شکائتیں آجائیں تو اسے معطل نہیں کرتے بلکہ نوکری سے ہی نکال دیتے ہیں اور انکوائری ثابت ہو جانے کی صورت میں جیل بھیج دیتے ہیں۔ معطل کرنے کا رواج صرف پاکستان اور انڈیا میں ہی ہوتا ہے۔ جہاں پر سرکاری ملازم گورنمنٹ کا جوائی بن جاتا ہے۔ گورنمنٹ نے اسے نوکری کی صورت میں لڑکی دی ہوتی ہے اور یہ سرکاری جوائی دفتروں میں فرعون بن کر گھومتے رہتے ہیں۔

ہماری گورنمنٹ اور کچھ کرے یا نہ کرے ہر سال 30 فیصد تنخواہ ضرور بڑھاتی ہے۔ شاید آپ لوگ میرے نظریے سے اختلاف کریں لیکن یہ حقیقت ہے۔ جب تک یہ سرکاری ملازم ایک مزدور سے کم تنخواہ نہیں لیں گے تب تک یہ مزدور کو عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھیں گے۔ بڑے بڑے زمینداروں اور پیسے والوں کے بیٹے اگر نوکری کریں گے تو کاروبار کون کرے گا؟ ملک نوکریوں سے نہیں بلکہ کاروبار سے چلتے ہیں۔ خدارا سرکاری نوکری کی تنخواہ اور مراعات کم کرو تاکہ ہمارے ملک کا امیر اور پڑھا نوجوان سرکاری نوکری کی بجائے کاروبار کرے اور دوسرے غریب لوگوں کی نوکری اور روزگار کا وسیلہ بنے۔

کوئی تو ایک بجٹ ایسا بنے جس میں 30 فیصد اضافے کی بجائے 30 فیصد کمی کا اعلان ہو۔ جب کوئی نوکر ٹھیک کام نہیں کرتا تو اسے ہم کام سے نکال دیتے ہیں تو پھر ان سرکاری ملازموں کو کیوں نہیں نکال سکتے؟ جو کام کرتا ہے وہ تھوڑی سی تنخواہ پر کام کرے اور جو نہیں کرتا اسے باہر نکالو اور کسی غریب مزدور کو جگہ دو۔ جو کاروبار کی صلاحیت نہیں رکھتا، کم تنخواہ پر بھی گزارہ کر سکتا ہے اور کام بھی اچھا کر سکتا ہے۔

ہزاروں کی تعداد میں نوکریوں سے باہر نکالو گے تو ملک کے حالات خود بخود ٹھیک ہو جائیں گے۔ گورنمنٹ کے ان جوائیوں کو جوائی کی بجائے نوکر بناؤ اور انہیں ایک نوکر کی ہی تنخواہ دو۔ تب یہ لوگ ہم عوام کی بات دفتروں میں سنیں گے اور عزت بھی دیں گے۔ کوئی تو حکمران ایسا آئے گا جو سڑکیں اور پل بنانے کی بجائے ان محکموں کو ٹھیک کرنے کی ذمہ داری سنبھالے گا۔ کوئی تو سر پھرا ہو گا جو سرکاری تنخواہوں میں کمی کا اعلان کرے گا۔ سرکاری ملازموں کی تنخواہوں اور پنشنوں میں کمی کر کے سرکاری ملازموں کے علاوہ بھی سبھی بوڑھوں کو وظیفہ دو، بے شک تھوڑی پنشن دو جو ستر سال سے زیادہ ہیں۔ چاہے وہ سرکاری ملازم تھے یا نہیں تھے۔

گورنمنٹ نے ستر سال ان سے فائدہ لیا ہے تو بدلے میں صرف سرکاری ریٹائرڈ ملازموں کو ہی کیوں پنشن دیتے ہو۔ جنہوں نے ساری زندگی گورنمنٹ سے تنخواہ کی صورت میں پیسے لئے ہوتے ہیں اور اب بوڑھے ہو کر بھی پنشن لے رہے ہوتے ہیں۔ جبکہ دوسرے زمین دار، دکاندار، مزدور چھوٹے اور بڑے بزنس مین جنہوں نے ساری زندگی اپنی کمائی سے گورنمنٹ کو ٹیکس دیا ہوتا ہے۔ جن کے ٹیکس کے پیسوں سے گورنمنٹ چلتی ہے۔ وہی لوگ بوڑھے ہو کر انتہائی کسم پرسی کی زندگی گزار رہے ہوتے ہیں۔ یہی بوڑھے جو کبھی جوانی میں لاکھوں روپے کا ٹیکس ادا کرتے تھے آج سڑک پر ایک ایک روپے کی بھیک مانگتے ہیں۔ ان کو خیرات مت دو کیونکہ خیرات دینے سے غربت نہیں دور ہوتی بلکہ ایک اچھا پنشن کا قانون دو۔

میں یہ نہیں کہتا کہ آپ ان کو دس دس ہزار مہینے کی پنشن دینا شروع کر دو۔ بے شک ایک ہزار روپیہ ہی دو یا اس سے بھی کم دو لیکن بوڑھے افراد کے لئے پنشن کا ایک مئوثر قانون ضرور بناؤ۔ یہ حضرت عمرؓ کا بنایا ہوا قانون ہے۔ آپ سو روپے سے بھی شروع کرو گے تو برکت اس میں خدا خود ہی ڈال دے گا۔ اسلام کے اس انتہائی خوبصورت قانون کو آج پورے یورپ میں استعمال کیا جاتا ہے۔ یہاں 67 سال کے ہر بوڑھے مرد و عورت کو پنشن دی جاتی ہے۔ چاہے وہ سرکاری ملازم ہو یا ساری زندگی اس نے گھر بیٹھ کر گزری ہو۔ گورنمنٹ سب کو پنشن دیتی ہے اور اسی قانون کی وجہ سے یورپین لوگ بچت نہیں کرتے ہیں۔ یہ جتنا کماتے ہیں اتنا کھا جاتے ہیں۔ یہ اپنے بڑھاپے کے لئے پیسہ بچا کر نہیں رکھتے کیونکہ ان کو گورنمنٹ یہ سیکورٹی دیتی رہے گی۔

اولاد 18 سال کی ہوتی ہے تو وہ خود کماتی ہے اور خود کھاتی ہے۔ کوئی بھی اپنے بڑھاپے یا اولاد کے لئے بچا کر نہیں رکھتا اور اسی بچت نہ کرنے کی وجہ سے ملک میں بے روزگاری بھی کم ہوتی ہے اور ملک امیر سے امیر تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ آپ لوگ یقیناً سوچ رہے ہوں گے کہ بچت نہ کرنے اور پیسہ خرچ کرنے سے ملک کیسے امیر ہوتا ہے۔ اس کا صحیح جواب تو آپ کو اسحاق ڈار اور اسد عمر ہی دے سکتے ہیں۔ میں تو صرف ایک معمولی سا لکھاری ہوں۔ میرے پاس کوئی معاشیات کی ڈگری نہیں ہے۔

میں ناول کی اصل کہانی سے ہٹ گیا ہوں لیکن کہانی کو دوبارہ جاری کرنے سے پہلے میں حضرت عمرؓ کا قانون بھی بتاتا چلوں۔ معلوم ہے اس کا ہمارے حکمرانوں پر کوئی اثر نہیں پڑے گا لیکن پھر بھی جتنی میری ذمہ

داری ہے میں اتنی تو پوری کروں۔

پوری دنیا میں اس وقت جو ٹیکس کا نظام ہے وہ حضرت عمرؓ کا نافذ کردہ نظام ہے۔ایک سرمایہ کار یا امیر آدمی کے اوپر اس وقت تین نظام کام کرتے ہیں۔ایک نظام پیسہ دینے کا ہے جسے سودی نظام کہتے ہیں۔ یہ اسلام میں حرام ہے۔آپ بینک میں ایک لاکھ یا اس سے زیادہ رقم جمع کرواتے ہیں تو بینک آپ کو سالانہ سات سے لے کر دس فیصد تک جو انٹرسٹ دیتا ہے یہ سود ہے اور پوری دنیا میں رائج ہے۔کچھ اسلامی ممالک کو چھوڑ کر باقی سب ملکوں کے بینک اسی نظام کے تحت چلتے ہیں۔ یہ بہت پیچیدہ اور مشکل نظام ہے۔آپ اس نظام سے باہر نہیں نکل سکتے۔اس کے لئے ملک کو بہت زیادہ طاقت ور اور امیر ہونا چاہیے۔تب ہی اس نظام سے باہر نکلا جا سکتا ہے ورنہ ملک کی معیشت تباہ ہو جاتی ہے۔

مجھے اس نظام سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ میں باقی دو نظاموں کی طرف آتا ہوں۔سرمایہ کار سے دو طریقوں سے پیسہ وصول کیا جاتا ہے۔ایک خالصتاً اسلامی قانون یعنی زکوٰۃ کا قانون ہے۔ یہ خدا کا بنایا ہوا قانون ہے جس کے تحت آپ سالانہ بچت سے اڑھائی فیصد یا 40واں حصہ خیرات کرتے ہو۔کچھ لوگ اسے اسلامی ٹیکس کہتے ہیں۔ بلکہ میں نے تو کچھ تجزیہ کاروں سے یہاں تک سنا ہے کہ اسلام میں بچت پر ٹیکس ہے خریداری یا منافع پر کوئی ٹیکس نہیں ہے۔منافع پر ٹیکس یہودیوں یا عیسائیوں کا بنایا ہوا نظام ہے۔ یہ بالکل غلط ہے۔اسلام میں بچت پر کوئی ٹیکس نہیں ہے۔ یہ صرف زکوٰۃ کی صورت میں خیرات ہے جو غریب اور حق دار لوگوں کو دی جاتی ہے۔ گورنمنٹ وصول کر سکتی ہے لیکن اپنے اوپر خرچ نہیں کر سکتی۔زکوٰۃ صرف غریب اور حق دار لوگوں کے لئے ہے اور اس سے گورنمنٹ کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔

بات بہت لمبی ہو جائے گی، خدا نے اگر موقع دیا تو زکوٰۃ کے اوپر ایک پورا کام لکھوں گا اور بتاؤں گا کہ کیسے خدا نے اس اڑھائی فیصد کے چھوٹے سے حصے میں پوری کائنات سمو دی ہے۔اسلام کے سچے ہونے کی تصدیق کے لئے صرف زکوٰۃ کا نظام ہی کافی ہے۔ پوری تفصیل سے لکھوں گا۔

زکوٰۃ کے بعد دوسرا قانون جو سرمایہ کاری سے پیسہ وصول کرتا ہے وہ ٹیکس کا قانون ہے۔جس سے پوری دنیا کا نظام چلتا ہے۔ پوری دنیا کی حکومتیں اسی ٹیکس سے پیسہ وصول کرتی ہیں اور عوام پر خرچ کرتی ہیں۔اس قانون کو ہمارے کچھ دانشور حضرات یہودیوں اور عیسائیوں کا قانون کہتے ہیں۔ یہ سراسر غلط ہے۔

یہ حضرت عمرؓ کا بنایا ہوا قانون ہے جو ہمیشہ منافع یا خریداری پر ہی وصول کیا جاتا ہے۔ یہ دس فیصد اور بیس فیصد کے حساب سے وصول کیا جاتا ہے۔ وہ کاروبار جس میں گورنمنٹ آپ کو مدد اور سہولت دیتی ہے اس پر بیس فیصد اور خودمختار کاروبار پر دس فیصد کے حساب سے ٹیکس لیا جاتا تھا۔ تجارتی سامان جو دوسرے ملکوں سے مدینہ آتا تھا اس پر بھی ٹیکس وصول کیا جاتا تھا جسے آج کل کسٹم یا ڈیوٹی ٹیکس کہتے ہیں۔ اس میں بھی ٹیکس درجہ بندیوں کے حساب سے وصول ہوتا تھا جو آج بھی رائج ہے۔ مختلف ملکوں کی مختلف اشیاء پر مختلف کسٹم ڈیوٹی ہوتی ہے۔ یہ جھوٹ ہے کہ اسلام میں بچت پر ٹیکس وصول ہوتا ہے۔ ٹیکس ہمیشہ منافع پر ہی ہوتا ہے اور اسی سے حکومتیں چلتی ہیں۔

پوری اسلامی ریاست میں بوڑھے ہونے والے افراد کو پنشن بھی حضرت عمرؓ نے دینی شروع کی تھی جسے وظیفہ کہا جاتا تھا اور آج پورے یورپ میں اس قانون پر عمل کیا جاتا ہے۔ آپ اگر بڑھاپے سے بے نیاز ہو جائیں گے تو آپ بچت کی بجائے خرچ کریں گے۔ پیسہ سرکل کرے گا تو گورنمنٹ کو ٹیکس کی مد میں ملے گا۔ گورنمنٹ سو روپے پر سترہ فیصد کے حساب سے ٹیکس وصول کرتی ہے۔ (یونان 17 سے 23 فیصد اور جرمنی 7 سے 17 فیصد تک ٹیکس وصول کرتا ہے۔ کھانے پینے کی اشیاء پر 7 اور عیاشی کے سامان پر 17 فیصد کے حساب سے ٹیکس وصول ہوتا ہے)۔

سو روپے کا نوٹ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں جانے پر گورنمنٹ 17 روپے لیتی ہے۔ یہ جتنے ہاتھوں میں گردش کرتا رہتا ہے گورنمنٹ اتنے ہاتھوں سے 17 روپے لیتی ہے۔ اس ایک سو روپے پر گورنمنٹ دو سو روپے وصول کر لیتی ہے تب بھی اس کی ویلیو سو روپے سے کم نہیں ہوتی۔ جبکہ یہی سو کا نوٹ اگر بچت کے بینک میں چلا جائے تو گورنمنٹ کا بینک سات روپے کے حساب سے سود دینا شروع ہو جاتا ہے اور گورنمنٹ اس کوشش میں لگ جاتی ہے کہ یہ سو روپے بچت نہ بنیں بلکہ کسی کاروبار میں لگیں یا خرچ ہوں تاکہ مزید ٹیکس اکٹھا ہو اور سود نہ دینا پڑے۔

اس کے برعکس پاکستان میں کروڑوں روپیہ بینکوں میں پڑا ہوا ہے۔ جو لوگوں نے بڑھاپے کے لئے بچا کر رکھا ہوا ہوتا ہے۔ سرکاری نوکری اتنی شاندار اور پیسے والی ہوتی ہے کہ لوگوں کو کاروبار کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ ملک کا پڑھا لکھا نوجوان اور ذہین طبقہ نوکریوں کی آس لگا کر گھر بیٹھا رہتا ہے۔ کوئی کاروبار

نہیں کوئی پرائیویٹ کام نہیں۔بس سرکاری نوکری کی آس میں ضائع ہورہا ہوتا ہے۔

مجھے نواز شریف، زرداری اور عمران خان کسی سے بھی ذاتی لگاؤ نہیں ہے۔ یہ میرے ملک کے لیڈر ہیں اور آس بھی تو انہی سے ہے۔شاید ان میں سے کوئی حضرت عمرؓ کا قانون لے آئے اور سڑکوں اور پلوں کی سیاست سے باہر نکل آئے۔خدارا! سرکاری نوکری کی کشش کو کم کرو اور میرے ملک کے نوجوانوں کو کاروبار کی طرف مائل کرو۔ان نوجوانوں کے بڑھاپے کو سرکاری تحفظ دو، لیپ ٹاپ اور شمسی بلبوں کی خیرات مت دو اور قوم کو خیرات پر مت لگاؤں۔ایک اچھا اور بہترین قانون دو۔ ملک نوکریوں سے ترقی نہیں کرتے بلکہ بزنس سے ترقی کرتے ہیں۔ یہ کیسا ملک ہے جس میں ملک ریاض جیسے بزنس مین کو لوگ نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جو کماتا پاکستان میں ہے اور لگاتا بھی پاکستان میں ہے۔لاکھوں لوگوں کے روزگار کا وسیلہ بنا ہوا ہے اور کروڑوں روپیہ سالانہ ٹیکس دیتا ہے۔لوگ اس کی بجائے سرکاری محکموں میں کام کرنے والے چند افسروں کو آئیڈیل بنائے ہوتے ہیں۔

مجھے اپنے ان ایماندار اور محنتی افسروں سے بھی محبت ہے لیکن سٹیج ڈرامے میں کام کرنے والے اس چھوٹے سے اداکار (مراثی) سے بھی محبت ہے جو گورنمنٹ سے تنخواہ نہیں لیتا بلکہ اسے ٹیکس دیتا ہے۔جس سے ہماری گورنمنٹ چلتی ہے،ہسپتال چلتے ہیں اور انہی سرکاری افسروں کو تنخواہیں بھی ملتی ہیں۔ یہ وہی ٹیکس ہے جو ہم اس کا ڈرامہ دیکھنے کے لئے ٹکٹ خریدتے ہیں اور سرکار کو 35 فیصد کے حساب سے ایک ٹکٹ پر ٹیکس ادا کرتے ہیں۔

اگر میری بات کی سمجھ نہ آئی ہو تو راحت فتح علی خان کے ایک شو کی تفصیل دیکھ لیں جو صفائی کرنے والے ایک سویپر سے شروع ہوتی ہے۔لائٹنگ،ٹینٹ،کرسیاں، میوزک سسٹم،اسٹیڈیم کی انتظامیہ،اسٹیڈیم کے باہر کھانے پینے کے چھوٹے چھوٹے سٹال اور نمکو اور چپس بیچنے والے کس کس کے گھر میں روزی جاتی ہے۔صرف ایک آدمی کا ایک شو 100 سے زیادہ لوگوں کے گھروں میں روزی دے جاتا ہے۔محبت ان سے کرو! بڑی کرسی پر بیٹھنے والا بڑا افسر انہی لوگوں کے ٹیکسوں سے تنخواہ وصول کرتا ہے اور بڑھاپے میں پنشن لینے کا حق بھی انہی لوگوں کا ہے۔سرکاری نوکری کی کشش کم ہوگی تو ملک کا بے روزگار نوجوان کوئی کاروبار کرنے کا سوچے گا۔بڑھاپے کی فکر ختم ہوگی تو بینکوں میں پڑا ہوا پیسہ باہر نکلے گا۔

میرے خیال میں مجھے اب واپس کہانی کی طرف آ جانا چاہیے۔جس نے سمجھنا ہوگا وہ اس میں بھی سمجھ جائے گا اور جو سمجھنا ہی نہیں چاہتا اس کے لئے پوری کتاب ہی نا کافی ہے۔ نبی پاکؐ کے بعد دنیا میں حضرت عمرؓ سے بڑا بہادر اور قانون دان آج تک پیدا ہی نہیں ہوا۔ان کا کیا ہوا ایک ایک فیصلہ اور قانون آج بھی دنیا میں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔اگر خدا نے کبھی موقع دیا تو بہت کچھ لکھوں گا۔اسلام کو ان مولویوں نے صرف مسجدوں اور جہاد میں چھپا کر رکھا ہوا ہے جبکہ اسلام کی سچائی اس دنیا کے ایک ایک ذرے میں چھپی ہوئی ہے۔اسلام کو بیان کرنے کا حق ہم جیسے کلین شیو گناہ گار لوگوں کو بھی ہے اور اگر خدا نے مجھے موقع دیا تو بہت کچھ لکھوں گا۔اب میں کہانی کی طرف واپس آتا ہوں۔

میں اور احمد باقی کچھ دوسرے لڑکوں کے ساتھ استنبول کے امیگریشن کیمپ سے چالیس دن کا سٹے لے کر باہر آ گئے تھے اور اب مین شہر کی طرف جا رہے تھے۔ہم کل دس لڑکے تھے۔کیمپ والے اتنے اتنے لڑکوں کو ہی چھوڑتے تھے۔وہ سب لڑکوں کو اکٹھا نہیں چھوڑتے تھے۔ابھی ہمیں کیمپ سے نکلے صرف دس منٹ ہی ہوئے تھے جب ہمیں دو ترک راستے پر کھڑے ہوئے نظر آ گئے۔ وہ ہمیں غور سے دیکھ رہے تھے۔ جب ہم ان کے نزدیک پہنچے تو وہ خاموشی سے ہم لوگوں میں شامل ہو گئے اور پھر آہستہ آہستہ ہمارے ساتھ ہی چلنے لگے۔

’’پاکستان یا افغانستان؟‘‘ ایک ترکی نے مجھ سے پوچھا تو میں حیرانگی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔وہ نارمل رفتار سے میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

’’یونان جانا ہے؟ کون سے ایجنٹ کے لڑکے ہو؟‘‘ وہ مسلسل میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔اتنی دیر میں دوسرے لڑکے بھی ان کی باتوں میں دلچسپی لے رہے تھے۔ہم نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ ہمیں لے کر ایک پرانے سے ہوٹل میں آ گئے۔اس ہوٹل کا دروازہ دوسری گلی میں بھی کھلتا تھا۔وہ ہمیں ایک طرف سے اندر لے کر گئے اور دوسری طرف سے باہر نکال لے گئے جہاں پہلے سے دو کاریں تیار کھڑی تھیں۔ہم ان کاروں میں بیٹھے اور وہ ہمیں لے کر ایک سیف ہاؤس میں آ گئے۔

یہ استنبول شہر کے اندر ایک بہت بڑا تہہ خانہ تھا اور اس تہہ خانے میں تقریباً 200 کے قریب لڑکے تھے۔چونکہ میرا کوئی ایجنٹ نہیں تھا اس لئے میں ان کے ساتھ نہیں آنا چاہتا تھا۔لیکن احمد ضد کر کے مجھے اپنے

ساتھ لے آیا۔ تہہ خانے میں پہنچتے ہی سیف انچارج ہمارے ایجنٹوں کے نام لکھنے لگا۔ سیف انچارج کے پاس ترکی سے یونان پہچانے والے سبھی ایجنٹوں کے نمبر تھے۔ وہ ہمارے مین ایجنٹوں کے نام ترکی کے ایجنٹوں کو دیتا اور ترکی کے ایجنٹ خود ہی ہماری درجہ بندی کرتے اور اگلا بارڈر کراس کروانے کی منصوبہ بندی کر لیتے۔

یہ سیف انچارج ترکی کے ایجنٹوں سے ڈیلی کے حساب سے پیسے لیتا تھا۔ ہم جتنے دن اس کے پاس رہتے اور کھاتے وہ اسی حساب سے فی لڑکے کے پیسے لے لیتا تھا۔ اس کا کام لڑکوں کو کیمپ سے رسیو کرنا، اپنے پاس رکھنا اور استنبول شہر میں جہاں ایجنٹ کہتے وہاں تک پہنچانا ہوتا ہے۔ جہاں سے ڈرائیور رسیو کر کے لڑکوں کو ایک بار پھر بارڈر پر پہنچا دیتے ہیں اور آگے یونانی ڈنکر پیدل بارڈر کراس کروا دیتے ہیں۔

میرے اور احمد کے علاوہ سب لڑکوں کے ایجنٹ تھے جو پاکستان یا افغانستان سے چل رہے تھے۔ جبکہ ہم دونوں ایران سے آئے تھے۔ احمد نے فون پر اپنے گھر بات کی اور اپنے والد کو میرے لئے بھی منا لیا۔ احمد کا والد پہلے ہی میری رقم ادا کرنے کے لئے تیار تھا لیکن صرف میں ہی نہیں مان رہا تھا۔ اس بار احمد نے ضد پکڑ لی اور مجھے مجبوراً ماننا پڑا۔ پینتیس پینتیس سو یورو کی بات ہوئی۔ یہ پاکستانی تقریباً سوا دولاکھ روپے بنتی تھی۔ میں نے احمد سے یہ وعدہ لیا کہ میں یونان میں مزدوری کر کے رقم اکٹھی کر کے اسے واپس کروں گا اور اس نے مسکراتے ہوئے ہاں کر دی تھی۔

''راضی بھائی! پیسے بھی آپ کے ہیں اور ہم بھی آپ کے ہیں۔'' اس نے مجھے آنکھ مارتے ہوئے کہا تو میں بھی مسکرا دیا۔

تہہ خانے میں دو سو سے زیادہ لڑکے موجود تھے لیکن ہماری باری دوسرے دن ہی آ گئی۔ سیف انچارج نے ہم تیس لڑکوں کو علیحدہ کیا اور ایک بڑی وین میں بٹھا دیا۔ وین ہمیں لے کر شہر سے باہر کی طرف چلنے لگی۔ آدھے گھنٹے میں ہی وین ہمیں ایک نسبتاً ویران سی سڑک کے کنارے پر لے گئی۔ ڈرائیور نے دروازہ کھولا اور ہمیں ایک دوسری وین میں بیٹھنے کے لئے کہا۔ یہ وین بھی پہلے جیسی وین ہی کی طرح تھی اور اس کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ ہم جلدی سے اس میں سوار ہوئے تو ڈرائیور نے دروازہ بند کر لیا۔ وین پہلے ہی سٹارٹ تھی۔ وہ ہمیں لے کر انجان راستوں پر دوڑنے لگی۔ ہمارا یہ سفر پوری رات جاری رہا اور صبح

کے چار بجے کے قریب ہم ازمیر شہر سے تقریباً 120 کلومیٹر دور ایک چھوٹے سے ساحلی شہر دیکلی پہنچ گئے۔

یہ ساحلی شہر گرمیوں میں ساحلی سیاحت کے لئے بہترین ہے۔اس کے ساحل بہت خوبصورت ہیں۔ شہر میں ہر تیسری چوتھی دکان آپ کو ڈیکوریشن پیس کی نظر آئے گی۔ یہاں سے یونانی جزیرہ میتیلینی صرف 30 کلومیٹر دور ہے جو کہ یونان کے چند خوبصورت ترین جزیروں میں سے ایک ہے۔یونان کے جزیرے پوری دنیا میں اپنی خوبصورتی کے لئے مشہور ہیں اور میتیلینی انہی جزیروں میں سے ایک ہے۔آپ دیکلی کی ساحل پر کھڑے ہوں تو آپ کو بالکل سامنے میتیلینی جزیرہ نظر آجائے گا۔ڈرائیور نے ہمیں دیکلی کے ایک چھوٹے سے گھر میں اتار دیا۔ یہاں ایک کمرے میں ہم سب لڑکے اکٹھے ہو کر بیٹھ گئے۔

''لڑکو! آپ سب خاموشی سے یہاں دن گزارو، رات کو آپ کو سپیڈ بوٹ کی مدد سے یونان پہنچا دیا جائے گا۔'' ایجنٹ نے ہم سے کہا اور کمرے کا باہر سے دروازہ بند کر دیا۔

ہم سب لڑکے ایک دوسرے سے جڑ کر بیٹھ گئے اور ایک اچھے مستقبل کا خواب آنکھوں میں سجائے خاموشی سے بیٹھے رہے۔احمد میرے بازو سے جھولتا ہوا آہستہ آہستہ سونے کی کوشش کر رہا تھا۔میں پیار سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ہمیں ابھی یہاں بیٹھے صرف آدھا گھنٹہ ہی ہوا تھا جب اچانک دروازہ ایک زوردار آواز سے کھلا اور مالک مکان تیزی سے اندر آیا۔

''اے! جلدی جلدی باہر نکلو اور گاڑی میں بیٹھو!'' اس کے چہرے پر ہوائیاں دوڑ رہی تھیں اور وہ چیختے ہوئے لڑکوں کے بازو کھینچ کھینچ کر باہر نکال رہا تھا۔

باہر رات والی ہی وین کھڑی ہوئی تھی۔شاید ہمیں گھر میں داخل ہوتے ہوئے کسی ہمسائے نے دیکھ لیا تھا اور اس نے پولیس کو فون کر دیا تھا۔ مالک مکان کو پتہ چلا تو وہ تیزی سے ہمیں گھر سے باہر نکال رہا تھا۔ہم جلدی سے وین میں بیٹھے تو وین انتہائی تیز رفتاری سے بھاگنے لگی۔اس بار ڈرائیور ہمیں لے کر ایک جنگل میں آ گیا۔

اکثر قارعین شاید حیران ہوں کہ یہ جنگل اچانک کہاں سے آجاتے ہیں۔تو قارئین یورپ اور ترکی جنگلات سے بھرا ہوا ہے۔ یہاں پر آپ کو ہر چالیس پینتالیس کلومیٹر کے بعد جنگل نظر آجائے گا۔جرمنی میں

تو آپ کو شہروں کے اندر بھی جنگل نظر آئیں گے۔ یورپ کے اس انتہائی ترقی یافتہ ملک کا 74 فیصد جنگلات پر مشتمل ہے۔ دیکلی شہر سے صرف 10 کلومیٹر شمال کی طرف جنگلات کا ایک بہت بڑا اسلسلہ ہے۔ وین ہمیں آدھے گھنٹے میں ہی یہاں لے آئی۔

ڈرائیور نے ہمیں وین سے باہر نکالا اور ہمیں لے کر پیدل جنگل میں اندر کی طرف چلنے لگا۔ اس نے وین ادھر جنگل میں ہی ایک طرف کر کے کھڑی کر دی تھی اور اب درختوں کے درمیان سے ہوتا ہوا آگے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے تک مسلسل چلتے ہوئے وہ ہمیں ایک قدرتی نالے کے قریب لے آیا۔ یہاں پر جنگل بہت گھنا تھا اور وہ ہمیں یہیں چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ میں نے اور احمد نے نالے سے پانی پیا اور ایک درخت سے ٹیک لگا کر لیٹ گئے۔

''راضی بھائی! یہاں پر ایک ایک سیکنڈ میں ہی زندگی تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ چار دن پہلے آپ یونان میں تھے پھر ایلسی، ایڈرن، استنبول اور دیکلی کے گھر اور اب اس جنگل میں بیٹھے ہوئے ہیں۔'' احمد نے اوپر آسمان کو گھورتے ہوئے کہا۔

''ہاں یار! زندگی کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ اگلے پانچ منٹ میں کیا سے کیا ہو جائے کوئی پتہ نہیں چلتا۔ بغیر پاسپورٹ کے غیر قانونی طریقے سے ڈنکی کا سفر کرنا زندگی اور موت کا سفر ہے۔ ہمارے ملک کے حالات ہمیں اس سفر پر مجبور کرتے ہیں۔ پیٹ کی بھوک ہمیں بندر کی طرح نچاتی ہے اور ہم دنیا کی ڈگڈی پر ناچنا شروع کر دیتے ہیں۔'' میں نے بازو نیچے کیا تو احمد میرے بازو پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔

رات کو دو آدمی کھانے کے لئے بریڈ اور جام کی 5 چھوٹی چھوٹی بوتلیں لے کر آ گیا۔ یہ 400 گرام کی چھوٹی پیکنگ تھی۔ چھ چھ لڑکوں کو ایک ایک جام کی بوتل دی گئی۔ ہم نے بریڈ کے اوپر جام لگائی اور پانی کے ساتھ کھانے لگے۔ پانی یہاں پر وافر مقدار میں موجود تھا۔ نالہ بہہ رہا تھا اور جتنا دل کرتا پی رہے تھے۔

دیکلی چھوٹا سا شہر تھا۔ صرف ایک مخبری کی وجہ سے پولیس الرٹ ہوگئی تھی اور ان لوگوں نے پانچ دن تک ہمیں یہیں چھپائے رکھا۔ رات کو ایک بار بریڈ اور جام دے جاتے۔ پاکستان میں دن میں پانچ پانچ بار کھانے والے لڑکے یہاں 24 گھنٹوں میں ایک بار بریڈ کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے پر گزارہ کر رہے تھے۔ رات کو سردی کی وجہ سے ساری رات ٹھٹھرتے رہتے تھے اس لئے نیند بھی نہیں آتی تھی۔ رات میں

خاموشی سے لیٹے رہتے اور دن کو البتہ جب سورج تھوڑا اوپر آجاتا اور موسم کچھ معتدل ہوجاتا تو کچھ گھنٹوں کے لئے نیند آجاتی تھی۔

احمد چوبیس گھنٹے میرے ساتھ چھپا رہتا تھا۔ پتہ نہیں اس ایرانی لڑکے میں ایسی کیا بات تھی جو مجھے دن بدن اس سے محبت ہورہی تھی۔ میں ہر گزرتے دن کے ساتھ اس سے قریب ہورہا تھا۔ احمد بہت معصوم اور باتونی تھا۔ وہ چوبیس گھنٹے مسلسل بولتا رہتا تھا۔ اس جنگل میں کوئی بھی آنے والا نہیں تھا اس لئے شور کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ لڑکے سارا سارا دن اور ساری رات ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہتے تھے۔

سانپ اور دوسرے حشرات الارض انسان سے ڈرتے ہیں اس لئے وہ کبھی بھی نزدیک نہیں آتے۔ اللہ تعالیٰ نے ان جانوروں کی نفسیات ہی ایسی بنائی ہیں۔ انسان ان سب سے طاقتور ہے اور جنگل کا بادشاہ شیر بھی انسان پر حملہ کرنے سے پہلے 100 بار سوچتا ہے۔ جو جانور انسان پر حملہ کردیتا ہے اسے انسان کی کمزوری کا اندازہ ہوجاتا ہے اور پھر وہ ہر انسان پر تب تک حملہ کرتا رہتا ہے جب تک انسانوں کے ہاتھوں مارا نہیں جاتا۔ دراصل یہ وہ نفسیاتی خوف ہوتا ہے جو قدرت جانوروں میں رکھتی ہے اور پہلے انسان پر حملہ کرنے کے بعد وہ خوف ختم ہوجاتا ہے۔ سانپ وغیرہ بھی کبھی ہمارے راستے میں نہیں آتے۔ ہم انسان ہی ان کے راستے میں آتے ہیں اور انجانے میں ان کے اوپر پاؤں رکھ دیتے ہیں تو یہ پلٹ کر ڈس لیتے ہیں۔ ویسے بھی یہ ٹھنڈا علاقہ ہے یہاں سانپ یا دوسرے زہریلے کیڑے زیادہ نہیں ہوتے۔

میں جرمنی میں پچھلے دو سال سے رہ رہا ہوں اور جنگلات سے گھرے ہوئے اس ملک میں مجھے ایک بھی سانپ نظر نہیں آیا۔ البتہ یونان کے دوسرے بڑے شہر سلونیکی میں آپ کو سانپ ہی سانپ نظر آئیں گے۔ سلونیکی کے ہر کھیت ہر جنگل میں آپ کو سانپ نظر آئیں گے۔ یہاں پر گرمیوں میں دیہاتوں کی طرف جانے والی سڑکوں پر آپ کو مرے ہوئے سانپ ملیں گے۔ جو سڑک کراس کرتے ہوئے گاڑی کے ٹائروں کے نیچے کچلے جاتے ہیں۔

مجھے یہاں کے ایک مقامی زمیندار نے بتایا تھا کہ سلونیکی میں چوہے بہت زیادہ ہو گئے تھے۔ یہ انسانوں اور کھیتوں دونوں کے لئے خطرناک تھے اس لئے یونان کی حکومت نے بیس پچیس جہاز سانپوں سے بھر کر سلونیکی پہاڑوں میں چھوڑ دیئے تھے۔ یہ چوہے کھانے والے سانپ ہیں جو انسانوں کو نہیں

کاٹتے۔ سلونیکی کے کھیتوں میں کام کرنے والے مقامی کسانوں کو سانپوں کی ان اقسام کا پتہ تھا اور وہ ان کو مارتے نہیں تھے بلکہ پکڑ کر دوسرے کھیت یا جنگل میں چھوڑ دیتے تھے۔ خود میرا مالک ان کو ہاتھ سے پکڑ لیتا تھا اور ہمیں ان کا منہ کھول کر دکھاتا تھا۔ ان سانپوں کے منہ میں کاٹنے والے دانت ہی نہیں ہوتے تھے۔ یہ چوہوں کو پورا نگل جاتے تھے۔

شاید کچھ لوگ سوچ رہے ہوں کہ یونانی حکومت کتنی بے وقوف ہے کہ انہوں نے جنگلوں میں چوہوں کے لئے بلیاں کیوں نہیں چھوڑیں؟ تو میں یہ بھی بتا دیتا ہوں کیونکہ یہ بے وقوفانہ سا سوال میں نے بھی اپنے مالک سے پوچھا تھا اور ان یونانیوں کی حماقت پر دل میں مسکرا بھی رہا تھا۔ بھائی! سانپ کاٹنے والا ہو یا نہ کاٹنے والا، ڈر تو دونوں سے لگتا ہے، بلیاں چھوڑ دیتے بلی سے کونسا ڈر لگتا ہے؟ یہ چوہے بھی کھا جاتی ہیں اور پورے علاقے میں پھرتی ہوئی اچھی اور خوبصورت بھی لگتی ہیں۔ تو جناب! سب سے پہلی غلط فہمی اپنے دل سے نکال دیں۔

گھریلو یعنی پالتو بلی کبھی بھی چوہے کا شکار نہیں کرتی ہے۔ اگر آپ چوہے کو مار کر اس کے آگے پھینکیں گے تو یہ کھا لے گی ورنہ خود پکڑ کر کھانا، اس چیز کی امید آپ بلی سے ہرگز مت رکھیں۔ اگر آپ بلی کو روزانہ خوراک دیتے ہو تو یہ کبھی بھی شکار نہیں کرتی۔ صرف بھوکی بلی ہی شکار کے لئے محنت کرتی ہے اور اگر آپ اسے خوراک نہیں دیتے ہو تو یہ گھر چھوڑ کر چلی جائے گی۔ اس کے علاوہ بلی کو روزانہ خوراک کی ضرورت ہوتی ہے تو ان کی روزانہ خوراک کا بندوبست کیسے کرو گے؟ جبکہ سانپ صرف ایک چوہا کھا کر پورے ایک سال تک زندہ رہ سکتا ہے۔ یہ بغیر خوراک کے ایک سال تک گزارہ کر سکتا ہے۔ یہ سال کے سات مہینے زمین کے اندر سوتا رہتا ہے اور صرف پانچ مہینے گرمیوں کے باہر نکلتا ہے اور چوہوں کے علاوہ ہر قسم کے چھوٹے چھوٹے جانور (جو انسانوں کے لئے بیماریوں کا باعث بنتے ہیں) کھا جاتا ہے۔ یہ زمین پر رینگنے والا جانور چھوٹی آبادی کو کم کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں۔ اس کے علاوہ یہ زمین کی زرخیزی کا بھی باعث بنتا ہے۔

بلیاں بھی یہاں کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ سلونیکی کے ہر ڈیرے پر آپ کو بلیاں ضرور نظر آئیں گی۔ یہ چوہوں کے لئے نہیں بلکہ سانپوں کے لئے رکھی جاتی ہیں۔ بلی سانپ کھا جاتی ہے۔ اصول وہی ہے پالتو بلی سانپ کا شکار نہیں کرتی۔ دراصل سانپ بلی سے ڈرتا ہے اور اسے بلی کی خوشبو آ جاتی ہے۔ اس لئے جس جس

جگہ پر بلی جاتی ہے وہاں سے سانپ بھاگ جاتا ہے۔ یہ بلی والے گھر کے نزدیک بھی نہیں جاتا۔سانپ سے بچاؤ کے لئے فاسفورس بھی استعمال کیا جاتا تھا۔گرمیوں میں فاسفورس کا پاؤڈر ہم اپنے ڈیرے کے چاروں طرف پھیلا دیتے ہیں۔سانپ فاسفورس کے پاؤڈر کی لکیر کو کراس نہیں کرسکتا۔فاسفورس سانپ کی جلد کو گلا دیتی ہے اور یہ زخمی ہو کر مرجاتا ہے۔

ہمیں دیکلی کے اس جنگل میں پانچ دن ہو گئے تھے۔ایجنٹ کوئی بھی رسک نہیں لے رہے تھے۔وہ حالات ٹھیک ہونے کا انتظار کررہے تھے۔دیکلی سے متیلینی صرف دو گھنٹے کا سپیڈ بوٹ کا سفر تھا۔متیلینی سے آگے ایتھنز شہر کی طرف سفر سات آٹھ گھنٹے کا تھا لیکن یہ یونانی علاقہ تھا اور یہاں کوئی سختی نہیں ہوتی تھی۔ صرف پہلے دو گھنٹے دیکلی سے متیلینی خطرناک تھے کیونکہ یہ سمندر کے اندر انٹرنیشنل بارڈر ہے۔آپ ایک بار بارڈر کراس کر کے متیلینی پہنچ گئے تو پھر متیلینی سے آگے بڑی تعداد میں چھوٹے چھوٹے جزیرے تھے اور سینکڑوں کی تعداد میں کشتیاں سمندر کے اندر ہوتی تھیں۔صرف دیکلی سے متیلینی کا سمندری علاقہ خالی ہوتا ہے۔ یہاں انٹرنیشنل سمندر میں کوئی کشتی نہیں ہوتی اس لئے اکیلی سپیڈ بوٹ کے دیکھ لئے جانے کا خطرہ ہوتا تھا۔

شہر کے اندر پولیس بھی الرٹ تھی اس لئے ایجنٹ کوئی غلطی نہیں کر رہے تھے۔ویسے بھی یہاں سے یونان کا سفر اڑھائی لاکھ روپے کا تھا۔تیس لڑکوں کے حساب سے 75 لاکھ روپے بنتے ہیں۔ یہ 2006ء کی بات ہے۔ یہ 75 لاکھ آج کے کروڑ روپے سے بھی زیادہ بنتے ہیں اور یہ تو صرف ایک گیم ہے۔ازمیر کے پاس چھوٹے چھوٹے ساحلی شہروں کے جنگلات اور گھروں میں بیسیوں اور بھی گیمیں یونان جانے کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ استنبول کے صرف ایک سیف ہاؤس میں ہم 200 کے قریب لڑکے تھے اور وہاں روزانہ لڑکے آرہے تھے اور جارہے تھے۔ یہ کروڑوں روپے کی گیم ہوتی ہے۔ یہاں پر موجود تیس لڑکے اب تقریباً سبھی ایک دوسرے کو جاننے لگے تھے۔ ہمارے اس گروپ میں صرف 7 لڑکے افغانی تھے اور باقی 22 پاکستانی تھے۔صرف احمد اکیلا ایرانی تھا۔

”راضی بھائی! اور کتنا انتظار کرنا پڑے گا یہاں پر؟“ احمد بار بار یہی سوال پوچھتا رہتا تھا۔

”یار! کوئی بات نہیں۔۔۔ جب اتنا لمبا انتظار کرلیا ہے تو پھر یہ دن بھی کٹ جائیں گے۔“ میں نے

اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''جی بھائی! بات تو آپ کی ٹھیک ہے ویسے بھی جتنے دن آپ کے ساتھ گزر رہے ہیں مزے سے گزر رہے ہیں۔'' اس نے ایک ادا سے کہا تو میں مسکرا دیا۔

''صحیح کہتے ہو یار! تم واقعی بہت پیارے ہو۔۔۔ بہت پیارے بھائی ہو۔ تمہارے احسانات شاید میں ساری زندگی بھی نہ اتار سکوں۔'' میں اچانک افسردہ ہو گیا۔

''نہیں راضی بھائی! آپ بھائی ہو ہمارے اور بھائی بھائیوں پر احسان نہیں کرتے۔ اور یہ آپ کا احسان ہے مجھ پر جو آپ نے مجھے اپنا بھائی بنایا ہے۔'' اس نے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

کھانا روزانہ شام کو 5 بجے کے قریب آجاتا تھا۔ یہ ایک ایک بریڈ ہوتا تھا اور ہماری مرضی ہوتی تھی کہ ہم جب مرضی کھائیں۔ میں اور احمد ایک بریڈ رات کو کھا لیتے تھے اور دوسرا بریڈ صبح آدھا آدھا کر کے کھا لیتے تھے۔ شام کو ایجنٹ کھانا دینے آیا تو اس نے ہمیں رات کو تیار رہنے کا کہا کیونکہ آج رات کو گیم نکالنی تھی۔ ایجنٹ کھانا دے کر واپس چلا گیا تو ہم رات گہری ہونے کا انتظار کرنے لگے۔

ایجنٹ رات کو گیارہ بجے کے قریب آئے۔ یہ تین آدمی تھے اور انہوں نے آتے ہی ہمیں جنگل کی دوسری طرف سے باہر لے جانا شروع کر دیا۔ ہم پیدل تقریباً ایک گھنٹے تک مسلسل چلتے رہے اور آخر ایک کچی سڑک پر پہنچ گئے۔ یہاں پر پہلے ہی ایک وین کھڑی تھی۔ ہم وین میں جا کر بیٹھ گئے اور ایجنٹ ہمیں لے کر ساحل کی طرف جانے لگے۔ ساحل تک جاتے جاتے ہمیں مزید چالیس منٹ لگ گئے۔ ڈرائیور نے ہمیں ایک تاریک سے گوشے میں اتارا اور وین لے کر چلا گیا۔ یہاں پر ہمارے ساتھ دو ایجنٹ رکے تھے جن میں سے ایک واپس ڈرائیور کے ساتھ ہی چلا گیا۔

ہماری نظروں کے بالکل سامنے ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا۔ بہت بڑا اور بہت عظیم سمندر۔۔۔ میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار سمندر دیکھا تھا۔ میں کراچی میں دو مہینے رہا تھا لیکن سمندر دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ اس کے بعد ایران اور استنبول تک آ گیا لیکن پھر بھی سمندر نہیں دیکھ سکا۔ استنبول کا دو براعظموں کو ملانے والا پل دیکھا تھا اور اس کے اوپر سفر بھی کیا تھا لیکن یہاں سے سمندر سمندر نہیں بلکہ کوئی دریا لگتا تھا۔ سمندر کا صحیح نظارہ

تو یہاں سے بھی نہیں ہوتا تھا۔سمندر کی خاصیت لامتناہی ہوتی ہے جس کا دوسرا سرا نظر ہی نہ آئے۔ یہاں سے سمندر عظیم الشان تو تھا لیکن اس کا دوسرا کنارہ نظر آ رہا تھا۔

یونان دس ہزار سے زیادہ چھوٹے بڑے جزیروں پر مشتمل ملک ہے۔اس لئے پورے یونان میں کہیں بھی کسی بھی ساحل پر کھڑے ہو جاؤ تو آپ کو دوسرے سرے پر جزیرہ نظر آ جائے گا۔اصل سمندر جرمنی اور انگلینڈ سے آگے شروع ہوتا ہے جس کے دوسرے کنارے پر امریکہ ہے۔امریکہ کے دونوں کناروں پر موجود سمندر دنیا کے عظیم ترین سمندر ہیں۔ یہ وہ سمندر ہیں جو لامحدود ہیں اور جن کا کوئی کنارہ نہیں۔لامحدود اور عظیم الشان وسعتوں کے مالک یہی امریکہ کو لگنے والے دو سمندر ہیں اور دنیا کے 90 فیصد بحری جہاز انہی دو سمندروں کو عبور کرتے ہوئے سمندر کی نظر ہو کر غرق ہو گئے ہیں۔

یورپ اور امریکہ کے درمیان سمندر بحرالکاہل کی جسامت کا اندازہ آپ اس بات سے لگا لیں کہ 15 ویں صدی سے پہلے کوئی انسان اس کو عبور ہی نہیں کر سکا تھا۔لوگ بحرالکاہل کو دنیا کا آخری کنارہ سمجھتے تھے۔پندرہویں صدی سے پہلے کوئی امریکہ کو جانتا ہی نہیں تھا۔کولمبس نے پہلی بار امریکہ کو دریافت کیا۔دنیا کولمبس جیسے سر پھرے جہاز دان بھی صدیوں بعد ہی پیدا کرتی ہے۔

ہم مسلمان پتہ نہیں کیوں اس شخص سے بھی نفرت کرتے ہیں اور اسے اس چیز کا کریڈٹ دینے کی بجائے اپنی ہی کچھ عرب جہاز دانوں کی کہانیاں سناتے رہتے ہیں۔امریکہ کی طرف باقاعدہ تسلیم شدہ سفر اسی آدمی نے کیا تھا اور پورے یورپی ممالک اسی کے بنائے ہوئے روٹ کو استعمال کر کے امریکہ پہنچے تھے۔اگر اس سے پہلے کوئی عرب یا غیر عرب جہاز دان آیا بھی ہے تو اس کے آنے یا نہ آنے سے کسی کو کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔ہاں! اس کے بنائے ہوئے روٹ کو فالو کرتے ہوئے پورا یورپ امریکہ پہنچا تھا اور اس سے پوری دنیا کو فائدہ ہوا تھا۔ہمیں اس چیز کا کریڈٹ ضرور اسے دینا چاہیے۔

اس اندھیرے گوشے میں بیٹھے ہوئے ہمیں بالکل سامنے میتیلینی جزیرہ نظر آ رہا تھا۔جس کے درمیان میں تیس کلومیٹر کا سمندر حائل تھا۔

''راضی بھائی! روشنیاں نظر آ رہی ہیں۔'' احمد نے انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں یار یورپ کی روشنیاں ہیں۔'' یورپ کی ٹھنڈک ان روشنیوں کو دیکھ کر ہی دل میں اتر رہی تھی۔

''بھائی! صرف کچھ کلومیٹر دور ہی زندگی کھڑی ہے۔ کتنی دیر میں ادھر پہنچ جائیں گے؟'' اس نے روشنیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یار دو گھنٹے لگ ہی جاتے ہیں ادھر پہنچنے میں۔۔۔ ربڑ کی کشتی ہو گی اور سمندر میں سپیڈ بہت کم ہو جاتی ہے۔'' میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''بھائی ایک بات ہے۔۔۔ زندگی ادھر یورپ میں ہی ہے۔ ہم جتنے بھی پڑھے لکھے اور روشن خیال کیوں نہ ہو جائیں لیکن پھر بھی ان یورپی ممالک کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ یہ لوگ انسان کو انسان اور جانوروں کو بھی انسان سمجھتے ہیں۔ یہاں پر کتے کو بھی پتھر مارنے پر جیل ہو جاتی ہے۔''

شاید آپ لوگ میری بات پر ہنسیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ آپ کو پورے جرمنی میں ایک بھی آوارہ کتا یا بلی نظر نہیں آئے گی۔ آپ جرمنی کے ایک سرے سے لے کر دوسرے تک چلے جائیں۔ جرمنی کے کسی بھی شہر دیہات یا جنگل میں آپ کو کوئی بھی آوارہ کتا یا بلی نظر نہیں آئے گی۔ جس طرح پاکستان میں گاڑیوں کی رجسٹریشن اور مالک ہوتے ہیں ایسے ہی جرمنی میں کتوں اور بلیوں کی باقاعدہ رجسٹریشن ان کے مالک کے نام پر ہوتی ہے۔ مالک ان کتوں کا باقاعدہ ٹیکس ادا کرتا ہے۔ اگر کوئی کتا آپ کو خوش قسمتی سے کاٹ لے تو کتے کا مالک آپ کو لاکھوں روپیہ ہرجانہ ادا کرتا ہے اور اگر آپ پارک میں یا راستے پر چلتے ہوئے کسی کتے کو پتھر مار دیں تو آپ کو جیل بھی ہو سکتی ہے۔

ایک اور بات بھی میں یہاں آپ کو بتا دوں کہ آپ کو جرمنی میں کہیں بھی کتے کا فضلہ نظر نہیں آئے گا۔ کتوں کے مالکوں کے پاس پلاسٹک کے چھوٹے بیگ ہوتے ہیں۔ کتا جب فضلہ کرتا ہے تو یہ لوگ شاپر میں ڈال کر ڈسٹ بن میں پھینکتے ہیں۔ اس کی کوئی چھوٹ نہیں ہے اور نہ ہی میں اپنی بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کر رہا ہوں۔ یہ حقیقت ہے اور پورے جرمنی میں آپ کو نظر آئے گی۔ یہاں پر کتا اگر فضلہ کر کے چلا جائے اور اس کا مالک اسے نہ اٹھائے تو دیکھنے والے اسی وقت پولیس کو فون کر دیتے ہیں۔ کوئی کیس نہیں کوئی عدالتی کارروائی نہیں۔۔۔ پولیس والے کتے کے مالک کو پکڑ کر جرمانہ کر کے چھوڑ دیتے ہیں۔ اگر چار پانچ بار جرمانہ ہو جائے تو اس کے بعد اس سے کتا رکھنے کا لائسنس واپس لے لیتے ہیں اور پھر وہ ساری زندگی کتا نہیں

پال سکتا۔

یہاں کی پولیس رشوت نہیں لیتی بلکہ قانون پر عمل درآمد کرواتی ہے۔ یہاں کے حکمران قانون بناتے ہیں اور سرکاری اداروں کو چلاتے ہیں۔ سڑکیں اور پل نہیں بناتے رہتے۔ جرمنی میں کسی بھی سڑک، پل یا ہسپتال کے باہر کسی سیاست دان کی تختی نظر نہیں آئے گی۔ دنیا کا سب سے ترقی یافتہ ترین ملک جرمنی ہے۔ یہاں پر اشارہ لگا ہوا ہو اور آپ پیدل سڑک کراس کرتے ہوئے پکڑے جائیں تو آپ کو جرمانہ ہو سکتا ہے۔ آپ پولیس والے کے پاؤں پکڑ لیں۔۔۔ جتنی مرضی منتیں کر لیں وہ آپ کو نہیں چھوڑے گا۔ معاف کرنے کا اختیار صرف آپ کے متعلقہ محکمے کو ہوتا ہے۔ وہ چاہے تو معاف کر دے۔ پولیس والا ادھر سڑک پر اپنی عدالت لگا کر نہیں کھڑا ہو جاتا۔ اس کا کام صرف جرمانہ کرنا ہوتا ہے اور وہ اپنا کام کرتا ہے۔ اگر روڈ کے اوپر سپیڈ لمٹ 120 کلومیٹر فی گھنٹہ لکھی ہے تو 125 پر گاڑی چلا کر دکھا دیں۔ صرف آدھے گھنٹے میں ہی آپ کسی نہ کسی کیمرے کی زد میں آ جائیں گے اور دوسرے دن ہی آپ کے گھر میں جرمانے کی پرچی پہنچ جائے گی۔

ملک ایسے ترقی کرتے ہیں، سڑکیں اور پل بنانے سے ملک ترقی نہیں کرتے۔ اس لئے برائے مہربانی جس طرح ایم پی اے، ایم این اے کی گاڑیوں سے جھنڈا اتارا ہے ایسے ہی سڑکوں اور پلوں سے بھی ان کے ناموں کی تختیاں اتار دو۔ اگر آپ مجھے 100 روپیہ دو اور میں آپ کے فون سے ہی پیزے کا آرڈر دے دو۔ پیزا آ جائے تو میں آپ سے کہوں کہ آپ میرا پیزہ کھا رہے ہو اور آپ بھی یہ چیز سمجھیں کہ آپ میری میٹرو بس پر سفر کر رہے ہیں یا میرے دیئے ہوئے لیپ ٹاپ سے تعلیم حاصل کر رہے ہیں تو آپ سے بڑا بے وقوف بھی دنیا میں اور کوئی نہیں ہوگا۔ پی آئی اے سٹیل مل، پولیس، نادرہ، پٹواری سسٹم، ریلوے کوئی ایک محکمہ ہی ٹھیک کر کے بتا دو تو آپ کی حکمرانی کا پتہ چلے۔ ورنہ ہمارے ملک میں تو وزیر داخلہ تک تین تین کلومیٹر کی چھوٹی چھوٹی سڑکیں بنانے پر لگے ہوئے ہیں اور ہمارے جیسا نوجوان طبقہ موت کے ان راستوں پر سردی سے ٹھٹھر ٹھٹھر کر مر رہا ہے۔

سپیڈ بوٹ ایک گھنٹہ انتظار کروانے کے بعد تقریباً رات کے دو بجے کے قریب آئی۔ یہ چھوٹی سی ربڑ کی بنی ہوئی سپیڈ بوٹ تھی جس میں بمشکل دس آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ یہاں پر کوئی مناسب گھاٹی تو نہیں تھی جو کشتی کنارے تک آتی اس لئے وہ دس میٹر پیچھے سمندر میں ہی رک گئی کیونکہ اس سے آگے آتی تو وہ نیچے

پتھروں سے ٹکرا سکتی تھی۔ ہمیں وہاں تک تیر کر ہی جانا تھا۔ ایجنٹ نے لڑکوں کو اشارہ کیا تو لڑکوں نے پائنچے اوپر کر لیے اور سمندر میں اتر گئے۔ یہاں پر پانی گہرا نہیں تھا لیکن اتنا بھی کم نہیں تھا جو ٹخنوں تک ہوتا۔ یہ پانی گلے تک تھا اور لڑکوں کو تیر کر وہاں تک پہنچنا پڑ رہا تھا۔ کپڑے سارے کے سارے گیلے ہو رہے تھے۔

''بھائی! مجھے تیرنا نہیں آتا۔'' احمد نے لڑکوں کو گلے تک ڈوبتے ہوئے دیکھا تو اس نے میرا بازو پکڑ لیا۔

''کیا؟ تمہیں تیرنا نہیں آتا؟ ارمیہ جھیل کے کنارے پر ہوتے ہوئے بھی تمہیں تیرنا نہیں آتا؟'' احمد کا گاؤں ایران کی ارمیہ جھیل کے کنارے پر آباد تھا۔

''جی بھائی! مجھے پانی سے بہت ڈر لگتا ہے، بچپن سے ہی بہت ڈر لگتا ہے۔'' اس نے خوفزدہ ہوتے ہوئے کہا۔

''اچھا! تو ابھی کونسا بوڑھے ہو گئے ہو، ابھی بھی تو بچے ہی ہو؟ 18 سال کی عمر ہے تمہاری اور دیکھنے میں 15 سال کے بھی نہیں لگتے۔۔۔بچپن سے ہی پانی سے ڈر لگتا ہے۔'' میں نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا تو وہ بے بسی سے میرا منہ دیکھنے لگا۔

''بھائی! آپ مذاق تو مت اڑاؤ نا!'' اس نے پوری طاقت سے میرا بازو پکڑا ہوا تھا۔

اس کی انگلیوں کے ناخن میرے بازو کے گوشت میں پیوست ہو رہے تھے۔ میں نے آہستہ سے اپنا بازو اس سے چھڑوا لیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر پانی میں اتر گیا۔ پانی گھٹنوں تک آیا تو وہ کانپنے لگا۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کی کمر کے گرد حائل کیا اور اسے اٹھا کر چلنے لگا۔ پانی چونکہ گلے تک آ گیا تھا اس لیے میں نے اسے دونوں ہاتھوں سے اوپر اٹھا لیا تھا۔ ویسے بھی پانی میں وزن ایک چوتھائی سے بھی کم ہو جاتا ہے۔ اس کا 45 کلوگرام وزن 15 کلو بھی نہیں رہ گیا تھا۔ میں آسانی سے اسے سپیڈ بوٹ تک لے آیا۔ اس نے سپیڈ بوٹ کے ساتھ لگی ہوئی رسی کو پکڑا تو میں نے اسے اوپر کی طرف دھکا دے دیا۔ ایک جھٹکے سے ہی وہ سپیڈ بوٹ کے اوپر چڑھ گیا تھا۔ اس کے بعد میں بھی اوپر چڑھ آیا اور ہم دونوں ایک دوسرے کو پکڑ کر بیٹھ گئے۔ چھوٹی سی سپیڈ بوٹ تھی اور لڑکے گنجائش سے بہت زیادہ تھے۔ ہم سب لڑکے تقریباً ایک دوسرے کے اوپر بیٹھے ہوئے

تھے۔ سپیڈ بوٹ آہستہ آہستہ چلنا شروع ہوئی تو کچھ ہی دیر میں وہ اپنی پوری رفتار سے سمندر میں اڑی جا رہی تھی۔ اس کی رفتار بہت زیادہ تھی۔

سپیڈ بوٹ ہوا میں اڑی جا رہی تھی اور اس میں بیٹھے ہوئے لڑکے اونچی آواز میں درود شریف اور دوسری آیتوں کا ورد کر رہے تھے۔ جب بھی یہ سمندر کی سطح سے ٹچ ہوتی تو نیچے کی طرف بیٹھتی چلی جاتی تھی اور پانی بالکل ہمارے برابر آ جاتا تھا لیکن یہ پھر اوپر اٹھ جاتی تھی۔ سپیڈ بوٹ کا کپتان اناڑی تھا یا بہت بڑا ملاح تھا جو اسے جہاز کی رفتار سے اڑا رہا تھا۔ اگر اسی رفتار سے چلتی رہتی تو ایک گھنٹے میں ہی ہم میتیلنی پہنچ جاتے۔

''بھائی! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔'' احمد نے میرے کان کے قریب منہ لا کر اونچی آواز میں کہا۔

اندھیرے میں مجھے اس کے چہرہ تو نظر نہیں آ رہا تھا لیکن اس کے جسم کی کپکپاہٹ مجھے محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ سپیڈ بوٹ چلانے والا نیا تھا اور وہ بہت ڈرا ہوا تھا۔ وہ سپیڈ بوٹ کو آخری رفتار تک چلا رہا تھا۔

اچانک سمندر میں ایک بڑی لہر اٹھی اور سپیڈ بوٹ اسے چیرتے ہوئے اوپر کو اٹھی۔ پھر سمندر کی سطح سے ٹکرا کر دوبارہ اوپر اٹھی اور الٹی ہو گئی۔ ہم سب لڑکے سمندر میں گرے تو سپیڈ بوٹ اپنی رفتار کی وجہ سے دور نکل گئی اور اندھیرے میں غائب ہو گئی۔ ربڑ کی ہلکی پھلکی سپیڈ بوٹ تھی۔ الٹی ہونے کی وجہ سے جب لڑکے سمندر میں گر گئے تو یہ اپنی اسی رفتار کی وجہ سے کوئی ایک کلومیٹر تک آگے چلی گئی اور سمندر کی لہریں اسے ہم سے مزید دور کرنے لگیں۔ اندھیرا ہونے کی وجہ سے ہمیں کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میرا ہاتھ احمد کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور میں ٹھنڈے یخ پانی میں گرتا چلا گیا۔

یہاں پانی بہت سرد تھا۔ صرف کچھ ہی سیکنڈ میں میرا پورا جسم فریز ہونا شروع ہو گیا اور میں نیچے کی طرف جانے لگا۔ پانی کے جھٹکے کی وجہ سے مجھے دو تین غوطے آ گئے تو میں نے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیئے اور سطح پر آ گیا۔ میں نے ایک زوردار سانس اندر کی طرف کھینچی تو میرے حواس بحال ہوئے اور میں تیزی سے احمد کو تلاش کرنے لگا۔ اسے تیرنا نہیں آتا تھا اور وہ ایک منٹ بھی سمندر میں نہیں نکال سکتا تھا۔ میں جلدی جلدی دائیں بائیں ہاتھ مار رہا تھا۔ میرے دائیں بائیں بہت سے لڑکے تیر رہے تھے یا تیرنے کوشش کر رہے تھے۔ جن لڑکوں کو تیرنا نہیں آتا تھا وہ غوطے کھا رہے تھے اور تیرنے والے لڑکوں کو پکڑ کر انہیں بھی ڈبو

رہے تھے۔ اتنے اندھیرے میں مجھے احمد نظر تو نہیں آ رہا تھا اس لئے میں ہر لڑکے کو ہاتھ لگا کر اس کا نام لے رہا تھا لیکن ابھی تک مجھے احمد نہیں ملا تھا اور میں پاگلوں کی طرح دائیں بائیں لڑکوں کے پاس پہنچ رہا تھا۔ کچھ لڑکوں نے مجھے پکڑنے کی کوشش کی لیکن مجھے احمد کی فکر ہو رہی تھی۔

''احمد۔۔۔احمد۔۔۔کدھر ہو میرے بھائی!'' میں زور زور سے چلانے لگا۔

''احمد۔۔۔احمد۔۔۔ایک بار آواز دو یار!'' میں بار بار چیخ چیخ کر اسے پکار رہا تھا اور سمندر کا نمکین پانی میرے منہ میں جا رہا تھا۔ لیکن مجھے ان سب چیزوں کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ مجھے بار بار احمد کی فکر ہو رہی تھی کیونکہ وہ بالکل تیرنا نہیں جانتا تھا۔

''احمد۔۔۔احمد۔۔۔'' میں گہری تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''بھائی!'' اچانک ایک طرف سے ایک ٹوٹی پھوٹی سی آواز آئی تو میں جلدی سے پلٹا اور تیزی سے آواز کی سمت بڑھنے لگا۔ یہ احمد تھا جو سمندر میں ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔

''راضی بھائی!'' اس کی آواز ایک بار پھر سنائی دی تو مجھے اس کی صحیح سمت کا اندازہ ہو گیا اور میں ایک منٹ میں ہی اس کے پاس پہنچ گیا۔

''بھائی میں آ گیا ہوں، تمہارا بھائی آ گیا ہے۔ اب تمہیں کچھ نہیں ہونے دوں گا۔'' میں نے جلدی سے اس کے بازو کو پکڑا اور اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

''نہیں! زیادہ تیزی سے ہاتھ پاؤں مت مارو! بس معمولی معمولی سی حرکت کرو، اس سے تھکو گے نہیں اور زیادہ دیر تک تیرتے رہو گے۔'' وہ تیزی سے ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا اس لئے میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ وہ ڈرا ہوا تھا اور انتہائی تیزی سے ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے مجھے بھی تھکا رہا تھا۔

''احمد۔۔۔بولا ہے نا ہاتھ پاؤں مت مارو! خود بھی ڈوبو گے اور مجھے بھی ڈبو دو گے۔'' میں نے غصے سے چیختے ہوئے کہا تو وہ خاموش ہو گیا اور اس نے ہاتھ پاؤں مارنے بند کر دیئے۔

''کچھ نہیں ہوتا یار! حوصلہ رکھو۔۔۔میں ہوں نا یہاں تمہارے پاس، اتنی جلدی ڈوبنے نہیں دوں گا

تمہیں۔'' میں نے اسے نرمی سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''بھائی! مجھے پانی سے بہت ڈر لگتا ہے۔ میں مرنا نہیں چاہتا یہاں۔۔۔ یہ بہت اذیت ناک موت ہے۔'' اس نے کانپتے ہوئے کہا۔

''نہیں! کچھ نہیں ہوگا۔ میں ہوں نا یہاں پر! بولا ہے نا تم کو۔۔۔بس زیادہ ہاتھ پاؤں مت مارنا صرف اتنی محنت کرو جتنی ضرورت ہے۔ہم بہت دیر تک تیر سکتے ہیں اور تب تک کوئی نہ کوئی مدد آجائے گی۔''

سمندر میں ہمارے چاروں طرف دور دور ساحلوں پر روشنیاں چمک رہی تھیں۔ میں ان روشنیوں کو دیکھ کر اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ کون سا ساحل نزدیک پڑتا ہے۔ سپیڈ بوٹ ہم سے بہت آگے نکل گئی تھی اور اتنے بڑے سمندر میں اسے تلاش کرنا ناممکن تھا۔ چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا اور اتنے اندھیرے میں نزدیک تیرتے ہوئے لڑکے نظر نہیں آرہے تھے تو کشتی کدھر نظر آتی؟ ویسے بھی وہ الٹی ہوکر بے کار ہوگئی تھی اور دس بارہ لڑکے بھی اسے پکڑ لیتے تو وہ ڈوب جاتی۔

متیلنی جزیرے پر ہمارا انتظار کرنے والا ڈرائیور دو تین گھنٹے تک ہمارا انتظار کرتا اور نہ پہنچنے پر وہ پیچھے ترکی رابطہ کرتا اور ترکی ایجنٹ کسی فون بوتھ یا پرائیویٹ سم سے پولیس کو فون کر کے لانچ کے ڈوب جانے کی اطلاع کر دیتا۔ پولیس والے ترکی کوسٹ گارڈز کو اطلاع دیتے اور پھر سمندر میں ہماری تلاش شروع ہو جاتی۔ مدد آتے آتے بھی چار پانچ گھنٹے لگ جاتے اور اتنی دیر تک ٹھنڈے سمندر میں تیر کر اپنی جان بچائے رکھنا تقریباً ناممکن تھا۔لیکن مجھے پھر بھی زندہ رہنا تھا اور اپنے ساتھ احمد کو بھی زندہ رکھنا تھا۔ وہ اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا اور ابھی تک اس نے زندگی کی صرف 18 بہاریں دیکھی تھیں۔

میرے چاروں طرف لڑکوں کی چیخوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ مدد کے لئے پکار رہے تھے لیکن اس گہرے سمندر میں کوئی بھی ان کی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ہم کسی بھی نزدیکی کنارے سے تقریباً 10 کلومیٹر دور تھے اور اتنا فاصلہ کوئی بھی تیر کر کراس نہیں کر سکتا تھا۔اتنا فاصلہ کوئی ماہر تیراک ہی کر سکتا تھا۔

شاید آپ لوگوں کو 10 کلومیٹر کم لگے لیکن حقیقت میں ایک عام آدمی زیادہ سے زیادہ ایک کلومیٹر تک تیر سکتا ہے۔ پانی کے اندر تیرنے میں پوری جان لگ جاتی ہے۔ایک کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کا ریکارڈ

ساڑھے نومنٹ کا ہے لیکن عام آدمی کو گھنٹے سے بھی زیادہ ٹائم لگ جائے گا اور 10 کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے میں 12 گھنٹے لگ جاتے۔ یہ بہت زیادہ ٹائم تھا۔

احمد اب پرسکون ہو گیا تھا۔ وہ ہلکے ہلکے پیر اور ہاتھ مار کر تیرنے کی کوشش کر رہا تھا اور میں اس کا بازو پکڑ کر خود بھی تیر رہا تھا اور اسے بھی تیرنے میں مدد کر رہا تھا۔ لڑکوں کے چلّانے کی آوازیں اب کچھ کم ہو گئیں تھیں کیونکہ زیادہ چلّانے سے پانی منہ کے اندر چلا جاتا تھا اور غوطہ لگ جاتا تھا۔ جن لڑکوں کو تیرنا نہیں آتا تھا وہ بھی کسی نہ کسی لڑکے کا سہارا لئے ہوئے تھے۔ پانی میں گرنے اور جھٹکا لگنے کی وجہ سے ہمیں سمتوں کا کوئی اندازہ نہیں رہا تھا۔ چاروں طرف ہی ساحل پر چھوٹی چھوٹی روشنیاں نظر آ رہی تھیں لیکن کونسا ترکی کا ساحل تھا اور کونسا یونان کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ ویسے بھی اس وقت جان بچانا ہی سب سے زیادہ قیمتی تھا اور ہم سب جان بچانے کی کوشش ہی کر رہے تھے۔ ایک چھوٹی سی امید کشتی کی بھی تھی۔ اگر کشتی مل جاتی تو دوبارہ اس پر سوار ہو جاتے لیکن اندھیرے میں کشتی کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔

”راضی بھائی! ہم بچ تو جائیں گے نا؟“ احمد نے سردی سے کانپتے ہوئے انتہائی کمزور آواز میں پوچھا۔

ہمیں تیرتے ہوئے آدھے گھنٹے سے زیادہ کا ٹائم ہو گیا تھا۔ پورے سمندر میں دور دور تک کوئی جہاز یا کشتی نظر نہیں آ رہی تھی۔ لڑکے اب تھوڑے بکھر گئے تھے اور کبھی کبھی کسی لڑکے کے رونے کی آواز آ جاتی تھی۔ لڑکے خدا سے اپنے گناہوں کی معافیاں مانگ رہے تھے بلکہ کچھ لڑکے تو باقاعدہ اپنے گناہوں کا اعتراف کر کے معافی مانگ رہے تھے۔

”ہاں یار! ہم بچ جائیں گے۔ تمہارا بھائی تمہارے ساتھ ہے نا! میں خود مر جاؤں گا لیکن تجھے زندہ رکھوں گا، ہر حالت میں زندہ رکھوں گا۔“ میں نے اس کو مزید نزدیک کر لیا۔ میں اسے حوصلہ دے رہا تھا لیکن خود میں مایوس ہو گیا تھا۔ موت آہستہ آہستہ نزدیک آ رہی تھی اور اتنے بڑے سمندر میں اب بچنے کی کوئی امید باقی نہیں رہی تھی۔ ہم اندھیروں کے مسافر تھے اور ہمارے چلنے اور ڈوبنے کا کسی کو بھی علم نہیں تھا، تو پھر ہمارے لئے کوئی بھی مدد نہیں آنی تھی اور اگر کوئی مدد آ بھی جاتی تو اس وقت تک ہم میں سے کوئی بھی اس قابل نہ رہتا۔ ہم اس مدد کے آنے سے پہلے ہی ہر مدد سے آزاد ہو چکے ہوتے۔

''بھائی! آپ چھوڑ دو اب مجھے اور خود بچنے کی کوشش کرو۔ میری وجہ سے آپ بھی تھک کر ڈوب جاؤ گے۔'' احمد نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا۔

لڑکے اب آہستہ آہستہ ڈوبنا شروع ہو گئے تھے۔ وہ تیرتے تیرتے تھک جاتے تو ہاتھ پاؤں مارنا چھوڑ دیتے اور گہرائی میں چلے جاتے۔ پانی کے اندر جاتے ہی پانی ان کے پھیپھڑوں میں چلا جاتا اور انہیں ایک زور کا غوطہ لگتا اور وہ دوبارہ ہاتھ پاؤں مارنے لگتے۔ موت کا خوف انہیں ایک بار پھر تیرنے پر مجبور کرنے لگتا اور ان کی ساری تھکاوٹ اتر جاتی۔ یہ احساس صرف کچھ منٹوں کے لئے ہوتا تھا۔ وہ کچھ لمحوں میں ہی دوبارہ تھک جاتے اور ایک بار پھر پانی میں چلے جاتے اور مزید تھوڑا سا پانی پھیپھڑوں لے کر آجاتے۔ یہ سلسلہ ایسے ہی مزید چار پانچ دفعہ چلتا اور آخر کار وہ لمحہ بھی آجاتا جب ایک بار نیچے جاتا تو پھر دوبارہ اوپر آنا نصیب ہی نہ ہوتا۔ پھیپھڑے نمکین پانی سے بھر جاتے، ہاتھ پاؤں جواب دے جاتے اور دوبارہ زندگی میں اوپر پانی کی سطح پر آنا نصیب ہی نہ ہوتا۔

پانی اور آگ کی موت اس دنیا میں سب سے خطرناک اور اذیت ناک موتیں ہیں۔ ایک نارمل موت سے جل کر مرنا دس گنا زیادہ اذیت ناک ہے تو پانی میں ڈوب کر مرنا سو گنا زیادہ اذیت ناک ہے۔ دنیا کی سب سے اذیت ناک موت پانی میں ڈوب کر مرنا ہے۔ اس میں انسان آخری سانس تک محنت کرتا ہے۔ ڈوبتا ہے، ابھرتا ہے اور زندگی بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ تھکتا ہے تو اپنے آپ کو موت کے حوالے کر دیتا ہے لیکن صرف ایک ہی غوطے سے پھر جان بچانے کی کوشش کرنے لگتا ہے۔ یہاں موت ایک جھٹکے میں ہی نہیں آجاتی بلکہ ایک ایک سیکنڈ کر کے آتی ہے اور موت سے پہلے ہر اذیت آتی ہے اور اپنا مزا چکھا کر جاتی ہے۔

میں نے اس موت کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ لوگوں کو ڈوبتے اور مرتے ہوئے دیکھا ہے اور مجھے اس نمکین موت کا آج بھی ذائقہ محسوس ہوتا ہے۔ مجھے تیرتے ہوئے ایک گھنٹہ ہو گیا تھا۔ میں ابھی تک زندگی بچانے کی تگ و دو کر رہا تھا۔ احمد بالکل تھک گیا تھا اور اس نے ہر قسم کی مزاحمت کرنا چھوڑ دی تھی۔ میرے ہاتھ پاؤں شل ہو گئے تھے اور احمد کا ہاتھ بار بار میرے ہاتھ سے نکل رہا تھا لیکن میں پھر اور زیادہ مضبوطی سے اسے پکڑ لیتا تھا۔ میرے آس پاس اب تھوڑے ہی مزید لڑکے رہ گئے تھے جو زندگی اور موت کی بازی لڑ

رہے تھے۔ باقی اس چیز سے آزاد سمندر کی سطح پر تیر رہے تھے۔ خدا کی خدائی بھی عجیب ہے نا کہ انسان تیرنے کے لئے اپنی پوری طاقت سے سمندر سے لڑتا رہتا ہے اور اپنی آخری سانس تک جدو جہد کرتا رہتا ہے لیکن تھک ہار کر ڈوب جاتا ہے اور ڈوبنے کے بعد پھر تیرنے لگتا ہے۔ لاشیں ڈوبتی نہیں ہیں بلکہ صرف زندہ انسان ہی ڈوبتا ہے۔ یہاں کچھ لڑکے ڈوب رہے تھے اور کچھ لڑکے مر چکے تھے۔

''بھائی! آپ چھوڑ دو مجھے، میرے وجہ سے اب آپ بھی مر جاؤ گے۔'' احمد نے کمزور سی آواز میں کہا۔ وہ مجھ سے اپنا ہاتھ چھڑوانے کی کمزور سی کوشش کر رہا تھا۔

''بھائی! چھوڑ دو نا، میری زندگی بس اتنی ہی تھی۔'' اس نے ایک بار پھر اپنا ہاتھ چھڑوانے کی کوشش کی اور اس بار میرا ہاتھ نرم ہوا اور اس کا بازو میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ وہ سمندر میں آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگا۔ مجھے اچانک ہوش آ گیا اور میں نے جلدی سے دوبارہ اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''نہیں احمد نہیں! ایسا مت کرو، میں بچانے کی کوشش کر رہا ہوں تو مجھے کوشش کرنے دو اور حوصلہ دو۔ مر جاؤں گا لیکن تجھے نہیں مرنے دوں گا۔'' میں نے اس کا بازو اپنے سر کے اوپر سے گزارا اور اسے گلے سے لگا لیا۔

''بھائی! اگر آپ مجھے سنبھالتے رہے تو میرے ساتھ خود بھی مر جاؤ گے۔ اس لئے مجھے چھوڑ دو اور خود زندہ رہنے کی کوشش کرو۔'' احمد نے ایک بار پھر مجھ سے بازو چھڑوانے کی کوشش کی تو میں نے مزید سختی سے اسے پکڑ لیا۔

''احمد! جب ایک بار بول دیا ہے تو مجھے کوشش کرنے دو!'' میں نے غصے سے چیختے ہوئے کہا۔

''بہت قسمت والا ہوں جو تیرے جیسا بھائی ملا ہے۔ مجھے بدقسمت مت بناؤ اور بس کوشش کرنے دو۔ دونوں دیوارِ برلن کے اوپر کھڑے ہوں گے۔'' میں نے اس کے غمگین چہرے کو چومتے ہوئے کہا اور ایک بار پھر سمندر کی سطح پر رہنے کی کوشش کرنے لگا۔

مجھے تیرتے ہوئے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ ہو گیا تھا۔ میرے آس پاس مکمل خاموشی ہو گئی تھی۔ شاید سب مر گئے تھے یا پھر زندہ رہنے کی خاموش کوشش کر رہے تھے۔ میں اور احمد بھی اب ڈوبنے اور ابھرنے لگ گئے

تھے، جس طرح چراغ بجھنے سے پہلے پھڑ پھڑاتا ہے۔ میرے جسم نے کام کرنا بند کر دیا تھا۔ پچھلے دس منٹ سے احمد زور لگا رہا تھا لیکن اب وہ بھی بے جان ہو گیا تھا۔

''راضی بھائی! میں نے جرمنی سے بہت محبت کی ہے۔ خدا نے اتنا موقع نہیں دیا جو میں جرمنی دیکھ سکتا۔ خدا آپ کو جرمنی بھی دکھائے گا اور امریکہ بھی۔۔۔'' اس کا ہاتھ میرے ہاتھ سے نکلا اور وہ نیچے گہرے سمندر میں ڈوبتا چلا گیا۔

اس بار میں چاہ کر بھی اسے نہ پکڑ سکا۔ میرے ہاتھ اور پاؤں مکمل طور پر جواب دے چکے تھے۔ احمد کے پیچھے پیچھے میں خود بھی سمندر میں ڈوبتا چلا گیا۔ میرے پھیپھڑوں میں پانی گھسا تو میں نے اوپر آنے کے لئے جدوجہد کی لیکن دیر ہو چکی تھی۔ میں لاکھ کوشش کے باوجود بھی اوپر نہ آ سکا اور گہرائی میں ڈوبتا چلا گیا۔ میں نے ایمان کے خواب کی تعبیر ڈھونڈتے ڈھونڈتے آج جان دے دی تھی۔ میں کولمبس نہیں تھا جو اتنی آسانی سے امریکہ دریافت کر لیتا۔ اگر امریکہ اتنی آسانی سے ہی مل جاتا تو دنیا پندرہویں کی بجائے پہلی صدی میں ہی دریافت کر لیتی۔

میں ڈوب رہا تھا، احمد بھی ڈوب رہا تھا۔ ترکی اور یونان کے درمیان اس چھوٹے سے سمندر نے آج کئی گھروں کو اجاڑ دیا تھا۔ بہت سی آنکھیں آج یونان اور یورپ جانے کا خواب لئے اس سمندر کی نظر ہو گئی تھیں۔ میرا چھوٹا سا ایرانی بھائی آج ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بچھڑ گیا تھا۔ شاید خدا جنت میں اسے جرمنی عطا کر دے۔ وہ ایک قطرے کو سمندر بنا سکتا ہے تو ایک بندے کے لئے اوپر دوسرے جہان میں ایک چھوٹا سا جرمنی بھی بنا سکتا ہے۔ میں ایک بار پھر پانی کی سطح پر آیا اور پھر دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو گیا۔ سمندر کی لہریں مجھے ایک تنکے کی طرح بہا رہی تھیں۔ میں بے ہوش ہو چکا تھا۔

مجھے ہوش صبح صبح ایک کشتی کے عرشے پر آئی۔ میں نے خود کو مچھلیاں پکڑنے والی ایک کشتی پر لیٹا ہوا پایا۔ یہ ترکی کی کشتی تھی۔ مچھلیاں زیادہ تر صبح صبح ہی پکڑی جاتی ہیں۔ جیسے جیسے سورج اوپر آتا جاتا ہے سمندر میں روشنی کی حد بڑھ جاتی ہے اور مچھلی کا شکار کم ہو جاتا ہے اس لئے مچھیرے ہمیشہ منہ اندھیرے ہی شکار کے لئے نکلتے ہیں۔ یہ کشتی بھی منہ اندھیرے نکلی اور میری قسمت مجھے لہروں پر بہاتی ہوئی ان کی کشتی کے قریب لے آئی۔ انہوں نے مجھے سمندر میں ڈوبتے ہوئے دیکھ لیا اور پکڑ کر اوپر کشتی پر لے آئے۔ انہوں نے

میرے پیٹ سے پانی نکالا اور میری زندگی بچ گئی۔

''احمد۔۔۔احمد۔۔۔'' میں ہوش میں آتے ہی چاروں طرف احمد کو تلاش کرنے لگا۔

میں آوازیں دے رہا تھا لیکن مجھے کہیں بھی احمد نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر کشتی پر کام کرنے والے ملاح مجھے دیکھنے کیلئے آ گئے۔ وہ مجھ سے میری خیریت دریافت کرنے لگے اور میں ان سے احمد کا حال پوچھ رہا تھا لیکن انہیں سمندر میں اور کوئی بھی نہیں ملا تھا۔ ان میں سے ایک آدمی نے پانی کی ایک بوتل میری طرف بڑھائی تو میں اس سے پانی لے کر پینے لگا۔ تھوڑی دیر تک میرے حواس بحال ہوئے تو میں انہیں سمندر میں پیش آئے حادثے کی تفصیل بتانے لگا۔ انہیں کشتی کو آنے والے حادثے کا پتہ چلا تو وہ جلدی سے ترکی کوسٹ گارڈ والوں کو فون کرنے لگے۔

میری جیب میں پلاسٹک کے شاپر بیگ کے اندر ترکی کا 40 دن کا ستے تھا۔ وہ پلاسٹک بیگ کی وجہ سے پانی میں بھیگنے سے بچ گیا تھا۔ کوسٹ گارڈرز کی کشتیاں آنے سے پہلے ان لوگوں کو ایک لڑکے کی لاش مل گئی تھی۔ یہ احمد تھا جو مر چکا تھا اور اب اس کا مردہ جسم پانی پر تیر رہا تھا۔ چونکہ میں اور احمد اکٹھے ہی تیر رہے تھے اور سمندر کی لہریں ہم دونوں کو اکٹھے اس طرف لائی تھیں۔ اس لئے وہ سمندر میں تیرتے ہوئے ادھر کی طرف آ گیا۔ کشتی والے اس کی لاش کو کشتی پر لائے تو میں اسے دیکھتے ہی زمین پر گر گیا۔ ایک جیتے جاگتے لڑکے کو اپنے سامنے ایسے لاش بنے ہوئے دیکھ کر میرا دل جیسے بند ہو گیا۔ مجھے کشتی کے عرشے پر گرتے دیکھ کر دو تین آدمی میری طرف لپکے۔ انہوں نے مجھے ہلایا جلایا تو میں دوبارہ ہوش میں آ گیا۔ میرا دل ایک لمحے کے لئے بند ضرور ہوتا تھا لیکن میں مرتا نہیں تھا۔ مجھے جینے کی کوئی حسرت نہیں تھی۔ میں ویسے ہی مر جانا چاہتا تھا لیکن پتہ نہیں کون سی طاقت مجھے ہر بار موت کے منہ سے نکال کر واپس لے آتی تھی۔ احمد جینا چاہتا تھا اور وہ جرمنی جانا چاہتا تھا۔ اپنے ماں باپ کا اکلوتا سہارا تھا لیکن خاموشی سے چلا گیا۔

''راضی! میں نے جرمنی سے بہت محبت کی ہے۔'' یہ اس کے آخری الفاظ تھے جو ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔

میں خاموشی سے اٹھا اور احمد کے بے جان جسم کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ سمندر کے نمکین پانی نے اس کے چہرے کی سفید رنگت کو مزید نکھار دیا تھا۔ پوری دنیا کی معصومیت اس کے چہرے پر نظر آ رہی تھی۔ میں نے

آہستگی سے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور اس کے چہرے کو چھونے لگا۔

''احمد! میں نے اپنی زندگی میں کبھی ایمان سے بڑھ کر کسی سے محبت نہیں کی ہے۔ کسی اور شخص کی چاہت نے کبھی میرے دل میں جگہ ہی نہیں بنائی لیکن پتہ نہیں کیوں تمہاری محبت ان سب چیزوں سے اوپر تھی۔ ایمان کے بعد میں نے اپنی زندگی میں سب سے زیادہ محبت تجھ سے ہی کی تھی لیکن آج تو بھی ایمان کی طرح مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔'' میں نے اپنی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کو صاف کیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''بھائی تھا تمہارا؟'' ایک ترکی ملاح نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو میں خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''نہیں۔۔۔ ایرانی تھا اور بے وفا تھا، ساتھ چلتے چلتے ساتھ چھوڑ گیا۔ ایرانیوں پر کبھی اعتبار مت کرنا یہ بے وفا ہوتے ہیں۔'' میں اس شخص کے گلے لگ کر رونے لگا۔

تقریباً ایک گھنٹے میں ہی ترکی کوسٹ گارڈز کی کشتیاں آ گئیں۔ ان کے ساتھ ایک ہیلی کاپٹر بھی تھا۔ انہوں نے سمندر میں بکھرے ہوئے لڑکوں کو تلاش کرنا شروع کر دیا۔ تقریباً تین چار گھنٹے سرچ آپریشن کے بعد وہ سبھی لڑکوں کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ہم کشتی کے کپتان سمیت 31 لڑکے تھے اور ان تمام لڑکوں میں سے صرف 7 لڑکے ہی زندہ بچ سکے تھے۔ کشتی کا کپتان بھی بے چارہ مارا گیا تھا۔ ایک کوسٹ گارڈ کی کشتی ہماری اس ماہی گیری والی کشتی کے پاس بھی آئی تھی اور وہ مجھے اور احمد دونوں کو لے گئی۔

ساحل پر پہنچ کر ہم لڑکوں کو ایک ایمبولینس کے ذریعے ہسپتال لایا گیا۔ جہاں سے میں موقع دیکھتے ہی فرار ہو گیا۔ میں کوسٹ گارڈز کی کشتی سے ہی نیم بے ہوشی کا ڈرامہ کر رہا تھا۔ انہوں نے میری تلاشی لینے یا گرفتار کرنے کی بجائے پہلے ابتدائی طبی امداد کے لئے ہسپتال بھیجا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ پوری رات سمندر کے اندر تنہا لڑتے ہوئے اور موت کو اتنے نزدیک سے دیکھنے کے بعد میں کچھ دن تک ابنارمل رہوں گا۔ مجھے اپنی قوت بحال کرنے کے لئے کچھ دن ہسپتال رہنا تھا لیکن ایسی کوئی بات نہ تھی۔ میں پاکستان ڈی پورٹ نہیں ہونا چاہتا تھا اور ہسپتال میں رہ کر پولیس کی تفتیش سے بچنا چاہتا تھا۔

احمد مر چکا تھا۔ وہ دنیا کی اس قید سے آزاد ہو گیا تھا لیکن میں ابھی زندہ تھا اور مجھے ابھی مزید امتحانوں سے گزرنا تھا۔ مجھے امریکہ جانا تھا۔ اس امریکہ کے لئے میں نے اپنا گھر بار، ماں باپ سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔ ایمان کا خواب پورا کرنے کے لئے میں نے ایمان کو چھوڑا تھا اور آج احمد کو بھی چھوڑ کر جا رہا تھا۔

میں ہسپتال سے باہر نکلا اور تیزی سے ایک طرف کو بھاگنے لگا۔ میں جلد سے جلد اس ہسپتال سے دور ہو جانا چاہتا تھا۔ میرا رخ شہر سے باہر جانے والے راستے پر تھا۔ دیکلی چھوٹا سا ساحلی شہر تھا۔ ایک گھنٹے میں ہی میں شہر سے باہر جنگل میں پہنچ گیا۔ جنگل میں پیدل چلتے چلتے میں نے نالے کو تلاش کر لیا اور پھر اس کے ساتھ ساتھ چلتے میں پرانی جگہ پر آ گیا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں ہم نے پچھلی پانچ راتیں گزاری تھیں۔ میں اسی جگہ جا کر لیٹ گیا۔ مجھے ہسپتال سے نکلے ہوئے پانچ گھنٹے سے زیادہ وقت ہو گیا تھا اور اب شام ہونے والی تھی۔

میرا آج رات یہیں گزارنے کا ارادہ تھا بلکہ میں کل رات بھی یہیں رک جاتا۔ باہر شہر میں لڑکوں کے مرنے کی وجہ سے کافی سختی ہو گئی ہو گی۔ اس لئے وہ دن یہاں گزار کر نکلتا تو شہر میں سختی کم ہو چکی ہوتی۔ میرے پاس ترکی کا چالیس دن کا سٹے تھا اور ابھی اس سٹے کو گزرے ہوئے صرف سات دن ہوئے تھے۔ دو دن یہاں نکال کر بھی میرے پاس پورا مہینہ پڑا ہوا تھا۔ میں نے سپیڈ بوٹ کا سفر دیکھ لیا تھا اور اب ایک بار پھر اسی طریقے سے یونان جانا چاہتا تھا۔ یہ سفر خطرناک تو بہت تھا لیکن مجھے ہر حالت میں آگے سفر جاری رکھنا تھا۔

میں ایک درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر لیٹا ہوا تھا۔ کل دن کو اسی وقت یہاں سب لڑکے ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ احمد کے ہنسی مذاق کی آوازیں بھی انہی آوازوں میں شامل تھیں لیکن آج ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ہماری آوازیں دم توڑ گئی تھیں۔ میری آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے اور میں درخت کے ایک ٹوٹے ہوئے تنے کو گلے سے لگائے رونے لگا۔ ایسے ہی روتے ہوئے میری آنکھ لگ گئی اور میں گہری نیند سو گیا۔ آج احمد کے بغیر پہلی رات گزار رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دل غم سے بھرا ہوا تھا۔ جاگتے ہوئے جب جب احمد کی یاد آتی تھی تو مجھ پر غشی سی طاری ہونے لگتی تھی۔ شاید خدا کو میری حالت پر ترس آ گیا تھا اور وہ مجھے گہری نیند سلانے لگا۔ جب میں گہری نیند سو گیا تو مجھے خواب میں میرا پورا بچپن دکھانے لگا۔

سیالکوٹ کی گلیوں میں گزارے ہوئے دن، چاول کے کھیت، نانا اور نانی کی محبت، امرود، جامن اور

انار کے درخت، بہاولپور کے صحرا، راجھستان کی محبت، ریت کے اونچے اونچے ٹیلے اوران ٹیلوں پر چرنے والی بکریاں اوران کے چھوٹے چھوٹے بچے، انہی چھوٹے چھوٹے بچوں کے پیچھے بھاگتی ہوئی ایمان اور میرے ماں باپ، بہن بھائی، سکول کے چھوٹے سے گراؤنڈ میں کرکٹ کھیلتے ہوئے میرے دوست، ایمان کا شوہر اسلم اور نمبر دار (جس نے مجھے اور ایمان کو درخت سے الٹا لٹکا کر مارا تھا)، سبزی کے کھیتوں میں کام کرتا ہوا میرا باپ۔۔۔ ''بیٹا ان سبزیوں اور جانوروں سے محبت کرنا سیکھو۔'' باتیں محبت کی تھی جو نفرت سکھا گئیں۔ سندھ پولیس کا ڈی ایس پی، نرما، نوید اور ایران کا یہ کردلڑ کا احمد مجھے سب دکھائی دے رہا تھا۔

میں ایک ایک کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے ان سب کا قرض چکانا تھا۔ یہ سب لوگ میری زندگی میں آئے اور صرف ایک ایمان کی محبت نے ان سب چہروں کو مجھ سے دور کر دیا۔ محبت میں بہت طاقت ہوتی ہے۔ یہ ایک خوبصورت سے چہرے کی محبت ہی تھی جس نے سب چہروں کی چمک کو ماند کر دیا تھا۔ میں نے ایک بھرپور سانس لی اور میری آنکھ کھل گئی۔

چاروں طرف گھپ اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ رات کی تاریکی نے اپنے پر پھیلائے ہوئے تھے۔ ایک عجیب سی خاموشی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی اور اس خاموشی سے مجھے ڈر لگنے لگا۔ میں خوفزدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگا لیکن اتنے اندھیرے میں کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایک انجانا سا خوف میری ہڈیوں میں رچا ہوا تھا۔ ایک عجیب سی بے چینی میں اپنے جسم میں محسوس کر رہا تھا اور میری سانس اٹک اٹک کر چل رہی تھی۔

میں جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور نیچے نالے پر جا کر منہ دھونے لگا۔ غم اور خوف کی ملی جلی کیفیت کم ہونے کی بجائے مسلسل بڑھ رہی تھی۔ نالے کے اندر گھٹنوں تک پانی تھا جو تیزی سے بہہ رہا تھا۔ میں کپڑوں سمیت نالے کے پانی کے اندر لیٹ گیا۔ پانی کی ٹھنڈک بھی میرے غم کے آگے ہار رہی تھی۔ میں ایک باہر کی طرف ابھرے ہوئے پتھر پر سر رکھ کر بڑی دیر تک ایسے ہی لیٹا رہا۔ آہستہ آہستہ میرے غم کی شدت کم ہوئی اور اس کی جگہ ٹھنڈک نے لے لی۔ صرف آدھے گھنٹے میں ہی میں سردی سے کانپنے لگا تو میں پانی سے باہر آ گیا۔

میرے کپڑے پانی سے گیلے ہو چکے تھے۔ میں نے ایک ٹراؤزر کے علاوہ سارے کپڑے اتارے

اور انہیں اچھی طرح نچوڑ کر قریب ہی جھاڑی پر سوکھنے کیلئے ڈال دیئے۔ خود سردی سے لڑتا رہا اور آخر کار صبح کی کرنیں نمودار ہونا شروع ہو گئیں۔ سورج کی روشنی درختوں سے چھن چھن کر باہر آئی تو میرے کپڑے سوکھنے لگے۔ دوپہر تک کپڑے مکمل سوکھ گئے اور میں نے دوبارہ پہن لئے۔ دوسری رات بھی میں نے یہیں گزاری اور پھر تیسرے دن صبح صبح جنگل سے باہر آ گیا۔ میری جیب میں ترکی کرنسی اور سٹے موجود تھا۔ یہ ساری چیزیں ہم ڈبل شاپر بیگ میں گانٹھ لگا کر رکھتے تھے اس لئے ان کے بھیگنے کا کوئی ڈر نہیں تھا۔

بہاولپور کے دیہاتی علاقوں میں آج بھی لوگ لفافوں کے اندر پیسے رکھتے ہیں۔ یہاں گرمی پچاس ڈگری سنٹی گریڈ سے بھی زیادہ ہو جاتی ہے تو یہ لوگ کپڑوں سمیت نہروں اور کھالوں میں چھلانگ لگا دیتے ہیں۔ نہر کے کنارے چلتے چلتے یہ پانی میں کپڑوں سمیت ڈبکی لگا دیتے ہیں اور باہر نکل کر پھر چلنا شروع ہو جاتے ہیں۔ اتنی سخت گرمی میں آدھے گھنٹے میں ہی کپڑے خشک ہو جاتے ہیں۔ آدھا گھنٹہ آرام سے گزر جاتا ہے تو پھر دوبارہ پانی میں کود جاتے ہیں۔

ہمارا سکول گاؤں سے دو کلومیٹر دور تھا۔ صبح جاتے ہوئے تو پانی ہم سے مخالف سمت میں بہتا تھا لیکن واپسی میں ہم پانچ چھ دوست ایک لڑکے کو اپنے سکول بیگ پکڑاتے، شلواروں میں ہوا بھرتے اور نہر کے پانی میں تیرتے ہوئے گاؤں پہنچ جاتے تھے۔ سکول کا بیگ اس زمانے میں اتنا بھاری نہیں ہوتا تھا۔ صرف چار پانچ کتابیں ہوتی تھیں اور بیگ ہم لڑکے باری باری پکڑتے تھے۔

پیسوں کو شاپر میں رکھنے کی عادت مجھے اپنے گاؤں سے ہی تھی اور یہ عادت آج تک قائم ہے۔ ادھر جرمنی میں بھی میں اپنے پیسوں اور لیگل سٹے کے کاغذات کو ہمیشہ لفافے میں ہی رکھتا ہوں اور اس لفافے کو پھر پرس میں رکھتا ہوں۔ دکانوں پر پیسے دیتے ہوئے یا پولیس کو کاغذات دکھاتے ہوئے لوگ ہنستے تو ضرور ہیں لیکن کیا کریں عادت جو ہے اور عادت ہمیشہ جاتے جاتے ہی جاتی ہے۔ ایک دن یہ عادت بھی چلی جائے گی۔

میں جنگل سے باہر نکل کر شہر میں آ گیا تھا۔ میرا رخ بس سٹاپ کی طرف تھا۔ یہاں سے میں بس پکڑ کر ازمیر چلا گیا۔ ازمیر چالیس لاکھ کی آبادی کے ساتھ ترکی کا تیسرا بڑا شہر تھا۔ ازمیر کی بندرگاہ استنبول کے بعد دوسری بڑی بندرگاہ تھی۔ یہ شہر تین اطراف سے پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ چوتھی طرف سمندر لگتا ہے جو

یونانی جزیرے متیلنی کو لگتا ہے۔ یہ شہر استنبول کے بعد دوسرا بڑا ایجنٹوں کا گڑھ ہے۔ سپیڈ بوٹ کی سبھی گیمیں اسی شہر یا اس کے آس پاس پھیلے ہوئے چھوٹے چھوٹے ساحلی شہروں سے نکلتی ہیں۔ جو میتیلنی جزیرے یا پھر ایتھنز شہر تک جاتی ہیں۔ یہاں سے ایک گیم کے اڑھائی لاکھ سے چار لاکھ روپے وصول کئے جاتے ہیں۔

احمد میرے یونان جانے کے پیسے ادا کر رہا تھا لیکن اس کے فوت ہو جانے کی وجہ سے اب میں اکیلا رہ گیا تھا۔ میرے پاس اب اتنے پیسے نہیں تھے جو میں ایجنٹوں کی گیم کرتا۔ سمندر میں ڈوب کر اور پوری رات کی جان توڑ کوششوں کے بعد میں بچ تو گیا تھا لیکن اس سفر میں میں نے بہت کچھ کھو دیا تھا۔ ایک تجربہ بھی حاصل ہو گیا تھا کہ میں اب بغیر ایجنٹ کے سمندر کراس کر سکتا تھا اور میں اسی چیز کی ٹرائی کرنا چاہتا تھا۔ میرے پاس ابھی تیس دن کا ترکی کا لیگل اسٹے تھا اور ان تیس دنوں میں میں سمندر کراس کر کے یونان پہنچنا چاہتا تھا۔

میں ازمیر پہنچ گیا تھا۔ چونکہ اس شہر سے ساری گیمیں نکلتی تھیں اس لئے ادھر سختی بھی زیادہ تھی۔ میں نے ازمیر سے بودرم کی ٹکٹ لی اور بس نے چار گھنٹوں میں مجھے بودرم پہنچا دیا۔ یہ شہر موسو کے مزار کی وجہ سے بھی مشہور ہے۔ یہ دنیا کے سات عجائبات میں سے ایک ہے۔ جو کہ 353 سے 350 قبل مسیح کے درمیان تعمیر ہوا اور بارہویں صدی سے پندرہویں صدی کے درمیان آنے والے زلزلوں سے تباہ ہو گیا۔ یہ شہر یونانی جزیرے کوس سے صرف بیس کلومیٹر دور ہے۔ اس شہر میں ایک فیری سروس بھی چلتی ہے جو سیاحوں کو بودرم سے کوس لے جاتی ہے۔

میری منزل بودرم نہیں بلکہ بودرم سے بیس کلومیٹر دور اکیرلر تھی۔ یہاں سے کوس جزیرہ صرف پانچ کلومیٹر دور تھا۔ ترکی کا یہ چھوٹا سا شہر بہت خوبصورت تھا۔ شہر سے باہر چاروں طرف سرسبز پہاڑ تھے۔ میرے پاس ترکی کا سٹے موجود تھا اس لئے مجھے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ میں بلا خوف اکیرلر کے ساحل پر آ گیا اور اپنے سامنے موجود کوس جزیرے کو دیکھنے لگا۔ یہ بالکل سامنے تھا اور بظاہر سمندر میں کوئی سختی نظر نہیں آ رہی تھی۔

سمندر چھوٹی چھوٹی خوبصورت کشتیوں سے بھرا ہوا تھا اور مجھے ان میں کوئی بھی کوسٹ گارڈ بانیوں کی کشتی نظر نہیں آ رہی تھی۔ سمندر بظاہر تو بہت آسان سا نظر آ رہا تھا لیکن مزید اس میں اتر کر ہی پتہ چلنا تھا کہ کون کون سے خطرے سمندر کے اندر سر چھپائے بیٹھے ہوئے تھے اور کون سے خطرے یونانی ساحل پر چھپے

ہوئے تھے۔ وہاں سے ضرور کوئی خفیہ نگرانی ہو رہی ہوگی۔ پہاڑیوں کے اوپر بنے ہوئے ٹاوروں سے فوجی دیکھ بھی رہے ہوں گے اور وائرلیس سے نیچے یونانی کوسٹ گارڈز سے بھی رابطے میں ہوں گے۔ بظاہر پر سکون نظر آنے والے سمندر میں کوئی تو گڑبڑ ضرور ہوگی۔

میرے پاس بہت وقت تھا اور میں جلدی نہیں کرنا چاہتا تھا اس لئے سارا دن ساحل پر ٹہلتا ہوا سمندر کا جائزہ لیتا رہا۔ شام کا اندھیرا چھاتے ہی کشتیاں واپس ساحل پر آکر لنگر انداز ہو گئیں تھیں۔ صرف چھ سات کشتیاں ہی سمندر کے اندر نظر آ رہی تھیں۔ شاید وہ کوسٹ گارڈ کی کشتیاں تھیں۔ مجھے اس بات کا کوئی علم نہیں تھا یا پھر وہ ماہی گیروں کی کشتیاں تھیں۔ میں رات کو بھی ادھر ساحل پر ہی گھومتا رہا اور پوری رات میں کوس جزیرے کو دیکھتا رہا جو مجھ سے صرف پانچ کلومیٹر دور تھا۔ وہاں سے یورپی یونین کی حد شروع ہو جاتی تھی۔ صرف پانچ کلومیٹر کا یہ چھوٹا سا سمندر دو تہذیبوں کو ایک دوسرے سے ملنے سے روک رہا تھا۔ یہ ایشیاء کو یورپ سے علیحدہ کر رہا تھا۔

میں اس رات ساحل پر ہی گھومتا رہا۔ مجھے کوئی بھی غیر معمولی بات نظر نہ آئی۔ صبح کو میں ایک پہاڑ کی چوٹی کی طرف چلا گیا اور پھر اس چوٹی سے سمندر کا نظارہ کرنے لگا۔ واقعی! یہ بہت آسان لگ رہا تھا۔ سردی کا موسم تھا اور سمندر کا پانی بہت ٹھنڈا تھا۔ نگرانی والے صرف سپیڈ بوٹ یا ربڑ سے بنی ہوئی کشتیوں پر نظر رکھتے تھے۔ تیر کر اتنے ٹھنڈے سمندر کو کراس کرنے والے کسی سر پھرے کی انہیں شاید امید نہیں تھی لیکن ایک سر پھرا آ گیا تھا۔ جو اپنے خوابوں کو پورا کرنے کے لئے اپنی جان بھی دینے پر تیار ہو گیا تھا۔

دو دن تک میں مسلسل سمندر کی نگرانی کرتا رہا لیکن کوئی بھی غیر معمولی بات نظر نہیں آئی۔ تیسرے دن میں سمندر کراس کرنے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔ ساحل پر چلتے چلتے میں نے لکڑی کا ایک ٹکڑا تلاش کر لیا تھا۔ یہ پانچ فٹ کے قریب لمبا اور ایک فٹ کے قریب چوڑا تھا۔ میں آسانی سے اس پر لیٹ کر پانی میں سفر کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ دو چھوٹی چھوٹی تختیاں بھی لے لیں تھیں۔ میں انہیں رسی کی مدد سے ہاتھ پر باندھ لیتا اور ان سے چپوؤں کا کام لے سکتا تھا۔ سمندر میں لکڑی کے تختے پر لیٹ کر سفر کرنے سے میں بالکل نظر نہیں آ سکتا تھا۔ میں لیٹا ہوا سمندر کی سطح سے بمشکل آدھا فٹ اوپر ہوتا جبکہ سمندر میں اٹھنے والی لہریں بھی دو فٹ سے اوپر ہوتی تھیں اور اتنے بڑے اور کھلے سمندر میں میرا دیکھ لیا جانا ناممکن تھا۔ اگر کوئی مجھے دیکھ بھی لیتا تو

بھی وہ مجھے کوئی مچھلی ہی سمجھتا۔ اتنے ٹھنڈے اور گہرے سمندر میں کسی انسان کا پایا جانا ناممکن تھا۔ اس لئے مجھے امید تھی کہ میں خیر وعافیت سے سمندر کراس کر جاؤں گا۔

رات کو بارہ بجے سے لے کر پانچ بجے تک بہت سختی ہوتی تھی۔ اس لئے میں نے رات کو آٹھ بجے ہی نکلنے کا ارادہ کیا۔ 5 کلومیٹر کا سفر تھا اور میں سات آٹھ گھنٹوں میں آسانی سے سمندر کراس کر سکتا تھا۔ رات کو آٹھ بجے کے قریب میں پوری تیاری سے ساحل پر آ گیا۔ میں نے چھوٹی تختیوں کو رسی کی مدد سے ہاتھوں پر باندھا اور اللہ کا نام لے کر سمندر میں اتر گیا۔ میں نے کوس جزیرے پر چمکنے والی روشنیوں کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا تھا۔ مجھے ان روشنیوں کی پوری فارمیشن یاد تھی کیونکہ سمندر میں جب بڑی لہریں اٹھتی ہیں تو ڈوبتے ابھرتے ہوئے آپ سمت کا احساس کھو دیتے ہو اور پھر پتہ ہی نہیں چلتا کہ آپ کس طرف سفر کر رہے ہو۔

اس سمندر میں چاروں طرف ہی روشنیاں پھیلی ہوئی تھیں اور مجھے خاص کوس جزیرے کی روشنیاں یاد رکھنی تھی تاکہ میں ان روشنیوں کی طرف ہی سفر کروں اور دوسری طرف بھٹک نہ جاؤں۔ میں لکڑی کے تختے کو لے کر سمندر میں آگے بڑھ رہا تھا۔ جب پانی میرے گلے تک آ گیا تو میں لکڑی کے تختے پر الٹا لیٹ گیا۔ میرے دونوں ہاتھ تختے کے دائیں بائیں سمندر میں تھے اور میرا سر تختے پر تھا۔ میں نے اپنے ہاتھوں کو پیچھے کی طرف حرکت دی تو میرا جسم آگے کی طرف سرکنے لگا۔ میرے دونوں بازو تختے کے ساتھ رگڑ کھا کر چھل رہے تھے اور مجھے تکلیف ہو رہی تھی۔ لیکن آہستہ آہستہ میں رواں ہو گیا اور پھر تکلیف کی پرواہ نہ کرتے ہوئے میں تیزی سے ہاتھوں کو پیچھے کی طرف دھکیلنے لگا اور آگے بڑھتا گیا۔

میرا سر سمندر کی سطح سے صرف ایک انچ اوپر تھا اور بار بار سمندر کے اندر جا رہا تھا۔ میں نے اپنا منہ سختی سے بند کیا ہوا تھا لیکن پھر بھی پانی میرے ناک کے ذریعے میرے پیٹ میں جا رہا تھا۔ سمندر کی لہریں بار بار مجھے ڈبو رہی تھیں اور میں ڈوبتا ابھرتا آگے کی طرف بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ میں تقریباً ایک گھنٹے تک مسلسل سفر کرتا رہا۔ اس کے بعد تھکاوٹ ہونا شروع ہو گئی تو میں نے اپنے ہاتھوں کو حرکت دینا بند کر دیا اور تختے پر نیم دراز ہو گیا۔ پانی کی لہریں مجھے بار بار تختے سے نیچے کی طرف دھکیل دیتی تھیں لیکن میں مضبوطی سے اوپر جما ہوا تھا۔

میں نے غلطی کر دی تھی۔ اگر میں ایک رسی سے اپنے آپ کو تختے کے ساتھ باندھ لیتا تو مجھے تختے کو

مضبوطی سے پکڑنے کی ضرورت نہ پڑتی لیکن اب میں سمندر میں تقریباً ڈیڑھ کلومیٹر آگے تک آ گیا تھا۔ ابھی مزید چار کلومیٹر سفر رہتا تھا۔ پہلا 500 میٹر کا سفر تو میں نے سمندر میں چلتے ہوئے ہی طے کیا تھا اور اس کے بعد گہرا سمندر آ گیا تھا جسے میں نے تقریباً ایک گھنٹے میں طے کر دیا تھا۔

میں اب تک ترکی کی حدود میں ہی تھا۔ پانی کی لہریں بار بار میرا رخ موڑ دیتی تھیں لیکن میں پھر اپنی پوزیشن ٹھیک کر لیتا تھا۔ 5 منٹ تک سانس لینے کے بعد میں ایک بار پھر آگے بڑھنے لگا۔ یہ سفر میرے اندازے سے زیادہ تیزی سے طے ہو رہا تھا اور پانی کی ٹھنڈک اور مشکلات بھی میرے اندازے سے زیادہ ہو رہی تھیں لیکن ان سب چیزوں کے باوجود میں آگے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اگر اسی رفتار سے آگے بڑھتا رہتا تو بارہ بجے سے پہلے پہلے میں کوس پہنچ سکتا تھا۔ اب میں نے اپنی رفتار تیز کر لی اور جلدی جلدی ہاتھ چلانے لگا۔ میرے دونوں کندھے لکڑی کے ساتھ رگڑ کھا کھا کر زخمی ہو چکے تھے اور ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میرے کندھے جسم سے الگ ہو رہے ہوں۔

مزید ڈیڑھ گھنٹے تک مزید سفر کرنے کے بعد میں سمندر کے درمیان میں آ گیا تھا۔ میرے بازو مسلسل حرکت کرتے کرتے اب بالکل جیسے ختم ہو گئے تھے اور درد کی زیادتی کی وجہ سے میرے منہ سے کراہیں نکل رہی تھیں۔ سمندر کا پانی میرے منہ میں جا جا کر میرا منہ بھر گیا تھا اور مجھے بار بار قے آ رہی تھی۔ میں سمندر کے اندر ہی الٹیاں کر رہا تھا۔ میرا سر چکرا رہا تھا اور درد کی شدت کی وجہ سے میں اپنا سر دائیں بائیں مار رہا تھا۔ جب درد کی زیادتی حد سے بڑھ گئی تو میں کچھ دیر کے لئے لہروں پر بے حس و حرکت لیٹا رہا۔ سمندر کی لہریں بار بار مجھے تختے سے نیچے گرا رہی تھیں لیکن میں نے مضبوطی سے تختے کو تھاما ہوا تھا۔ اس گہرے نیلے سمندر میں صرف پانچ فٹ کا یہ چھوٹا سا لکڑی کا تختہ ہی زندگی تھا اور میں اس زندگی کو مضبوطی سے تھامے ہوئے تھا۔

تھوڑی دیر تک آرام کرنے کے بعد میں ایک بار پھر آگے کی طرف زور لگانے لگا۔ اس بار میں اپنی ہر تکلیف بھلائے ہوئے تھا۔ مجھے ہر حالت میں اب اس پار دوسری طرف پہنچنا تھا اور اس کے لئے میں اپنی جان کو بھی داؤ پر لگا رہا تھا۔ میں ہر تکلیف سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ محبت درد تو دیتی ہے لیکن بڑے بڑے امتحانوں سے گزر جانے کی ہمت بھی دیتی ہے۔ آج اسی ایمان کی محبت مجھے اس سمندر میں راستہ دکھا رہی

تھی۔

’’راضی بھائی! خدا آپ کو جرمن بھی دکھائے گا اور امریکہ بھی۔‘‘ مجھے احمد کے کہے ہوئے الفاظ یاد آنے لگے۔

’’راضی! میں نے اپنے پیار کی قربانی تمہارے اچھے مستقبل کی خاطر دی ہے۔۔۔ میرے پیار میں بہت طاقت ہے اور یہ پیار ہی تجھے امریکہ لے کر جائے گا۔‘‘ مجھے ایمان کی کہی ہوئی باتیں بھی یاد آ رہی تھیں جس سے میرا حوصلہ بڑھ رہا تھا۔ یہی باتیں مجھے آگے بڑھنے پر مجبور کر رہی تھیں۔ یونانی کوس جزیرہ نزدیک سے نزدیک تر ہو رہا تھا۔ تقریباً بارہ بجے کے قریب میں کوس سے صرف ایک کلومیٹر دور رہ گیا تھا۔ میں آہستہ سے تختے سے نیچے سرکا اور تختے کو مضبوطی سے پکڑ کر نیچے پانی میں اترنے لگا۔ میں پورا پانی میں اتر گیا تھا لیکن میرے پاؤں نیچے سطح سے نہیں ٹکرائے۔ یہاں ابھی بھی پانی گہرا تھا اور مجھے مزید سفر کرنا تھا۔ اگر ایک بار میرے پاؤں سطح سے ٹکرا جاتے تو پھر میں چلتے ہوئے باقی سفر طے کر سکتا تھا۔

میں دوبارہ تختے پر آ گیا اور ایک بار پھر نئے جذبے کے ساتھ آگے کی طرف بڑھنے لگا۔ صرف پندرہ منٹ سفر کرنے کے بعد میں ایک بار پھر نیچے اترا۔ اس بار میرے پاؤں سطح سے ٹکرا گئے۔ یہاں پانی گلے تک گہرا تھا۔ میں نے تختے کو ہاتھ سے پکڑا اور چلتے ہوئے ساحل کی طرف بڑھنے لگا۔ میں تختے کو ابھی پھینکنا نہیں چاہتا تھا اس لئے اسے ساتھ لے کر ساحل پر آ گیا۔

یہ ایک ویران سا ساحل تھا۔ میں نے تختے کو چٹانوں کے درمیان میں رکھا اور اس کے اوپر چار پانچ پتھر رکھ دیئے۔ چھوٹی تختیوں کو میں نے دوسری جگہ پر دبا دیا۔ اس کے بعد میں جلدی سے ادھر سے نکلا اور جزیرے کے اندر کی طرف جانے لگا۔ میں آج کا دن یہیں گزارنا چاہتا تھا۔ میرے پاس یورو کرنسی نہیں تھی۔ میں ایران سے 25 ہزار روپے کے برابر تر کی کرنسی لے کر نکلا تھا اور ابھی تک صرف دس ہزار کے قریب ہی خرچ ہوئے تھے۔ یہ وہی رقم تھی جو میں نے ایران میں سبزی کا کام کر کے کمائے تھے۔

میرا رستے میں کوئی بھی خرچہ نہیں ہوا تھا۔ میں نے صرف استنبول سے ایڈرن شہر تک کا کرایہ دیا تھا اور پھر دوسری بار دیکلی سے ازمیر اور ازمیر سے پھر بودرم اور اکیرلر تک کا کرایہ میں نے ادا کیا تھا۔ ان کرایوں میں میرے دس ہزار کے قریب خرچ آ گیا تھا۔ باقی پندرہ ہزار کے برابر تر کی کرنسی ابھی تک میرے پاس

موجود تھی۔ جن کو میں نے یورو میں تبدیل کروانا تھا۔ میں رات کسی محفوظ مقام پر بسر کرتا اور دن کو کسی منی چینجز کی دکان سے کرنسی تبدیل کروانے کی کوشش کرتا۔ یہ کام اتنا مشکل نہیں تھا۔ زیادہ مشکل کام بحری جہاز کی ٹکٹ لینا تھا اور پھر بحفاظت ایتھنز شہر پہنچنا تھا۔ میں یونان کی حدود میں ایک بار پھر داخل ہو گیا تھا اور اس بار مجھے ہر حالت میں بحفاظت ایتھنز پہنچنا تھا۔ میں مین شہر سے ہٹ کر باہر کی طرف جانے لگا۔

تقریباً 35000 کی آبادی والا یہ جزیرہ 40 کلومیٹر لمبا اور 8 کلومیٹر چوڑا ہے اور پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ اس جزیرہ کی آمدنی کا ذریعہ یہاں آنے والے سیاح ہیں جو انگلینڈ اور جرمنی وغیرہ سے آتے ہیں۔ اس کے علاوہ کھیتی باڑی اور مچھلی پکڑنے کا کام بھی ہوتا ہے جو زیادہ تر جزیرے پر ہی استعمال ہو جاتی ہے۔

ابھی صرف رات کا ایک ہی بجا تھا۔ میں نے بہت جلدی سمندر کراس کر لیا تھا۔ رات کے وقت شہر میں پھرنا خطرناک تھا اس لئے میں تیزی سے شہر کراس کرتا ہوا پہاڑوں پر چلا گیا۔ ایک نسبتاً کم اونچے پہاڑ پر چڑھ کر میں جھاڑیوں میں چھپ کر لیٹ گیا۔ میرے کپڑے سمندر کے پانی کی وجہ سے گیلے ہو گئے تھے۔ میں نے کپڑے اتار کر جھاڑیوں کے اندر سوکھنے کے لئے ڈال دیئے۔ دن کو کپڑے خشک ہو جاتے تو انہیں پہن کر میں شہر چلا جاتا اور منی چینجر کی دکان تلاش کرتا۔

یہ ترکی سے متصلہ جزیرہ تھا اور یہاں ترکی کی کرنسی بھی کچھ دکانوں میں استعمال ہوتی تھی۔ یہ 2006ء کی بات ہے اور اس وقت یورو ابھی ترقی کی منازل طے کر رہا تھا۔ ایک یورو پاکستانی 75 روپے کا آتا تھا۔ جبکہ اس زمانے میں ترکی کی کرنسی چالیس پینتالیس روپے کے قریب تھی۔ آج تو یورو 120 روپے سے بھی اوپر ہو گیا ہے اور پوری دنیا میں ڈالر کے بعد یورو ہی دوسری بڑی کرنسی ہے۔ جسے پوری دنیا میں خریدا بھی جاتا ہے اور بیچا بھی جاتا ہے۔ شاید آج کوس جزیرے میں ترکی کرنسی استعمال نہ ہوتی ہو۔ اس چیز کا ابھی مجھے کوئی پتہ نہیں ہے۔

رات میں نے چوٹی پر ہی گزاری اور دوسرے دن بارہ بجے کے قریب جب میرے کپڑے خشک ہو گئے تو میں کپڑے پہن کر پہاڑ سے نیچے آ گیا اور آہستہ آہستہ شہر کی طرف جانے لگا۔ میں کھیتوں کے درمیان سے گزر رہا تھا۔ یہ پالک اور شلجم کے کھیت تھے۔ میں کھیت کے کنارے کنارے چل رہا تھا۔ مجھ سے تقریباً دو کھیت دور آٹھ دس لڑکے کھیت سے پالک نکال رہے تھے۔ میں ان کی طرف دیکھتا ہوا چل رہا تھا۔ ان

لڑکوں کے نقوش ایشین تھے۔شاید عربی یا افغانی ہوں۔ میں خاموشی سے چلتا رہا۔ان لڑکوں کی مخالف سمت میں ایک بڑا سا شیڈ بنا ہوا تھا۔جس کیساتھ ہی پانی کی ایک بہت بڑی حوضی بنی ہوئی تھی جس میں یہ لوگ سبزی کو دھوتے ہیں۔

پورے یونان میں سبزی کو ہمیشہ دھو کر ہی منڈی بھیجا جاتا ہے۔بغیر دھوئے سبزی منڈی والے نہیں خریدتے۔اس لئے ہر ڈیرے پر پانی کی ایک حوضی ضرور ہوتی ہے۔جس میں سبزی کو دھو کر پھر کریٹوں میں ڈالا جاتا ہے اور اس کے بعد پھر منڈی لے جایا جاتا ہے۔

لڑکے مجھ سے دو کھیت دور تھے اور ان کی آواز مجھ تک نہیں پہنچ رہی تھی یا شاید وہ آپس میں بات ہی نہیں کر رہے تھے یا آہستہ بات کر رہے تھے۔ میں ان لوگوں کی طرف دیکھتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ڈیرے کی طرف سے مجھے ایک نوجوان لڑکا آتا ہوا دکھائی دیا۔اس کا رخ میری طرف تھا۔ایک منٹ کے لئے تو میں ڈر گیا کہ شاید وہ مجھے پہچان لے گا کہ میں مہاجر ہوں۔اس کے علاوہ انجان ملک میں دھوکہ اور پیسے چھننے کا ڈر بھی ہوتا ہے۔ میں اس لڑکے سے بچ کر دوسری طرف نکلنے لگا تو اس نے مجھے آواز لگا دی۔ وہ یونانی زبان میں کچھ کہہ رہا تھا لیکن مجھے یونان آئے ابھی ایک ہی تو رات ہوئی تھی۔ مجھے ان کی زبان کہاں آتی تھی۔

اب میرے پاس صرف دو ہی آپشنز تھے یا تو میں بھاگ جاتا مگر ایسا کرنے کی وجہ سے شاید وہ سارے لڑکے میرے پیچھے بھاگ کھڑے ہوتے یا پھر مجھے چور سمجھتے ہوئے پولیس کو فون کر دیتے۔ میں واپس پہاڑ کی طرف نہیں بھاگ سکتا تھا کیونکہ مجھ سے پہلے کھیتوں میں کام کرنے والے لڑکے ادھر پہنچ جاتے۔اس کے علاوہ ان لڑکوں کے پاس کتے بھی موجود تھے۔ وہ ایک منٹ میں ہی مجھے پہاڑوں سے ڈھونڈ نکالتے۔شہر کی طرف جانا رسک تھا۔پولیس شہر میں گھومتی رہتی ہے اور شہر کے اندر چھپنے کا بھی کوئی ٹھکانا نہیں ہوتا۔میں دوسرا آپشن استعمال کرتا اور اس لڑکے کی بات سن لیتا اور اس سے کام کا بھی پوچھ لیتا۔وہ مجھے کام تلاش کرنے والا کوئی لڑکا ہی سمجھتا اور اس سے میری بچت ہو سکتی تھی۔

میں نے رکنے کا فیصلہ کر لیا اور کھڑا ہو کر اس لڑکے کا انتظار کرنے لگا۔تھوڑی دیر بعد وہ لڑکا میرے پاس آ کر رک گیا۔اس نے کالے ٹراؤزر کے ساتھ لال رنگ کی شرٹ پہنی ہوئی تھی اور دونوں ٹراؤزر اور شرٹ مٹی سے اٹی ہوئی تھی۔اس نے کھیتوں میں کام کرنے والے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ پندرہ یا سولہ

سال کا نوجوان لڑکا تھا۔ گورا رنگ، اس کے چہرے پر ابھی تک داڑھی یا مونچھوں کا نشان تک نہیں تھا۔ اس کے بال البتہ مٹی سے اٹے ہوئے تھے لیکن بہت ملائم اور سلکی لگ رہے تھے۔ میں نے ایک منٹ میں ہی اس لڑکے کا پورا جائزہ لے لیا۔ وہ شکل سے ہی یورپین لگ رہا تھا اور اس نے آتے ہی مجھ سے یونانی زبان میں کچھ کہا تھا۔ جس کی مجھے کوئی سمجھ نہیں آئی۔

''جی! مجھے یونانی زبان نہیں آتی ہے۔ میں کام کی تلاش میں ادھر آیا ہوں، کام تلاش کر رہا ہوں۔'' میں نے اس سے انگلش میں بات کرتے ہوئے کہا۔ میں نے یہاں کام نہیں کرنا تھا۔ اگر وہ حامی بھر بھی لیتا تو میں اس سے بھیڑیں چرانے کا کام پوچھتا سبزی کا نہیں۔ کیونکہ مجھے صرف اس سے جان چھڑانی تھی۔

''کون سے ملک کے ہو؟ بلغاریہ یا رومانیہ؟'' اس نے مجھ سے سوال کیا۔

اس کی طرح میرا رنگ بھی سفید تھا اور وہ مجھے یورپین سمجھ رہا تھا۔ اس زمانے میں رومانیہ اور بلغاریہ یورپی یونین میں نہیں آئے تھے اور یونان میں زمیندارے کے کام پر انڈین اور پاکستانی لڑکوں کے بعد انہی دو ملکوں کے لوگ کام کرتے تھے۔ 2010ء کے بعد یہ دونوں ملک یورپی یونین کے اندر آ گئے تو یہ لوگ زراعت کا کام چھوڑ کر بڑے ممالک (جرمنی، فرانس یا سپین) میں چلے گئے۔ کیونکہ ان کو ویزہ فری انٹری اور پورے یورپ میں کام کرنے کی اجازت مل گئی تھی۔ 2013ء تک ایک بھی رومانی یا بلغاری یونان میں نہیں رہا تھا۔ سب چلے گئے اور ان کی جگہ پاکستانیوں نے لے لی۔ آج پورے یونان میں کھیتی باڑی اور سبزیوں کا کام پاکستانی ہی کر رہے ہیں۔ آپ کو یونان کے ہر گاؤں کے ہر ڈیرے پر پاکستانی لڑکے کام کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔ وہ لڑکا مجھے یورپین سمجھ رہا تھا۔

''نہیں! میں ایرانی ہوں۔'' میں نے اپنے آپ کو ایرانی بتاتے ہوئے کہا۔ مجھے رومانیہ اور بلغاریہ کی زبان نہیں آتی تھی۔ اگر وہ لڑکا ان دونوں میں سے کسی ایک ملک کا ہوتا تو وہ مجھے فوراً پہچان جاتا۔

''اوہ ایران؟ مسلم؟ میں بھی مسلم ہوں۔۔۔ پاکستان سے۔'' اس نے خوش ہوتے ہوئے میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

میرے سارے اندازے غلط ثابت ہو گئے تھے۔ وہ پاکستانی تھا اور میرا ہم زبان بھی۔ وہ میرے

ملک کا رہنے والا تھا۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔ میں سات سمندر پار ایک یورپی ملک میں اچانک اپنے ہم وطن کو دیکھ رہا تھا۔ شاید آپ لوگ بھی حیران ہو رہے ہوں لیکن اس میں اتنی حیرانگی کی کوئی بات نہیں ہے۔ یونان، اٹلی، فرانس، سپین اور جرمنی کے ہر شہر کے ہر گاؤں میں آپ کو پاکستانی نظر آ جائیں گے۔ ان ملکوں میں جگہ جگہ آپ کو پاکستانی اور انڈین نظر آئیں گے۔ بسوں میں، ٹرینوں میں اور میٹرو پر ہر جگہ کوئی نہ کوئی پاکستانی یا انڈین ضرور نظر آ جائے گا۔

یونان کے دارالخلافہ ایتھنز میں آپ گھر سے باہر نکل کر صرف پانچ منٹ پیدل چلیں تو آپ کو کوئی نہ کوئی پاکستانی مل جائے گا۔ اس شہر میں آپ کو سینکڑوں پاکستانی دکانیں ملیں گی جو باربر شاپ سے لے کر بڑے بڑے ہوٹلوں اور ٹریول ایجنسیوں تک ہوتی ہیں۔ یہ سارے پاکستانی بزنس مین ہیں جو ستّر سے اسّی کی دہائی میں ادھر یورپ آئے اور اب ان کی دوسری نسل بھی جوان ہو کر بزنس کر رہی ہے۔ ہم پاکستانی یا انڈین کے یہ خون میں ہوتا ہے کہ ہم جتنی مرضی ترقی کر لیں ہم چاند پر بھی پہنچ جائیں تو پھر بھی اپنی اقدار، اپنے معاشرے اور زبان کو نہیں بھولتے۔ ہمارے بچے یورپ میں ہی پیدا ہوتے ہیں، یہیں پلتے اور بڑھتے ہیں لیکن اندر سے پنجابی ہی رہتے ہیں۔

''بھائی کدھر کھو گئے ہو؟'' اس نے دوبارہ مجھے مخاطب کیا تو میں چونک گیا۔ اس کا ہاتھ ابھی تک میری طرف بڑھا ہوا تھا۔ میں جلدی سے اس سے ہاتھ ملانے لگا۔

''آپ کام کی تلاش میں ادھر آئے ہو؟'' اس نے ایک بار پھر مجھ سے سوال کیا۔

''بھائی میں بھی پاکستانی ہی ہوں۔ بہاولپور سے۔۔۔ آپ کدھر سے آئے ہو؟'' میں اب تک اس پر پورا اعتبار نہیں کر رہا تھا۔

''اچھا! آپ پاکستانی ہو؟ میں گجرات سے ہوں۔۔۔ سرفراز نام ہے میرا۔'' اس نے ایک بار پھر میرے طرف ہاتھ بڑھایا تو میں نے آگے بڑھ کر اس کو گلے سے لگا لیا۔

وہ ایمان کے شہر سے تھا۔ مجھے بہت اپنائیت سی محسوس ہو رہی تھی۔ گجرات کے ایک ایک فرد پر میں اعتبار کر سکتا تھا اور میرا دل مجھے سرفراز پر بھی اعتبار کرنے کو کہہ رہا تھا۔

''بھائی کام ڈھونڈ رہے ہو؟ کوئی بات نہیں ہے، وہ سامنے جولڑکے کھیت میں کام کر رہے ہیں وہ سارے ہی پاکستان سے ہیں۔ہم دس لڑکے ادھر کام کرتے ہیں جن میں سے تین لڑکے سیالکوٹ سے ہیں اور باقی سات گجرات کے ایک ہی گاؤں سے ہیں۔میرا کزن ادھر فورمین ہے میں اس سے بات کرتا ہوں۔ آپ بھی ہمارے ساتھ ہی کام کرو۔'' اس نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

کھیتوں میں کام کرنے کی وجہ سے اس کے کپڑے ضرور گندے تھے لیکن اس کے چہرے کی چمک اسے ایک اچھے کھاتے پیتے گھرانے سے بتا رہی تھی۔اسے یونان آئے ہوئے ابھی چھ مہینے ہی ہوئے تھے۔ وہ آگے جرمنی جانا چاہتا تھا لیکن اٹھارہ سال سے کم عمر ہونے کی وجہ سے دونمبر ہوائی جہاز کے ذریعے جرمنی نہیں جا سکتا تھا۔

اس زمانے میں جرمنی کی بائی ایئر گیم دو ہزار یورو میں ہوتی تھی۔ایجنٹ جرمنی کے پانچ سالہ ویزے والے پاکستانی پاسپورٹ کی تصویر تبدیل کر کے جہاز پر چڑھنے کی کوشش کرتے تھے۔اس زمانے میں 300 یورو کی جہاز کی ٹکٹ آتی تھی۔اب 2017ء میں تو 100 یورو سے بھی کم قیمت کی ٹکٹیں مل جاتی ہیں۔اگر نہ پکڑے گئے اور لڑکا خیریت سے جرمنی پہنچ جائے تو دو ہزار ورنہ 300 یورو کا نقصان ہو جاتا تھا۔ایئر پورٹ پر پکڑے جانے کی صورت میں زیادہ سے زیادہ ایک مہینے کی جیل ہوتی تھی۔اب تو وہ بھی ختم ہو گئی ہے۔ظاہر ہے ہم کوئی مجرم تھوڑی ہوتے ہیں۔

''آجاؤ آپ! میں ان سے آپ کی بات کرواتا ہوں۔'' اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے کھیتوں کی طرف لے جانے لگا۔

''یار! مجھے ایک پرابلم ہے۔۔۔میں واپس ایتھنز شہر جانا چاہتا ہوں۔'' میں اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔اب کی بار اسے مجھ پر شک ہونے لگا۔

''بھائی جی! کوئی سیدھی بات کیوں نہیں بتا رہے ہو؟ پہلے ایرانی بول رہے تھے، پھر کام کا بولا اور اب واپس جانا ہے۔۔۔خیریت تو ہے؟'' اس نے الجھتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں کو باتیں کرتے ہوئے دیکھ کر دوسرے لڑکے بھی آ گئے تھے۔میں پھنس گیا تھا۔اب یا تو سچ

بول دیتا (پاکستانی تھے اور میری مدد کر سکتے تھے) یا پھر کوئی اچھا سا بہانہ بنا لیتا۔

''ہاں بلّے! کون ہے یہ؟'' دوسرے لڑکے نزدیک آ گئے تو ان میں سے ایک لڑکے نے سرفراز کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

سرفراز اس کا اصل نام تھا۔ جبکہ ''بلّا'' اسے گھر والے پیار سے کہتے تھے اور یہی نام یہاں بھی دوسرے لڑکے پکارتے تھے۔ اس ڈیرے پر سارے لڑکے اس کے کزن اور گاؤں کے تھے۔ اس لئے گاؤں کا نام یہاں بھی یہ لوگ پکارتے تھے۔ ان سب چیزوں کے علاوہ سرفراز بلا کے نام کا ٹیٹو بھی اس کے بازو پر بنا ہوا تھا جو شرٹ پہننے پر نظر آ جاتا تھا۔ اس ٹیٹو کی سب سے خاص بات یہ کہ وہ اردو میں لکھا ہوا تھا اور ایسے لگتا تھا جیسے کسی تیسری کلاس کے بچے نے لکھا ہو۔ اس کی سفید رنگت پر ٹیٹو کسی بدنما نشان کی طرح نظر آتا تھا اور اب اسے مٹانے کے لئے ہر طرح کی کوشش کر چکا تھا لیکن اسے ختم نہیں کر سکا تھا۔

پاکستان میں ایسے ٹیٹو بنانے والوں کو بھی جیل میں ڈالنا چاہیے جو 18 سال سے کم عمر کے بچوں کے جسموں پر بناتے ہیں۔ یورپ میں یہی قانون ہے۔ آپ 18 سال سے زیادہ کے ہو جاؤ تو بے شک پورے جسم پر ٹیٹو بنوا لو لیکن 18 سال سے کم عمر بچوں پر پابندی ہے اور اس کی خلاف ورزی کرنے والوں کو جیل بھی ہوتی ہے اور اس کی دکان کا لائسنس بھی ضبط ہو جاتا ہے۔

''بھائی جی! یہ بہاولپور سے ہے، مجھے لگتا ہے شاید یہ جھوٹ بول رہا ہے۔'' سرفراز بلے نے ابھی تک میرا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔

''کیوں بھائی! کیا نام ہے تمہارا اور ادھر کیا کرنے آئے ہو؟'' اس بار ایک اور آدمی نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

''جی میں بہاولپور سے ہی ہوں اور آج ہی ترکی سے ادھر آیا ہوں۔ میں رات کو کشتی کی مدد سے ترکی سے اس جزیرے پر پہنچا ہوں اور ابھی مجھے ایتھنز جانا ہے تاکہ میں یونان میں رہنے کا عارضی اسٹے حاصل کر سکوں۔'' اس زمانے میں کوس جزیرے سے اسٹے جاری نہیں ہوتا تھا۔ اسٹے صرف ایتھنز، سلونیکی اور الیگزانڈ پلی سے ملتا تھا۔ بعد میں یہ یونان کے دوسرے شہروں اور جزیروں سے بھی ملنا شروع ہو گیا تھا۔

''تم رات کو ہی ادھر آئے ہو؟ کتنے لڑکے رات کو اس جزیرے پر پہنچے ہو؟ اور باقی لڑکے کدھر ہیں؟''
وہ مجھ سے مزید سوالات پوچھنے لگا۔

''بھائی جی! میں اکیلا ہی اس طرف آیا ہوں۔ ایک ترکی سپیڈ بوٹ والے نے مجھے ادھر پہنچا دیا تھا۔''
میں انہیں اکیلے سمندر کراس کرنے والی بات نہیں بتا سکتا تھا۔

''اچھا اچھا! اب ہم سمجھ گئے ہیں۔ کوئی بات نہیں یار! گھبرانا مت، ہم سب آپ کے بھائی ہیں۔'' اس لڑکے نے میرے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔

''لیکن بھائی! شپ تو صبح 8 بجے نکل جاتا ہے، ابھی تو کوئی بھی شپ نہیں ملے گا۔'' سرفراز نے آگے بڑھ کر جلدی سے کہا۔

''ہاں یار! وہ تو واقعی صبح 8 بجے نکل جاتا ہے اور یہاں سے ایتھنز صرف ایک ہی شپ روزانہ جاتا ہے۔ اب تم کو کل صبح 8 بجے ہی دوسرا ملے گا۔''

دوسرے آدمی کا نام فیض چیمہ تھا اور اسے سرفراز کے علاوہ سب چیمہ صاحب کہہ کر بلاتے تھے۔ بہت اچھا اور بہت نائس انسان تھا۔ میں نے اس سے اچھا اور نفیس انسان اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔ ان کی فیملی بہاول پور سے تھی جو بعد میں سیالکوٹ شفٹ ہوگئی تھی۔ جبکہ ہم دونوں ایک دوسرے کے الٹ تھے۔ وہ ملتان اور بہاول پور میں (ASI) اسسٹنٹ سب انسپکٹر کے عہدے پر بھی پولیس میں کام کر چکے تھے۔ بعد میں سیاسی جھگڑوں کی وجہ سے پولیس کی نوکری چھوڑ کر یورپ آ گئے۔ چیمہ صاحب بھی جرمنی جانا چاہتے تھے اور یہ اسی سال جرمنی چلے گئے۔ سرفراز ان سے چار سال بعد 2011 میں جرمنی پہنچ گیا۔ یہ دونوں ابھی جرمنی شہر کارل سروہے (KARLSRUHE) میں رہتے ہیں۔

چیمہ صاحب تو ٹیکسی کے کاروبار سے وابستہ ہیں اور سرفراز سب وے (SUBWAY) میں ملازمت کرتا ہے۔ چیمہ صاحب کو کھانا بنانے کا بہت شوق تھا اور ان کے ہاتھ میں ذائقہ بھی بہت تھا۔ یہ واقعی ہنڈیا میں جان ڈال دیتے تھے۔ پولیس والے جو تھے اس لئے یہاں اس ڈیرے پر بھی اپنا پولیس والا جارحانہ پن دکھانا نہیں بھولتے تھے۔ لیکن دل کے بہت صاف اور ہمدرد طبیعت کے مالک تھے۔ جتنی تیزی سے غصہ

کرتے تھے اتنی ہی تیزی سے معذرت بھی کر لیتے ہیں۔انہوں نے کارل سروے میں ایک ریسٹورنٹ بھی بنایا تھا لیکن بدقسمتی سے وہ چلا نہیں تو انہوں نے اسے بیچ دیا اور دوبارہ ٹیکسی کے بزنس میں آ گئے۔وہ کارل سروہے کے چند مشہور ترین پاکستانیوں میں سے ایک ہیں اور تقریباً ساری ہی پاکستانی کمیونٹی انہیں جانتی ہے۔

''ہاں یار! شپ تو اب چلا گیا ہے؟ تم ادھر ہمارے پاس ہی رک جاؤ، کھانا کھاؤ اور آرام کرو۔کل کو چلے جانا!'' وہ مجھے ڈیرے کی طرف لے جانے لگے۔

میں ابھی تک اندر سے ڈرا ہوا تھا۔کردے پاکستانیوں کو اغوا کر کے ان کے گھر والوں سے پیسے وصول کرتے تھے۔ یہ بیماری ابھی تک پاکستانیوں کو نہیں لگی تھی۔ نئے آنے والے لڑکوں کو اغوا کر کے ان سے پیسے چھیننا اور ان کو مار مار کر ان کے گھروں سے پیسا منگوانا یہ کام 2010 کے بعد پاکستانیوں میں بھی شروع ہو گیا تھا لیکن صرف دس بارہ کیس ہی ہوئے تھے۔ان میں بھی زیادہ تر میں ناکام ہی ہوئے تھے۔

یہاں یورپ میں زیادہ تر پنجاب کے میدانی علاقوں سے لڑکے آتے ہیں۔ یہ لڑکے بہت محنتی اور خلوص نیت سے کام کرنے والے تو ہوتے ہیں لیکن مجرمانہ ذہنیت کے نہیں ہوتے۔اس لئے اغوا برائے تاوان کے دھندے میں ناکام ہو کر انہوں نے سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔ابھی پورے یورپ میں کچھ افغانی تو اغوا برائے تاوان کرتے ہیں لیکن پاکستانی یہ کام نہیں کر سکتے۔آپ کسی بھی پاکستانی یا انڈین پنجابی پر آنکھیں بند کر کے اعتبار کر سکتے ہیں۔

''بھائی! کوئی بات نہیں۔آپ مجھے ایک بار شہر کا راستہ بتا دیتے تو میں چلا جاتا،آپ کو تکلیف ہوگی۔'' میں نے نارمل سا بہانہ گھڑتے ہوئے کہا۔

''نہیں یار! پہلے کھانا کھالو اس کے بعد جو تمہارا دل کرے۔کھانا کھائے بغیر تو ہم آپ کو نہیں جانے دیں گے۔ میں بھی سرائیکی ہوں اور تمہارے بہاول پور کا ہی ہوں۔ اتنی آسانی سے تمہیں کیسے بغیر کھانا کھائے جانے دوں گا۔'' اس نے میرا بازو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا۔میں اب ان لوگوں کے درمیان پھنس گیا تھا اور اعتبار کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔اس لئے خاموشی سے ان لوگوں کے ساتھ چل دیا۔

''یار! نام تو تم نے اپنا بتایا ہی نہیں ہے؟ کیا نام ہے تمہارا؟'' فیاض چیمے نے میرے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔اس نے ابھی تک میرا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔

''جی میرا نام راضی ہے۔ہم بھی پیچھے سے سیالکوٹ کے رہنے والے ہیں۔'' میں نے نارمل انداز میں کہا تو وہ چلتے چلتے رک گیا۔

''نہیں یار؟ سیالکوٹ کے ہو؟ کس گاؤں کے ہو؟'' اب اس نے دلچسپی لینی شروع کر دی تھی۔

''جی میں ڈسکے کا رہنے والا ہوں۔'' وہ اچانک رک گیا اور اس نے مجھے گلے سے لگا لیا۔

''راضی صاحب! سرائیکی بھی ہو، بہاولپوری بھی اور ابھی ڈسکے کے بھی نکل آئے ہو یار! تم تو پکے میرے گھرائیں نکل آئے ہو۔'' پردیس میں اپنے علاقے یا گاؤں کے رہنے والوں کو گھرائیں کہتے ہیں۔

''تم میرے گھرائیں ہو اور اب کوئی بھی مسئلہ ہو یا ضرورت ہو تو مجھے بتاؤ اور مجھے اپنا بڑا بھائی سمجھ کر کہنا۔'' وہ میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

ہم سب اکٹھے ڈیرے پر آ گئے۔مرغی کا گوشت بنا ہوا تھا۔سالن رات کا بنا ہوا تھا جبکہ روٹی تازی بنائی ہوئی تھی۔یونان میں سالن ہمیشہ رات کو ہی بنتا ہے اور وہی سالن پھر دن کو بھی چلتا ہے۔شہروں میں کھانا صرف ایک ٹائم رات کو ہی کھایا جاتا ہے۔۔۔چوبیس گھنٹے میں صرف ایک بار۔صبح چھ بجے کام کے لئے نکلتے ہیں تو اس ٹائم کھایا نہیں جاتا اور دوپہر کو خرید کر نہیں کھا سکتے۔شروع شروع میں کچھ عرصہ پرابلم ہوتی ہے تو کوئی بریڈ وغیرہ لے کر کھا لیتے ہیں اور آہستہ آہستہ اس کی عادت ہو جاتی ہے۔جسم کو چوبیس گھنٹے میں ایک بار کھانا کھانے کی عادت بن جاتی ہے تو بریڈ وغیرہ پر پیسے لگانا بھی ختم ہو جاتے ہیں۔البتہ جولڑ کے کھیتوں میں کام کرتے ہیں وہ دو ٹائم کا کھانا کھاتے ہیں۔

یہاں کوس جزیرے پر کام کرنے والے یہ لڑکے بھی دو ٹائم کا کھانا کھاتے تھے۔سالن رات کو ہی زیادہ بناتے تھے اور روٹی دن کو تازی بن جاتی۔یہ لوگ ایک لڑکے کو آدھا گھنٹہ پہلے بھیج دیتے تھے جو روٹی بنا لیتا اور پھر سارے 12 بجے کے قریب اکٹھے آ کر کھانا کھا لیتے تھے۔رات کو یہ لوگ کھانا باری سے بناتے تھے۔میں ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے لگا۔رات کو سالن چیمہ صاحب نے بنایا تھا اور بہت مزے کا مرغی

کا گوشت بنا ہوا تھا۔

''پیسے وغیرہ تو ہیں نا تمہارے پاس کرایہ کے لئے؟ اگر نہیں ہیں تو میں دے دیتا ہوں! کوئی بات نہیں ہے تم میرے چھوٹے بھائی ہو۔'' فیاض چیمے نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ اس نے کھانا کھا لیا تھا۔

''نہیں پا جی! میرے پاس پیسے ہیں۔ ترکی کرنسی ہے، بس آپ اسے چینج کروا دیں۔'' میں نے اسے بتایا تو وہ مسکرانے لگا۔

''اوئے بلّے! تم ایسا کرو اس کے ساتھ شہر چلے جاؤ اور کرنسی چینج کروا دو اور ہاں! کل کی شپ کی ٹکٹ بھی لے کر دے دینا۔'' انہوں نے سرفراز کو آواز دیتے ہوئے کہا تو سرفراز جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''جی بھائی! میں ابھی چلا جاتا ہوں راضی کے ساتھ، میں ذرا کپڑے بدل لوں پھر چلتے ہیں۔'' وہ اندر کی طرف جانے لگا اور پھر رک گیا۔

''راضی بھائی! آپ بھی کپڑے بدل لو، یہ گندے ہو گئے ہیں۔ آپ کو میرے کپڑے پورے آ جائیں گے، ہم دونوں کا ناپ ایک جیسا ہے۔'' سرفراز نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں! کوئی بات نہیں ہے، میں ایسے ٹھیک ہوں۔'' میں نے اٹکتے ہوئے کہا۔

''او نہیں یار! تمہارے کپڑے واقعی بہت خراب ہو گئے ہیں۔ اتار دو اور دوسرے پہن لو۔ پرانے کپڑے دیکھ کر کوئی پولیس والا چیک نہ کر لے۔'' اس بار فیاض چیمے نے درمیان میں بولتے ہوئے کہا تو میں خاموشی سے سرفراز کے ساتھ اندر چلا گیا۔

اس نے مجھے ایک پینٹ اور شرٹ پہننے کے لئے دی جو کہ مجھے بالکل فٹ آ گئی۔ میں سرفراز سے تین سال بڑا تھا لیکن ہمارا ناپ ایک جیسا ہی تھا۔ میں نے کپڑے بدلنے سے پہلے نہا بھی لیا تھا۔ ہم دونوں کپڑے بدل کر باہر آئے تو فیاض باہر ہی کھڑا تھا۔ باقی لڑکے کام پر واپس چلے گئے تھے۔ واہ کیا بات ہے میرے بھائی کی! پورے شہزادے لگ رہے ہو۔ اچھا! یہ لو ریڈ کارڈ، نام وغیرہ دیکھ لو! اگر کوئی پولیس والا روکے بھی تو اسے دکھا دینا۔''

یونان میں مہاجرین کو چھ مہینے کا اسٹے ملتا تھا۔ یہ لال رنگ کا کارڈ ہوتا تھا جسے ہم پاکستانی یا انڈین ریڈ کارڈ RED CARD کہتے تھے۔ یونانی زبان میں اسے کوکینو کارتا (KOKINO KARTA) یا کھرتی (KHARTEE) کہتے ہیں۔ ریڈ کارڈ پر چھوٹی تصویر لگی ہوتی ہے اور فوٹوگرافر تصویر کو بہت زیادہ صاف اور خوبصورت بنا کر نکالتے تھے۔ جس کی وجہ سے اصل لڑکے سے تھوڑی مختلف ہو جاتی تھی اور اسی وجہ سے پولیس والے تصویر شناخت نہیں کر سکتے تھے۔ پولیس والے صرف ریڈ کارڈ دیکھتے تھے اور اس کے اوپر لگے سیریل نمبر کو وائرلیس سے تھانے لکھواتے تھے۔ جہاں سے اس نمبر کا ریکارڈ کمپیوٹر سے چیک کیا جاتا تھا اور تصدیق ہونے پر پولیس والے جانے دیتے تھے۔ تصویر پر کوئی بھی دھیان نہیں دیتا تھا۔ ویسے بھی ہر لڑکے کے پاس ریڈ کارڈ ہوتا تھا۔

یونان نے جب 2010ء بعد پاکستانی اور انڈین نیشنیلٹی ہولڈرز کو اسٹے دینا بند کر دیا تھا تب لڑکے ایک دوسرے کا ریڈ کارڈ استعمال کر لیتے تھے۔ یہ ایک کارڈ کی تین تین کاپیاں کروا کر تین تین لڑکے استعمال کرتے تھے۔ پولیس والے اگر فوٹو کاپی پر پکڑ کر تھانے لے جاتے تو ایک لڑکا اوریجنل ریڈ کارڈ دکھا کر تھانے سے لڑکا چھڑا کر لے آتا تھا۔ فنگر پرنٹ سے تصدیق کرنے کا کام 2015ء کے بعد شروع ہوا تھا اور ابھی صرف فنگر پرنٹ سے ہی تصدیق ہوتی ہے۔ پولیس والے کسی کو پکڑتے ہیں تو فنگر پرنٹ لیتے ہیں اور اگر تصدیق ہو جائے تو ٹھیک ورنہ جیل ہو جاتی ہے۔

قارئین سوچ رہے ہوں گے کہ میں ہر بات میں پاکستان اور انڈیا کا اکٹھا کیوں ذکر کرتا ہوں تو جناب ادھر یورپ میں ہمیں اکٹھا ہی ٹریٹ کیا جاتا ہے۔ نیا اسٹے لینا ہو یا رینیو کروانا ہو تو ہمارا کام ایک ہی کاؤنٹر پر ہوتا ہے۔ ہمارا ترجمان بھی ایک ہی ہوتا ہے اور ہمیں رہائش بھی اکٹھی ہی دی جاتی ہے۔ اب 2015ء سے ہمیں افغانیوں کے ساتھ تبدیل کر دیا گیا ہے۔ یہ کام سب سے پہلے جرمنی سے شروع ہوا تھا اور اب پورے یورپ میں رائج ہے۔ انڈیا کو بنگلہ دیش کے ساتھ اور ہمیں افغانیوں کے ساتھ رکھا جاتا ہے۔ چونکہ افغانیوں کو اردو زبان بھی آتی ہے اس لئے وہ ہمارے ترجمان بھی بن گئے ہیں اور یہیں سے پرابلم شروع ہو گئی ہے۔

ہم پنجابی اپنی جنگ انڈیا اور پاکستان میں چھوڑ کر آتے ہیں اور یہاں پر بالکل دوستوں اور بھائیوں کی طرح رہتے ہیں۔ جبکہ افغانی اس کے برعکس ہیں یہ لوگ اپنی نفرت یہاں پر بھی لے کر آتے ہیں اور نفرت

کا اظہار جب دونوں طرف سے ہوتا ہے تو بات ہمیشہ لڑائی پر ہی ختم ہوتی ہے۔ میں افغانیوں کے خلاف نہیں ہوں وہ میرے مسلمان بھائی ہیں اور مسلمان چاہے وہ برما میں رہتا ہو، افریقہ یا ایمازون کے جنگلوں میں رہتا ہو، اس کے درد پر مجھے بھی تکلیف ہوتی ہے اور یہی ہمارے اسلام کا حصہ ہے۔

ان افغانیوں میں تعلیم اور ایک اچھے حکمران کی کمی ہے۔ جس دن یہ کمی پوری ہوگئی اس دن افغانی ہم سے زیادہ ترقی یافتہ اور مہذب ہوجائیں گے۔ لیکن اس میں ٹائم لگے گا۔ قومیں دنوں میں نہیں بنتیں بلکہ اس میں سال لگ جاتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ایک دن ہمارے یہ افغانی بھائی بھی ترقی یافتہ قوم بن جائیں گے اور ہم پاکستانی ان کے ملک میں کام کرنے کے لئے جایا کریں گے۔

میں نے ریڈ کارڈ فیاض کے ہاتھ سے لے لیا اور سرفراز کے ساتھ شہر کی طرف چل پڑا۔ میں نے ایک منی چینجر کی دکان سے ترکی کرنسی کو یورو میں تبدیل کروایا اور پھر بندرگاہ کی طرف چل پڑا۔ شپ واقعی صبح 8 بجے کا نکل چکا تھا اور ابھی دوسرا شپ کل 8 بجے ہی نکلنا تھا۔ یہاں سے روزانہ ایک ہی شپ ایتھنز کے لئے دن میں ایک بار ہی نکلتا تھا۔ میں نے بندرگاہ سے ایتھنز کے لئے کل کی ٹکٹ لی اور سرفراز کے ساتھ واپس آگیا۔ راستے میں سرفراز نے اپنے ریڈ کارڈ کی ایک فوٹو کاپی بھی کروالی اور گھر واپس پہنچتے ہی اس نے مجھے وہ کاپی دے دی۔

''بھائی! یہ کاپی رکھ لو، ایتھنز تک تم اسے اپنے پاس رکھ لو۔ راستے میں کوئی بھی پولیس والا چیک کرے گا تو دکھا دینا اور ایتھنز پہنچ کر اسے پھاڑ دینا۔'' میں نے اس سے فوٹو کاپی لے کر جیب میں ڈال لی۔

ہمیں شہر جانے اور آنے میں دو گھنٹے لگ گئے تھے اور ان دو گھنٹوں میں سرفراز ہی بولتا رہا تھا۔ بچپن سے لے کر نوجوانی تک کے تمام قصے اور محبتیں وہ سب کچھ ہی بتاتا رہا اور میں اسے سن کر حیران ہوتا رہا۔ ایک یا دو لڑکیوں سے تو محبت ہوتی ہے لیکن اکٹھی چھ لڑکیوں سے محبت۔۔۔ پتہ نہیں وہ کونسی دنیا سے آیا تھا۔ رنگ گورا اور نین نقش بڑے خوبصورت تھے اور باتیں بتانے میں بھی بڑا تیز تھا۔ اسی سے متاثر ہوکر لڑکیاں دوستی کرلیتی تھیں اور وہ اسے محبت کا نام دے دیتا تھا۔ میرا یہاں مقصد اس کی محبتیں لکھنا نہیں ہے۔ اس کی باتوں سے مجھے حوصلہ ہوگیا تھا اور میں اب پورا اعتماد کرنے لگا تھا۔ یہ واقعی شریف لوگ تھے اور میں صحیح جگہ پر پہنچ گیا تھا۔ اس دور میں صرف یونان تک پہنچنا ہی مشکل بلکہ ناممکن تھا۔ یورپ میں پہنچنے کے بعد سب کچھ ٹھیک

ہوجاتا تھا۔

یورپ کی فضا میں انسانی ہمدردی اور مدد کرنے کا جذبہ رچا ہوا ہے۔ یہ صرف میری ہی کہانی نہیں ہے۔ فیس بک اور یوٹیوب پر پڑھنے والا ان ویڈیوز پر مت جائے جو یورپ میں پہنچنے کے بعد اپنے خراب حالات اور مشکلات کا رونا روتے نظر آتے ہیں۔ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ لوگ یورپ میں رہنے کی مشکلات اور نفرت کا اظہار تو کرتے ہیں لیکن اسے چھوڑنے پر بھی تیار نہیں ہیں۔ بلکہ اپنے بھائیوں اور رشتے داروں کو بلا رہے ہوتے ہیں۔اس دنیا میں صرف نفرت بکتی ہے۔ہم لوگ نفرت پڑھنا اور دیکھنا پسند کرتے ہیں۔

پاکستان میں جو مولوی حضرات یا سیاست دان اپنے مخالفین کے خلاف کھل کر بولتا ہے لوگ اسے ہی بڑا مولوی اور بڑا لیڈر مانتے ہیں۔ یورپ میں بھی اب یہ رواج زور پکڑ رہا ہے۔ یہاں پر بھی جو سیاست دان کھل کر مہاجرین کے خلاف بول رہا ہے۔''ان کو ملک سے نکال دو، ان کو جیلوں میں ڈال دو۔'' کا نعرہ لگا رہا ہے اور کھل کر نفرت کا اظہار کر رہا ہے وہی ووٹ لے کر کامیاب ہو رہا ہے۔ دنیا سے محبت آہستہ آہستہ ختم ہو رہی ہے اور میں اسی محبت کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔محبت کرنا بہت مشکل ہے اور نفرت بہت آسان۔

میں ابھی انڈیا کے خلاف دو تین کالم لکھ دوں تو دنوں میں ہی میرے کالموں کے چھوٹے چھوٹے پیراگراف بن کر فیس بک پر گردش کر رہے ہوں گے۔آپ مشرف کو ہی دیکھ لیں، جس کی دس سالہ حکومت نے پورے ملک کو دہشت گردی کی جنگ میں جھونک کر رکھ دیا۔اس نے صرف دو تین انٹرویو انڈیا کے خلاف دیے ہیں اور آج پورے ملک میں وہ ہیرو بنا ہوا ہے۔ میرے اپنے دوست مجھے وہ ویڈیوز دکھاتے ہیں کہ دیکھو کیسا دلیر آدمی ہے جو انڈیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انہیں للکار رہا ہے۔ میں ان کو بدلے میں انڈیا کے لیڈروں کی ویڈیوز دکھاتا ہوں جو پاکستان کو گالیاں دے رہے ہوتے ہیں۔

ارے بھائی! ٹی وی کے اوپر آ کر گالیاں اور بڑھکیں مارنے سے کونسی بہادری ثابت ہو جاتی ہے۔آپ ان کو گالیاں دیتے ہو تو وہ بھی آپ کو گالیاں دیتے ہیں اور ہم ایک ارب ستر کروڑ بے وقوف عوام دھڑا دھڑ لائیک اور شیئر کر رہے ہوتے ہے۔ٹی وی پر جو اینکر سب سے زیادہ سیاست دانوں کے خلاف بولتا ہے وہی سب سے زیادہ کامیاب ہے۔ارے بھائی! نفرت مت دیکھو۔محبت دیکھنے اور کرنے کی کوشش کرو۔خدا کی

قسم یہ دنیا ہی جنت بن جائے گی۔

میں دل سے پاکستانی ہوں اور اپنے ملک سے محبت کرتا ہوں لیکن کیا اس محبت کو ثابت کرنے کے لئے مجھے انڈیا سے نفرت کرنا ضروری ہے؟ ہرگز نہیں! مجھے پاکستان سے بھی محبت ہے اور انڈیا سے بھی محبت ہے۔ اگر بات کشمیر کے مسئلے کی ہے تو ایک بار محبت کر کے تو دیکھو اور صرف کشمیر ہی کیوں مانگ رہے ہو؟ پورا انڈیا ہی ہمارا ہے۔ محبت سے اور چھوٹا بھائی بن کر مانگو گے تو کشمیر بھی ملے گا اور محبت بھی۔ جب نبی پاک ﷺ نے اپنے اوپر کوڑا پھینکنے والی، جنگ احد میں سگے چچا کا کلیجہ نکال کر کھانے والی سے نفرت نہیں کی تو ہم کیوں نفرت کر رہے ہیں؟ میں بہت چھوٹا سا لکھاری ہوں لیکن مشہور ہونے کے لئے کبھی نفرت نہیں لکھوں گا بلکہ ہمیشہ محبت ہی لکھوں گا۔

''راضی صاحب! اب آپ آرام کرو۔ میں سی ڈی لگا دیتا ہوں، کوئی فلم وغیرہ دیکھنی ہو تو دیکھ لینا اور اگر سونا چاہو تو سو جاؤ۔ ہم اب پانچ بجے کے قریب آئیں گے۔ میں بھی کپڑے بدل کر کام پر جا رہا ہوں۔'' اس نے ٹی وی آن کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں یار! اگر کوئی کام والے کپڑے ہیں تو دے دو، میں بھی آپ کے ساتھ جا کر کام کرتا ہوں۔ رات کو سونا ہی ہے اور پھر کل شپ میں بھی آرام ہی کرنا ہے۔ ویسے بھی مجھے بھی تو کام کا تھوڑا اندازہ ہو جائے گا۔'' میں نے ٹی وی کو بند کرتے ہوئے کہا تو وہ مسکرانے لگا۔

اس نے مجھے اپنے کام والے کپڑے دیئے اور ہم دونوں کپڑے تبدیل کر کے کھیت کی طرف چل پڑے۔ فیاض نے مجھے کام والے کپڑوں میں دیکھا تو وہ سرفراز پر غصہ ہونے لگا لیکن میں نے اسے بتایا کہ میں اپنی مرضی سے آیا ہوں تو وہ مطمئن ہو گیا۔ پھر بھی وہ سرفراز کو غصے سے دیکھ رہا تھا۔ کھیتوں میں ان کا یونانی مالک بھی کھڑا ہوا تھا۔ میں نے اس کو سلام کیا اور ایک کریٹ لے کر پالک نکالنے لگا۔ یونانی مالک میرے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ مجھے کھیت سے پالک نکالنے کا طریقہ بتانے لگا تو میں نے اسے منع کر دیا۔

میں ایران میں پالک نکالنے کا کام کر چکا تھا۔ میں چاقو کی مدد سے پالک کو مٹی کے اندر سے کاٹتا، الٹا چاقو مار کر مٹی جھاڑتا اور پھر بیلہ لیتا دیکھ کر علیحدہ کرتا اور صاف پالک کریٹ میں لگا دیتا۔ میں ایک منٹ تک نارمل سپیڈ پالک توڑتا رہا۔ اس کے بعد جب سپیڈ پکڑی تو سارے ہی میری طرف دیکھنے لگے۔ لڑکے پندرہ

منٹ میں ایک کریٹ بھرتے تھے۔ وہ سیالکوٹ اور گجرات کی فیکٹریوں میں کام کرنے والے لڑکے تھے یا سکول اور کالج سے ڈائریکٹ ادھر آ گئے تھے۔ جبکہ میرا سارا بچپن اور جوانی اسی زمیندارے میں گزری تھی۔ میں پیدائشی زمیندار تھا۔

''بیٹا! سبزیوں اور جانوروں سے محبت کرنا سیکھ لو، زندگی میں کبھی بھوکے نہیں مرو گے۔''

میں اپنے والد کے اس فقرے کو فالو کرنے والا لڑکا تھا اور یہ محبت اس وقت یونان کے اس کھیت میں نظر آ رہی تھی۔ میں نے پانچ منٹ میں کریٹ بھر دیا اور دوسرا کریٹ پکڑ لیا۔ میں پالک کے ایک دو پودوں کو پکڑنے کی بجائے دس دس پودوں کو اٹھا کر پکڑ کر صاف کرتا اور کریٹ میں رکھ رہا تھا۔ یونانی مالک میری سپیڈ دیکھ کر حیران رہ گیا اور اس نے باقی لڑکوں کو بھی مجھے دیکھنے کا کہا۔ میں نے مسلسل تین کریٹ بھر کر چوتھے کریٹ کو پکڑا تو مالک نے مجھے کندھے سے پکڑ کر اوپر اٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں کھڑا ہو گیا تو وہ فیاض سے یونانی زبان میں بات کرنے لگا۔

''راضی صاحب! یہ آپ کو کام پر رکھنے کا کہہ رہا ہے۔ اگر آپ کام کرنا چاہتے ہو تو ہمارے ساتھ کام کر سکتے ہو۔ 30 یورو دن کی مزدوری ہے اور ہفتے میں 5 دن کام ہوتا ہے۔ مہینے کا چھ سو یورو بنتا ہے۔ کھانا اور رہائش مالک کی ہے۔ یہاں 50 روپے بھی خرچہ نہیں آتا۔ ہم لوگ مہینے کا 550 یورو بچا کر گھر بھیجتے ہیں۔ دیکھ لو! اگر کام کرنا چاہتے ہو تو ہمیں خوشی ہو گی۔'' فیاض نے پرخلوص لہجے میں کہا۔

''نہیں پا جی! میرے پاس ریڈ کارڈ (اسٹے) نہیں ہے۔ مجھے ایتھنز جانا ہے تا کہ وہاں سے اسٹے حاصل کر سکوں۔ اس کے بعد دیکھوں گا۔'' میں نے وہی جواب دیا تو فیاض ایک بار پھر مالک کو یونانی زبان میں سمجھانے لگا۔ وہ دونوں دو منٹ تک بات کرتے رہے اور اس کے بعد فیاض دوبارہ مجھ سے مخاطب ہو گیا۔

''مالک بولتا ہے کہ آپ ایتھنز چلے جاؤ اور وہاں سے اسٹے لے کر واپس ادھر آ کر کام پہ لگ جاؤ۔ بھائی یہ آپ کا کام دیکھ کر بہت متاثر ہوا ہے۔ بہت اچھا مالک ہے۔ اگر آپ کا دل ہو تو ہمیں خوشی ہو گی۔'' فیاض نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''بھائی جی! میں وعدہ نہیں کرتا، ایک بار ایتھنز جاتا ہوں اور پھر آپ کو بتا دوں گا۔ ایتھنز میں پتہ نہیں

کیسے حالات ہوں۔اس لئے میں وعدہ نہیں کرنا چاہتا۔'' اس نے دوبارہ اپنے مالک کو بتایا تو اس کے مالک نے سر ہلا دیا۔

''راضی بھائی! آپ جب بھی اس کے پاس کام کے لئے آنا چاہو، آ سکتے ہو۔ جب بھی آپ کو کام کی ضرورت ہو تو بلا جھجک اس کے پاس آ جانا یہ آپ کو کام پر رکھ لے گا۔'' اس نے مجھے کہا تو میں واپس پالک کاٹنے لگا۔

شام کو پانچ بجے چھٹی ہوئی تو مالک نے پچاس یورو کا نوٹ نکال کر میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ میں نے اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا۔ میں اس سے رقم نہیں لینا چاہتا تھا۔

''راضی صاحب! ادھر یونان میں رہتے ہوئے ایک بات اچھی طرح ذہن نشین کر لو! کبھی بھی پیسے اور کپڑے کو انکار نہیں کرنا۔ یونانی لوگ آپ کو پیسے بھی دیں گے اور کپڑے پسند ہوں تو پہن لو ورنہ بعد میں بے شک پھینک دو، لیکن کبھی بھی انکار نہیں کرنا۔ کیونکہ یہ لوگ برا مان جاتے ہیں۔'' میں نے فیض کی بات کو پلے سے باندھا اور خاموشی سے پچاس یورو کا نوٹ لے کر جیب میں ڈال لیا۔

یہ میری یورپ میں پہلی کمائی تھی۔لڑکے کام سے واپس آئے تو جس کی باری کھانا بنانے کی تھی وہ نہا کر سالن بنانے لگا اور دوسرے لڑکے سی ڈی پر فلم لگا کر دیکھنے لگے۔ میں بھی دوسرے لڑکوں کے ساتھ بیٹھ کر فلم دیکھنے لگا۔

''راضی! ایتھنز میں کس کے پاس جا رہے ہو؟ آپ کا کوئی بھائی یا رشتہ دار وغیرہ رہتا ہے ادھر ایتھنز میں؟'' فیاض نے بسکٹ کا پیکٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''نہیں پا جی! ایتھنز میں تو کوئی بھی نہیں ہے، کوئی نہ کوئی آسرا مل ہی جائے گا۔'' میں نے بسکٹ لیتے ہوئے کہا۔

''تو تمہارا کوئی بھی نہیں ہے ادھر ایتھنز میں؟'' اس نے فکرمندی سے کہا تو میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''سرفراز! وہ موبائل مجھے پکڑانا میں خلیل سے بات کرتا ہوں۔ وہ اسے اپنے ساتھ رکھ لے گا اور اسٹے وغیرہ بھی بنوا کر دے دے گا۔'' اس نے سرفراز سے کہا تو سرفراز نے جلدی سے آگے بڑھ کر انہیں موبائل

پکڑا دیا۔

یہ نوکیا 1110 تھا۔ اس زمانے میں ابھی سمارٹ فون نہیں آئے تھے۔ نوکیا (Nokia) اور سونی ایرکسن کے آڈیو اور ویڈیو گانے چلانے والے کچھ موبائل مارکیٹ میں آ گئے تھے جو 100 ایم بی کی میموری والے ہوتے تھے اور اس میں کافی گانے ڈاؤن لوڈ ہو جاتے تھے۔ آج کل تو 100 جی بی سے بھی اوپر کی میموری والے سمارٹ فون بھی مارکیٹ میں آ گئے ہیں۔ گانے امونیا (ایتھنز کی مرکزی مارکیٹ) کی کسی پاکستانی ویڈیو سنٹر کی دکان سے ڈاؤن لوڈ ہوتے تھے اور پھر بلیوٹوتھ (Blue Touth) سے ایک دوسرے کو شیئر کیئے جاتے تھے۔

سرفراز نے اسے موبائل پکڑایا تو وہ موبائل سے کسی خلیل نامی لڑکے سے بات کرنے لگا۔ وہ کوئی دس منٹ تک موبائل سے بات کرتا رہا۔ کوس سے ایتھنز دس گھنٹے کا سفر تھا۔ میں آٹھ بجے ادھر سے نکلتا تو شام چھ بجے ادھر پہنچ جاتا۔ میری ٹکٹ کے اوپر ایتھنز کی پیریا (PIRIA) بندرگاہ پہنچنے کا ٹائم اور بندرگاہ کا نمبر لکھا ہوا تھا۔ پیریا کی بندرگاہ دنیا کی دوسری بڑی بندرگاہ ہے۔ یہاں پر سینکڑوں کی تعداد میں روزانہ شپ آتے اور جاتے ہیں۔ یہاں سے یورپ اور پوری دنیا کے لئے مسافر بردار اور کارگو شپ نکلتے ہیں۔ انہوں نے خلیل کو میری ٹکٹ پر موجود ٹائم اور نمبر لکھوایا، میرا انتظار کرنے کو کہا اور فون بند کر دیا۔

''لو جی راضی صاحب! آپ کا کام ہو گیا ہے۔ کل بندرگاہ پر آپ کو خلیل لینے کے لئے آ جائے گا۔ بہت اچھا لڑکا ہے۔ قدومی (بلڈنگ) کا کام کرتا ہے۔ پنجابی میں اسے مستریوں کا کام کہتے ہیں۔ ٹھیک ہے نا یار! تم اس کے ساتھ چلے جانا، وہ تمہیں اسٹے بنوا کر دے دے گا۔ اور اگر اُدھر رہنا چاہو تو تب بھی کوئی بات نہیں وہ کوئی نہ کوئی بندوبست کر دے گا۔'' فیاض نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''جی پا جی! آپ کی بہت مہربانی۔'' میں نے انکساری سے کہا تو وہ مسکرانے لگے۔

''کوئی بات نہیں ہے یار! تم میرے علاقے کے ہو اور اتنا تو میرا حق بنتا ہے۔ ہاں تم نے ابھی تک اپنے گھر میں بات ہی نہیں کی ہے۔ مجھے نمبر بتاؤ میں تمہاری گھر میں بات کروا دیتا ہوں۔'' انہوں نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں پا جی! میرے گھر میں فون نہیں ہے۔'' میں نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں یار! یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ گاؤں میں کسی کا تو نمبر آپ کے پاس ہوگا؟ فون کر کے گھر والوں کے لئے کوئی پیغام ہی دے دو!'' انہوں نے زور دیتے ہوئے کہا۔

''نہیں پا جی! میرے پاس ابھی کوئی بھی نمبر نہیں ہے۔'' میں نے دوبارہ انکار کیا اور ٹی وی دیکھنے لگا۔ اس کے بعد ہم نے رات کو کھانا کھا کر دوبارہ کچھ دیر فلم دیکھی اور پھر سو گئے۔

صبح سات بجے کے قریب میں سرفراز کے ساتھ بندرگاہ آ گیا۔ یہاں ایک بہت بڑا شپ لگا ہوا تھا۔ بلیوسٹار فیریز(BLUE STAR FERRIES) یہ پانچ مرلہ بحری جہاز تھا۔ جس کے نچلے حصے میں گیراج تھا۔ جس میں بڑی بڑی لوڈر گاڑیاں بسیں اور کاریں کھڑی تھیں۔ میں نے سرفراز سے ہاتھ ملایا، اس کا شکریہ کیا اور شپ میں جا کر بیٹھ گیا۔ سرفراز اداس سا چہرہ لے کر واپس ڈیرے چلا گیا اور میں سب سے اوپر والی منزل پر جا کر کھڑکی کی طرف والی سیٹ پر جا کر بیٹھ گیا۔ میں نے سیٹ کی پشت سے سر ٹکایا اور آنکھیں بند کر لیں۔ ٹھیک آٹھ بجے شپ نے دو چھوٹے چھوٹے ہارن دیے اور آہستہ آہستہ بندرگاہ سے ان بورڈ(Unbord) ہونے لگا۔

یونان سمیت پورے یورپ میں گاڑیوں کا ہارن بجانا انتہائی سختی سے منع ہے۔ یہاں پورے یورپ میں جتنا مرضی رش اور ٹریفک جام ہو کبھی بھی کوئی ہارن نہیں بجاتا اور اگر کوئی غلطی سے ہارن بجا دے تو پھر پوری لائین گاڑیوں کی کھڑکیوں سے سر باہر نکال نکال کر دیکھنے لگتی ہے اور کچھ منچلے نوجوان تو باقاعدہ گالیاں تک دینے لگتے ہیں۔ جبکہ ہمارے ملکوں میں تو ہارن بجانا بھی ایک فیشن بن گیا ہے۔ یہاں پر تو گورنمنٹ کی سرکاری گاڑیاں تک ہارن بجانا فرض سمجھتی ہیں۔ شپ چونکہ بہت بڑا ہوتا ہے اس لئے شپ کا کپتان ہارن بجاتا ہے اور یہ ہارن مسافروں کے لئے نہیں بلکہ شپ کے کریو کے لیئے ہوتا ہے جو شپ کی روانگی کے وقت مختلف کام سرانجام دیتے ہیں۔

شپ ٹھیک آٹھ بجے کوس جزیرے سے نکلا اور آہستہ آہستہ ایتھنز کی طرف بڑھنے لگا۔ شپ کے اندر ہی کینٹین اور ہوٹل بھی تھا جہاں سے چائینز اور یورپین کھانے ملتے تھے۔ میں نے صبح آتے ہوئے ناشتہ کر لیا تھا۔ فیاض بھائی نے سپیشل آلو والے پراٹھے بنائے تھے جو میں نے صبح صبح اٹھ کر کھائے تھے۔ وہ تو مجھے ساتھ

لے جانے کے لئے بھی دے رہے تھے لیکن میں نے منع کر دیا۔ میں ان لوگوں کا زیادہ احسان نہیں لینا چاہتا تھا۔ شپ تین چار مختلف جزیروں پر رکتا ہوا شام کو چھ بجے ایتھنز کی بندرگاہ پیریا پہنچ گیا۔

یہاں اس شپ پر کوئی پانچ سو سے اوپر لوگ تھے۔ میں نے ان کے نکلنے کا انتظار کیا اور پھر آہستہ آہستہ باہر نکلنے لگا۔ میں شپ سے باہر آ کر دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ یہاں لوگ آ رہے تھے اور جا رہے تھے۔ میں ایک سائیڈ پر کھڑا ہو کر خلیل کا انتظار کرنے لگا۔ فیاض نے میرا حلیہ اور کپڑے خلیل کو بتا دیئے تھے۔ تقریباً پانچ منٹ بعد ہی ایک چھوٹے قد کا سمارٹ سا لڑکا میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا قد 5 فٹ 5 انچ تھا۔ نوجوان لڑکا تھا۔ اسے یونان آئے ہوئے تقریباً 6 مہینے کے قریب ہو گئے تھے۔ پانچ کلاسیں پڑھا ہوا تھا۔ اردو اٹک اٹک کر پڑھتا تھا اور انگلش کی اے بی سی (ABC) بھی نہیں آتی تھی۔

''اسلام علیکم! آپ کا نام راضی ہے؟ چیمہ صاحب نے بھیجا ہے؟'' اس لڑکے نے میرے پاس آ کر مجھے سلام کرتے ہوئے کہا۔

''وعلیکم السلام! جی بھائی، مجھے چیمہ صاحب نے ہی بھیجا ہے۔'' میں نے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے بھائی! آپ آ جائیں میرے ساتھ۔'' وہ مجھے لے کر ایک بس میں بیٹھ گیا۔

''بھائی میرے پاس ٹکٹ نہیں ہے۔'' میں نے اس سے مخاطب ہو کر کہا تو اس نے اپنی جیب سے ایک ٹکٹ نکالی اسے ٹکٹ مشین پر پنچ کیا اور میرے ہاتھ میں پکڑا دی۔

''یہ اپنے پاس رکھ لو!'' وہ دوبارہ میرے پاس سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔

بس پیریا سے نکلی اور چھوٹے چھوٹے سٹاپوں سے ہوتی ہوئی آدھے گھنٹے میں ہی ہمیں لے کر نیکیا آ گئی۔ ہم دونوں بس سے نیچے اترے اور وہ ایک فوٹو گرافر کی دکان میں داخل ہو گیا۔

''راضی بھائی! ادھر بیٹھ جاؤ، یہ آپ کی تصویر بنائے گا۔'' اس نے یونانی زبان میں دکان دار کو کچھ کہا اور مجھے کیمرے کے سامنے بیٹھنے کا کہنے لگا۔

میں خاموشی سے کیمرے کے آگے بیٹھ گیا تو فوٹو گرافر نے لائٹس آن کیں، کیمرے کا زوم ٹھیک کیا اور میری تصویر اتار دی۔ وہ پانچ منٹ تصویر کا کلر وغیرہ ٹھیک کرتا رہا۔ اس کے بعد پاسپورٹ سائز کی آٹھ تصویریں نکال کر دے دیں۔ خلیل نے اسے 5 یورو دیئے اور ہم تصویریں لے کر دکان سے باہر آ گئے۔

''خلیل بھائی! یہ آپ 5 یورو لیں۔'' میں نے جیب سے 5 یورو کا نوٹ نکال کر خلیل کو دینے لگا۔

''کتنے پیسے ہیں تمہارے پاس؟'' اس نے غصے سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی! میں کچھ سمجھا نہیں۔'' مجھے واقعی اس کی بات کی سمجھ نہیں آئی تھی۔

''یار! میں نے کوئی فارسی تھوڑی بولا ہے؟ پیسے پوچھا ہے ٹوٹل کتنے ہیں تمہارے پاس؟ پانچ بجے کام سے چھٹی کر کے گھر پہنچا تھا اور کپڑے بدل کر سیدھا پیریا چلا گیا تمہیں لینے کے لئے۔۔۔ یار! پانچ یورو تو نہیں بنتے ہیں میرے!'' میں ایک بار پھر اس کا منہ دیکھنے لگا۔ مجھے واقعی اس کی باتوں کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

''میرے بھائی! آپ نئے ہو، اتنا سفر کر کے پاکستان سے یونان پہنچے ہو تو کیوں ہم آتے ہی تم سے پیسے لینا شروع کر دیں؟ آپ ہمارے مہمان ہو۔۔۔ چار دن ہمارے ساتھ رہو، کھاؤ پیو اور جب کام پر لگ جاؤ گے تو حساب کتاب بھی کر لیں گے۔ ویسے بھی مہینہ ختم ہونے کو تو صرف ایک ہفتہ ہی رہ گیا ہے اور یہ ہفتہ میری طرف سے فری ہے، اگلے مہینے پھر دیکھ لیں گے۔ آپ ہمارے ساتھ رہنا چاہتے ہو یا کہیں اور جانا چاہتے ہو تو وہ آپ کی مرضی پر منحصر ہے لیکن ابھی جتنے بھی پیسے ہیں تمہارے ہیں، انہیں سنبھال کر رکھو اور ہمیں مہمان کی خدمت کرنے کا موقع دو۔'' وہ مجھے لے کر گھر آ گیا۔

یہ ایتھنز میں نیکیا (NIKIA) کا علاقہ تھا۔ ایتھنز میں نیا یونیا، پیراسیتری اور نیکیا پاکستانیوں کا گڑھ سمجھے جاتے ہیں۔ ان علاقوں کی ہر گلی میں آپ کو پاکستانیوں کا مکان نظر آئے گا۔ اس کے علاوہ ایتھنز کے قلب امونیا (AMONIA) میں آپ کو صرف پاکستانی دکانیں اور ریسٹورنٹ نظر آئیں گی۔ یہاں پر یونانی یا کسی اور ملک کی دکانیں نا ہونے کے برابر ہیں۔ یونانی پارلیمنٹ سینٹگما سے محض 5 کلومیٹر دور امونیا میں پہنچ کر آپ کو پاکستان کے کسی علاقے کا گمان ہوگا۔

میں خلیل کے ساتھ گھر میں داخل ہو گیا۔ یہاں پر پہلے سے 4 لڑکے رہ رہے تھے۔ میں نے ان سے

ہاتھ ملایا اور ان سے باتیں کرنے لگا۔ یہ سارے لڑکے ساہووالا (SAHOWALA)اور مان پور (MANPUR) سیالکوٹ شہر کے بالکل نزدیک دو بڑے بڑے گاؤں بلکہ چھوٹے شہر ہی ہیں۔ سیالکوٹ کا انٹرنیشنل ائیر پورٹ بھی انہی کے گاؤں کے نزدیک ہے۔ یہ گاؤں اب آہستہ آہستہ مین شہر کا حصہ بن رہے ہیں۔

''یار! اپنے گھر کا نمبر بتاؤ میں تمہارا فون کروا دوں۔'' خلیل نے میرے آگے کوکا کولہ کا گلاس رکھتے ہوئے کہا۔

''جی۔۔۔وہ۔۔۔بھائی! میرے پاس نمبر نہیں ہے گھر کا۔'' میں نے گلاس پکڑتے ہوئے کہا۔

''کیا؟ تمہارے پاس گھر کا یا گاؤں کا فون نمبر نہیں ہے؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ بھائی! جنگل سے تو نہیں اٹھ کر آئے ہو؟'' خلیل نے حیرانگی سے کہا۔

''بھائی! ہمارے گاؤں میں ابھی تک ٹیلی فون کی تار نہیں لگی ہے اور سگنل بھی نہیں آتے ہیں۔'' میں نے شرمندگی سے کہا۔

تقریباً سات آٹھ مہینے پہلے جب میں پاکستان سے چلا تھا اس وقت تک واقعی ہمارے گاؤں میں موبائل نہیں آیا تھا۔لوگ گاؤں سے دو کلومیٹر دور ''ٹیل والے'' جا کر فون کرتے تھے۔

''تو اب اپنے گھر اطلاع کیسے دو گے کہ تم خیریت سے یونان پہنچ گئے ہو؟ اور تمہارا ایجنٹ کونسا ہے؟ اس کو بھی تو پیسے دو گے نا؟ یا پھر ایجنٹ سے بھاگ کر آئے ہو اور ابھی گھر فون کر کے انہیں خیریت کی اطلاع نہیں دے رہو ہو؟'' خلیل دل کا بہت صاف گو لڑکا تھا۔جو بات بھی اس کے دل میں آتی تھی وہ بلا جھجک کہہ دیتا تھا۔

''نہیں بھائی! واقعی ہمارے گاؤں میں کوئی موبائل یا ٹیلی فون نہیں ہے۔'' میں نے بے چارگی سے کہا تو وہ مسکرانے لگا۔

''آپ اپنے گھر اطلاع کیسے دو گے؟ کوئی رشتے دار وغیرہ تو ہو گا نا! ان کا ہی نمبر دے دو! سیالکوٹ میں کس گاؤں کے ہو؟'' وہ میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

''بھائی! میں پاکستان خط لکھ دوں گا۔ ہفتے دس دن تک میری خیریت کی اطلاع گاؤں پہنچ جائے گی۔''
میں اسے سیالکوٹ میں اپنے نانا نانی کے گاؤں کی تفصیل بتانے لگا تو وہ تھوڑی دیر تک میری باتیں سنتا رہا اور اس کے بعد کھانا بنانے چلا گیا۔

شام تک 5 لڑکے مزید آ گئے۔ یہ دو کمروں کا مکان تھا جس کے ساتھ علیحدہ کچن اور ساتھ میں باتھ روم بنا ہوا تھا۔ یہاں پر ٹوٹل 8 لڑکے رہتے تھے۔ خلیل کے ساتھ مزید دو اور لڑکے قدومی (مستریوں) کا کام کرتے تھے۔ دو لڑکے سلائی کا کام کرتے تھے۔ خلیل بھی سلائی کا کام جانتا تھا لیکن اسے سلائی کا کام نہیں ملا تھا اس لئے وہ مستریوں کا کام کر رہا تھا۔ ایک لڑکا گاڑیاں دھونے ایک فیکٹری اور ایک ریسٹورنٹ میں کام کرتا تھا۔ خلیل کے ایک بھائی شکیل ریسٹورنٹ میں باورچی تھے۔ یہاں پر سارے لڑکے ساہیوالہ کے تھے۔ صرف خلیل اور شکیل یہ دونوں بھائی کوگے (KHAGGA) کے رہنے والے تھے۔

یہ گاؤں انڈین بارڈر سے صرف 6 کلومیٹر دور ہے۔ یہاں سے انڈین کشمیر کا صدر مقام جموں صرف 30 کلومیٹر دور ہے۔ ان دونوں بھائیوں کی کچھ ایکڑ زمین بالکل بارڈر کے اوپر ہے اور اس زمین کی مارکیٹ ویلیو بالکل زیرو ہے کیونکہ یہ انٹرنیشنل باؤنڈری ہے۔ مشرف دور تک یہ علاقہ بالکل پرامن تھا۔ لائین آف کنٹرول دریائے چناب کے بعد گجرات کے قریب سے شروع ہوتی اور چائنہ کے بارڈر تک جاتی ہے۔

اس لائین پر پچھلے 70 سال سے جنگ چل رہی ہے۔ چار پانچ سال امن رہتا ہے تو چار پانچ سال پھر سرحدی خلاف ورزی شروع ہوجاتی ہے اور مرتے دونوں طرف معصوم دیہاتی ہیں۔ کوئی لڑائی نہیں، کوئی بہادری نہیں، کوئی خفیہ معلومات نہیں، بس صبح صبح اٹھو دو تین بجے کے قریب مارٹر گنیں لوڈ کرو اور بارڈر کی طرف کر کے چلا دو۔ کوئی ضرورت نہیں ہے انٹیلی جنس کی معلومات اکٹھی کرنے کی۔۔۔ دوسرے دن صبح صبح ٹی وی سے پتہ چل جائے گا کہ آپ کی اس بہادری سے دشمن ملک کا کتنا نقصان ہوا ہے۔ مرتے دونوں طرف کے جانور اور غریب دیہاتی ہیں۔

پنجاب میں جانور بھی بیٹوں جیسے ہوتے ہیں اور اس درد کا اندازہ شاید دونوں طرف کے سیاست دانوں کو نہیں ہوتا ہے۔ مشرف دور تک سرحدی خلاف ورزی صرف لائین آف کنٹرول تک ہی تھی اور اس کے بعد

یہ انٹرنیشنل باؤنڈری سیالکوٹ تک چلی گئی تھی۔ اسی وجہ سے ان دونوں بھائیوں کی زمین کوڑیوں کے مول ہو گئی تھی۔ پاکستان اور انڈیا کی یہ نفرت دن بدن کم ہونے کی بجائے بڑھتی ہی جا رہی ہے اور اس دفعہ 2017ء میں جب حالات خراب ہوئے تو انڈیا نے دریائے راوی کے کنارے امرتسر کے گاؤں بھی خالی کر والئے تھے۔

''راضی! صبح 5 بجے تیار رہنا! میں تم کو لے کر اسٹے والے دفتر چلا جاؤں گا اور وہی چھوڑ کر آ جاؤں گا۔ کل دن کو تمہارہ اسٹے بن جائے گا تو پھر تمہارے کام کا بھی کوئی بندوبست ہو جائے گا۔'' خلیل نے میرے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

''راضی بھائی! آپ کے نانے کا گاؤں پیرو چک کے نزدیک ہے نا؟ میرے کچھ رشتے دار پیرو چک میں رہتے ہیں۔'' شفاقت نے میرے دوسری طرف بیٹھتے ہوئے کہا۔

شفاقت سلائی کا کام کرتا تھا۔ یہ 2008ء میں دسمبر کے مہینے میں یونان آیا تھا اور پیپر نہیں بنوا سکا تھا۔ یونان میں 2005ء میں امیگریشن کھلی تھی۔ جس کے تحت تمام لڑکے جن کے پاس ریڈ کارڈ اسٹے تھا ان کو دو دو سال کا ویزہ دے دیا گیا تھا۔ جو بعد میں رینیو ہوتا رہتا ہے۔ ریڈ کارڈ یا اسٹے کارڈ سے آپ یونان میں رہ سکتے ہو اور کام بھی کر سکتے ہو لیکن آپ کو پاکستان جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ آپ یونان چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتے۔ جبکہ ویزے پر آپ یونان اور پاکستان غرضیکہ کہیں بھی جا سکتے ہیں اور کام کر سکتے ہیں۔ ویسے ہی جیسے سعودی عرب یا دوبئی کا ورکنگ ویزہ ہوتا ہے۔ یونان نے امیگریشن (ویزے) 2005ء کو ہی دی تھی۔ اس کے بعد دوبارہ کبھی امیگریشن نہیں دی۔ ابھی 2017ء میں امیگریشن کھولی ہے لیکن میں یونان چھوڑ کر جرمنی آ چکا تھا۔

''جی بھائی! پیرو چک ہم سے صرف 3 کلومیٹر دور ہے۔ میں بچپن میں اپنے نانا اور ماموں کے ساتھ تین چار دفعہ پیرو چک آیا تھا۔'' میں نے شفاقت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

چونکہ یہاں پر سارے لڑکے سیالکوٹ کے ہی تھے اس لئے میں بھی ان کے ساتھ سیالکوٹیا ہی ہو گیا تھا۔ ویسے بھی میرا سارا بچپن سیالکوٹ کی گلیوں میں گزرا تھا اور سیالکوٹ کی مٹی کی خوشبو مجھے آج بھی محسوس ہوتی تھی۔ ہم سب رات کو دس بجے کے قریب ایسے ہی باتیں کرتے رہے اور گانے سنتے رہے۔ اس گھر میں

زیادہ تر سٹیج ڈرامے یا مجرے ہی دیکھے جاتے تھے۔ وہ زمانہ نرگس کا زمانہ تھا۔ یونان کے ہر پاکستانی کے گھر میں نرگس کے مجرے کی کوئی نہ کوئی سی ڈی پڑی ہوتی تھی۔ یہاں پر سی ڈی کرایہ پر نہیں ملتی ہے بلکہ آپ کو فلم خریدنا پڑتی ہے۔

اس وقت ایک فلم کی قیمت ایک یورو ہوتی تھی۔ فلمیں اور ڈرامے پاکستان سے آتے تھے اور پھر ان کی کاپیاں ہوکر پورے یونان کے پاکستانی یا انڈین ویڈیو سینٹرز پر چلی جاتی تھیں۔ یہ انٹرنیٹ کا زمانہ نہیں تھا۔ جو لوگ پاکستان چھٹی جاتے تھے وہ واپسی پر کچھ فلمیں لے آتے تھے۔ اس کے علاوہ مین ویڈیو سنٹر والے ہر ہفتے فلمیں کوریئر کے ذریعے بھی منگواتے تھے۔ ڈی وی ڈی (DVD) بھی آ گئی تھی۔ سی ڈی (CD) ایک یورو اور ڈی وی ڈی دو یورو کی آتی تھیں۔ ڈی وی ڈی میں تین فلمیں ہوتی تھیں۔ MP3 فارمیٹ بعد میں ایجاد ہوئی تھی۔ اس طریقے سے ایک ڈی وی ڈی میں 100 فلمیں آجاتی تھیں۔ 100 فلموں والی DVD کی قیمت 10 یورو تھی جو آہستہ آہستہ پانچ اور پھر دو یورو کی نارمل قیمت پر آ گئی۔

ہم لوگوں نے جب پہلی بار 100 فلموں والی ڈی وی ڈی کا سنا تھا تو یقین ہی نہیں آیا تھا۔ ہم اسے ناممکن کہتے تھے، ایک ڈی وی ڈی میں 100 فلمیں آ ہی نہیں سکتی ہیں۔ لیکن پھر اس DVD کو دیکھ کر ہی یقین آیا۔ اور جس دن یہ ہمارے گھر میں آئی تھی سارے لڑکے اس کو فارورڈ کر کر کے دیکھ رہے تھے کہ واقعی پوری فلمیں ہیں یا پانچ پانچ منٹ کی فلمیں ڈالی ہوئی ہیں۔ لیکن یہ حقیقت تھی اور اس کا احساس آہستہ آہستہ ہو گیا۔

دوسرے دن صبح صبح 5 بجے خلیل مجھے لیکر اسٹے والے دفتر آ گیا۔ یہ دفتر ہمارے گھر سے تقریباً 40 منٹ کے بس کے سفر کا تھا۔ یہ بہت بڑی عمارت تھی اور اس کے چاروں طرف جالی لگی ہوئی تھی۔ اس کے اندر دو چھوٹے چھوٹے گراؤنڈ تھے۔ ایک طرف پٹرول پمپ اور دو رویہ سڑک بھی بنی ہوئی تھی۔ مین گیٹ کے پاس پولیس والوں کی سیکورٹی چیک پوسٹ تھی اور گلی کی دوسری طرف فوٹو سٹیٹ کی دکان تھی۔ خلیل مجھے لے کر پہلے فوٹو سٹیٹ کی دکان پر گیا۔ یہاں پر پہلے بھی سات آٹھ لڑکے کھڑے تھے۔ دو یونانی لوگ آگے فارم بنا رہے تھے۔ خلیل نے ایک پرچی اور پنسل پکڑی اور مجھے اپنا نام۔ والد والدہ کا نام اور تاریخ پیدائش لکھنے کا کہا۔ میں نے اس چٹ پر نام وغیرہ لکھا تو اس نے ایک یونانی کو وہ چٹ دی اور ساتھ میں اپنی جیب سے

ایک کاغذ نکال کر اسے دے دیا۔ یہ ہمارے نیکیا کے گھر کا کرایہ نامہ تھا جس پر ایڈریس لکھا ہوتا ہے۔

یونان میں یہ کام 2006ء سے بھی پہلے ہو رہا ہے جو پاکستان میں ابھی چوہدری نثار نے شروع کیا ہے۔ پاکستان میں ابھی کرایہ پر گھر حاصل کرنے کے لئے پہلے کرایہ نامہ اور کرایہ دار کی تصدیق تھانے سے ہونی شروع ہوتی ہے، یہ چوہدری نثار کی مہربانی ہے۔ میں نواز حکومت کا کوئی سپورٹر نہیں ہوں۔ مجھے سڑکیں اور پل بنانے والی کسی گورنمنٹ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔آپ مجھے اپنے ٹیکس کا پیسہ دو تو میں بھی آپ کو ایک نہیں دس دس ہسپتال بنا کر دے دوں گا۔ میں نے تو صرف ٹھیکا ہی لینا ہے۔ ہسپتال تو ٹھیکہ حاصل کرنے والی کمیٹی بنائے گی۔ ہاں! تختی ضرور اپنے نام کی لگواؤں گا۔

بات ہسپتال بنانے کی نہیں بلکہ اسے چلانے کی ہے۔آپ کے پیسے سے ہی آپ کو لیپ ٹاپ خرید کر دے رہا ہوں تو اس میں میرا کیا کمال ہے؟ ہاں! جو اچھا کام کرتا ہے اسے ضرور اچھا کہنا چاہیے۔ چوہدری نثار اچھا کام کر رہا ہے اور اس کی تعریف کرنا بھی ہمارا فرض ہے۔ چوہدری نثار نے پاسپورٹ کے نظام کو بہتر کیا ہے۔ دو نمبر طریقے سے پاسپورٹ اور شناختی کارڈ بنانے کا راستہ بند کیا ہے اور اس میں ملوث ملازموں کو سزا بھی دی ہے۔ یورپ سے ڈی پورٹ ہونے والے لڑکوں کو واپس نہ لینے کا فیصلہ اور ہر کرائے دار کے لئے لازمی تھانے سے تصدیق یہ چوہدری نثار کے کارنامے ہیں اور ہمیں اس کو ماننا بھی چاہئے۔

یونان میں کرایہ نامہ کو سمولیا (SAMOLIA) کہتے ہیں اور اس کے بغیر آپ کو ویزہ یا اسٹے نہیں دیا جاتا۔ جرمنی میں تو قانون اس سے بھی زیادہ سخت ہے۔ خلیل نے مجھے فارم بھروا کر دیے اور باہر مین گیٹ کے پاس جنگلے کے اندر لائین میں کھڑا کر دیا۔

''صبح کے چھ بج چکے ہیں۔اب سات بجے کے قریب یہ اندر لے جائیں گے اور دو بجے کے قریب تمہارے فنگر پرنٹ وغیرہ ہو کر ریڈ کارڈ دے دیں گے۔تم ریڈ کارڈ لے کر ادھر ہی بیٹھ جانا، میں چھ بجے چھٹی کر کے آؤں گا تو تمہیں لے جاؤں گا۔'' اس نے بیرونی طرف ایک بینچ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اتنا ٹائم نکال لو گے نا ادھر بینچ پر؟ تقریباً تین چار گھنٹے ہوں گے، اصل میں تمہیں گھر کا پتہ نہیں ہے ورنہ اکیلے ہی چلے جاتے۔ میں تو چھٹی کے بعد ہی آ سکتا ہوں۔'' اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

’’جی بھائی! کوئی بات نہیں ہے، میں اتنا وقت آرام سے نکال سکتا ہوں۔‘‘ میں لائین میں کھڑا ہو گیا۔

مجھ سے آگے دس بارہ لڑکے کھڑے تھے۔ خلیل مجھے ادھر ہی چھوڑ کر چلا گیا۔ لڑکے آہستہ آہستہ مزید آنے لگے اور سات بجے تک ہم تقریباً 150 کے قریب لڑکے ہو گئے تھے۔ ایک پولیس والا آیا اور اس نے مین گیٹ کھول کر ہمیں لائین کے مطابق ہی آگے لے جانے لگا۔ ہم چلتے ہوئے بڑی عمارت کے ہال میں چلے گئے۔ اس ھال میں بنچ لگے ہوئے تھے۔ دروازے کے آگے ٹیبل کرسی پر دو پولیس والے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ ہمارا نام اور شہریت لکھتے اور ہمیں اندر ہال میں جانے دیتے۔ میں نے اپنا اصلی نام اور ملک بتایا اور اندر چلا گیا۔

جس ملک میں آپ نے سیاسی پناہ لینی ہے وہاں آپ کو اصل نام و پتہ ہی لکھوانا پڑتا ہے تا کہ اگر کل کو آپ کی پناہ کی درخواست منظور ہو جائے تو آپ کے اصل پاسپورٹ پر آپ کو ویزہ مل جائے۔ ویزہ ہمیشہ اوریجنل پاسپورٹ پر ہی ملتا ہے اس لئے یورپ میں ہمیشہ اپنا اصل نام و پتہ ہی لکھوانا چاہیے۔ دو پولیس والوں نے تقریباً 20 منٹ میں ہمارا نام لکھا اور ہم سب لڑکے اندر ہال میں رکھے بنچوں پر بیٹھ گئے۔ ہم 150 کے قریب لڑکے کوئی دس بارہ ملکوں سے تعلق رکھتے تھے۔

ابھی ہمیں یہاں بیٹھے تھوڑی دیر ہوئی تھی جب کوئی سات کے قریب آدمی آئے اور وہ ہمارے نام پکارنے لگے۔ یہ مختلف ملکوں کے ترجمان تھے۔ وہ آ کر سات لڑکوں کو لے گئے۔ یہ ترجمان اپنے ہی ملک کا لڑکا لے کر جا رہے تھے۔ تقریباً 10 منٹ تک وہ پھر آ گئے اور دوبارہ 7 لڑکوں کو لے کر چلے گئے۔ میری باری تیسری بار میں آئی۔ میرا ترجمان انڈین پنجاب کے (موگا) شہر کا رہنے والا تھا۔ موگا اور فیروز پور پاکستانی قصور شہر کے نزدیک ہیں۔ یہ علاقہ کپاس کی کاشت کے لئے مشہور ہے۔

’’جی بھائی! اپنا نام اور پتہ اس کاغذ پر لکھ دو اگر انگلش آتی ہے، ورنہ میں لکھ لوں گا۔‘‘ اس نے ایک کاغذ اور پنسل میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

’’میرا نام سکھویندر سنگھ ہے، آپ مجھے سُکھا کہہ سکتے ہو۔ آپ کے قصور شہر سے صرف 25 کلومیٹر میں ہزاروں کلومیٹر کا سفر کر کے یہاں یونان پہنچ گیا ہوں۔ لیکن اس 100 کلومیٹر کے سفر کو عبور نہیں کر سکا۔ آپ پاکستانیوں میں کچھ تو خاص بات ہے جو گرونانک صاحب نے آپ کے ملک کو رہنے کے لئے چنا ہے۔ آپ

نے ننکانہ صاحب دیکھا ہوا ہے؟'' اس نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

''نہیں سر! میں نے ننکانہ صاحب نہیں دیکھا ہے۔'' یہ ملتان سے لاہور جاتے ہوئے رائیونڈ کے نزدیک مین جی ٹی روڈ سے ہٹ کر تھا اور اسی وجہ سے میں اسے دیکھ نہیں سکا تھا۔ میں نے اسے چٹ پر اپنا نام اور پتہ لکھ کر دیتے ہوئے کہا۔

''رضوان علی! آپ مکے اور مدینے کو جانتے ہو؟'' اس نے چٹ سے میرا نام دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی سر! میں مسلمان ہوں اور ہر مسلمان مکے اور مدینے کو صرف جانتا ہی نہیں ہے بلکہ ہمارے دل میں یہ دونوں مقدس شہر رہتے ہیں۔'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''رضوان بھائی! ننکانہ صاحب ہم سکھوں کے لئے مقدس ترین شہر ہے اور یہ ہمارے دلوں میں رہتا ہے۔'' اس نے فارم پر میرا نام اور پتہ لکھا، مجھ سے دستخط کروائے اور مجھے لے کر ایک یونانی پولیس والے کے پاس چلا گیا۔

یہ پولیس آفیسر فنگر پرنٹ لے رہا تھا۔ اس زمانے میں کمپیوٹرائزڈ فنگر پرنٹ نہیں آئے تھے۔ اس کے پاس رنگ کرنے والا رولر تھا۔ وہ رولر کو ایک ربڑ کے ٹکڑے پر پھیرتا اور پھر ہمارا ہاتھ پکڑ کر ایک ایک انگلی کو اس سیاہی سے لتھڑے ہوئے پلاسٹک کے ٹکڑے پر رکھ کر سیاہی لگاتا اور پھر کاغذ پر نشان لینے لگتا۔ اس کے پاس تین کاغذ تھے اور وہ ایک ایک انگلی کے تین تین نشان لے رہا تھا۔ اس نے ساری انگلیوں کے نشان لے کر پوری ہتھیلی پر اولا پھیر کر سیاہی لگائی اور میری پوری ہتھیلی کا نشان کاغذ پر لینے لگا۔

میں نے پاکستان میں صرف انگوٹھے کے نشان سنا تھا لیکن یہاں انگلیوں کے علاوہ ہتھیلی کے نشان بھی لیے جاتے تھے اور یہ نشان یورپی قوانین کے 98 ممالک میں انٹیلی جنس کی معلومات میں استعمال ہوتے تھے۔ آپ کی ایک فائل بنتی تھی اور وہ فائل پھر یورپی یونین میں استعمال ہوتی تھی۔ میں نے 2006ء میں فنگر پرنٹ دیئے تھے اور 11 سال بعد جب جرمنی میں 2017ء میں میرا انٹرویو ہوا تو جج نے میرے سامنے یونان کے فنگر پرنٹ نکال کر رکھ دیئے تھے۔ یہ فنگر پرنٹ نہیں ہوتے بلکہ آپ کا پورا ریکارڈ ہوتا ہے کہ آپ کہاں کہاں چیک ہوتے ہو۔

پولیس والے آپ کو کہیں روک کر آپ کا شناختی کارڈ یا اسٹے کارڈ دیکھتے ہیں تو اس کا نمبر تصدیق کے لئے پیچھے تھانے لکھوایا جاتا ہے۔ جو اسے مین ہیڈ کوارٹر تصدیق کے لئے بھیجتے ہیں کہ آپ کے ریکارڈ پر کوئی جرمانہ یا غیر قانونی سرگرمی تو نہیں ہے اور صاف ہونے پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یہ چیکنگ آپ کی فائل میں مکمل جاتی ہے۔اس سے پولیس والے کی کارکردگی بھی چیک ہوتی ہے کہ اس نے اپنی آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی میں کتنے لوگوں کو چیک کیا ہے۔آپ کی فائل میں یہ چھوٹی بڑی بات لکھی جاتی ہے۔

یورپ میں جرم کرنا انتہائی آسان ہے لیکن جرم کر کے چھپانا ناممکن ہے۔آپ یونان میں کوئی جرم کر کے جرمنی،فرانس،یورپ میں کہیں بھی بھاگ جائیں۔آپ کے فنگر پرنٹ سے آپ کی شناخت ہو جائے گی اور آپ پکڑے جاؤ گے۔ یہ لوگ آپ کے فون تک کا ریکارڈ رکھتے ہیں۔اسی لئے تو یورپ ترقی کر رہا ہے اور ہم لوگ صرف پاکستان زندہ باد کے نعرے لگا رہے ہیں۔

پولیس والے نے میرے سارے فنگر پرنٹ لینے کے بعد واش بیسن پر مجھے صابن سے ہاتھ دھونے کے لئے کہا اور دوسرے لڑکے کے فنگر پرنٹ لینے لگ گیا۔ میں نے اپنے ہاتھ دھو لئے تو اس نے مجھے مین ہال میں انتظار کرنے کا کہا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور ہال میں جا کر بیٹھ گیا۔ یہ انتظار لمبا ہوتے ہوتے دو بجے تک چلا گیا۔سارے لڑکوں کے فنگر پرنٹ ہو گئے تھے اور اب صرف ریڈ کارڈ کا ہی انتظار ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ایک یونانی سادہ کپڑوں میں آ گیا۔شاید وہ کوئی کلرک وغیرہ تھا۔اس کے ہاتھ میں ریڈ کارڈز تھے۔اس نے ریڈ کارڈ پر موجود نام پڑھ کر پکارنا شروع کر دیا۔ وہ لڑکے کا نام پکارتا اور لڑکا اس سے کارڈ لے لیتا اور پھر عمارت سے باہر چلا جاتا۔تھوڑی دیر تک میرا کارڈ بھی آ گیا۔ میں نے اس سے کارڈ لیا اور عمارت سے باہر نکل کر بنچ پر بیٹھ گیا۔

ابھی صرف اڑھائی بجے تھے جبکہ خلیل شام کو چھ بجے کے قریب آتا۔تب تک میں فارغ تھا۔ میں نے بنچ سے ٹیک لگائی اور آنکھیں بند کر لیں۔آج مجھے یورپی یونین کا اسٹے مل گیا تھا اور میں یونان میں رہ سکتا تھا۔ ڈی پورٹ ہونے کا ڈر ختم ہو گیا تھا۔میری منزل مجھے قریب ہوتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ میں یہاں پر کچھ عرصہ رہ کر کام کرتا اور اس کے بعد آگے امریکہ جانے کے لئے راستے تلاش کرتا۔

یہاں پر میرے علاوہ کچھ اور لڑکے بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ سب نئے لڑکے تھے اور اپنے بھائیوں یا

رشتہ داروں کا انتظار کر رہے تھے۔ انتظار تو میں بھی کر رہا تھا لیکن یہاں کوئی میرا رشتہ دار نہیں تھا۔ مجھے خود ہی آگے کوشش کرنی تھی۔ یونان بہت بڑا ملک تھا اور یہاں مواقع بھی بہت تھے۔ میرے ہاتھ میں کھیتی باڑی کے علاوہ کوئی ہنر نہیں تھا۔ میں لکھنا پڑھتا جانتا تھا۔ تعلیم تو تھی لیکن یورپ میں تعلیم کسی کام نہیں آتی۔ میں کونسا ڈاکٹر یا انجینئر تھا۔ یہاں مزدوری ہی سب کچھ ہوتی ہے۔ جو جتنا زیادہ سخت جان ہے وہ اتنا زیادہ پیسہ کماتا ہے۔ خلیل چھ بجے سے پہلے ہی آ گیا۔

''ہاں یار! کارڈ بن گیا ہے؟'' خلیل آتے ہی مجھ سے پوچھنے لگا۔

''جی بھائی! مل گیا ہے۔'' میں نے ریڈ کارڈ نکال کر اسے دکھاتے ہوئے کہا۔

''چلو! یہ تو اچھا ہو گیا، اب تو آرام سے شہر میں گھوم پھر سکتے ہو۔ فوٹو کاپی کروالی ہے کارڈ کی؟'' اس نے ایک بار پھر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی نہیں بھائی! ابھی نہیں کروائی ہے۔'' میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''اچھا! چلو، میں کروا دیتا ہوں۔ میرا ہی خرچہ کروانے پر تلے ہوئے ہو۔'' اس نے بے چارگی سے کہا اور مجھے لیکر اندر دوکان میں چلا گیا۔ اس نے وہاں سے فوٹو کاپی کروائی تو میں ایک بار پھر پیسے نکال کر اس کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔

''بھائی! یہ پیسے لے لیں!'' میں نے پیچھے سے اسے پکارتے ہوئے کہا۔

'' 10 سینٹ (پیسے) لگتے ہیں یار! اب تم سے سکّے لیتے ہوئے تو واقعی مجھے شرم آئے گی۔ کوئی بات نہیں، جب تم کام پر لگ جاؤ گے اور کمانے لگو گے تو تمہارا خرچہ بھی کروالوں گا۔ ابھی رہنے دو!'' اس نے جیب سے سکے نکال کر دوکاندار کو دیئے اور فوٹو کاپی کروا کر ہم دونوں باہر آ گئے۔

یہاں سے 21 نمبر ٹرالی ہمارے گھر کی طرف جاتی تھی۔ ایتھنز میں پانچ قسم کی سرکاری ٹرانسپورٹ استعمال ہوتی ہے۔ بس، ٹرالی، ٹرام، میٹرو اور ٹرین۔ سنگل ٹکٹ 50 سینٹ کی تھی جو ایک بس یا ٹرالی کے لئے ہوتی تھی۔ جبکہ دوسری ٹکٹ 70 سینٹ کی تھی۔ یہ 90 منٹ کے لئے ہوتی تھی۔ ایک بار پنچ کرنے کے بعد ڈیڑھ گھنٹے تک آپ پورے شہر میں جتنی مرضی بسیں یا ٹرینیں تبدیل کریں۔ اس کے علاوہ 15 یورو کا ماہانہ کارڈ

تھا جو بس یا ٹرالی کے لئے استعمال ہوتا تھا جبکہ 35 یورو کا کارڈ ساری ٹرانسپورٹ کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ یہ 2006ء کے ایتھنز شہر کی بات کر رہا ہوں۔

آپ یورپ کی ترقی کا اندازہ لگالیں۔ یونان ترقی یافتہ ملک ضرور ہے لیکن یہ یورپی یونین کا غریب ترین ملک ہے۔ اگر میں جرمنی کا ٹرانسپورٹ کا نظام لکھنا شروع کردوں تو آپ لوگ حیران رہ جائیں گے۔ جرمنی کی مرکزی گورنمنٹ ایک مہاجر پر 750 یورو ماہانہ خرچ کرتی ہے۔ جس میں 350 یورو نقد، 75 یورو کی ٹرین کی ماہانہ ٹکٹ، مکان کا کرایہ، بجلی کا بل اور انٹرنیٹ کا بل۔۔۔ ٹوٹل 750 یورو ماہانہ فی لڑکا جرمنی کی مرکزی گورنمنٹ ادا کرتی ہے۔ یہ پاکستانی تقریباً 90 ہزار روپیہ بنتا ہے۔ پاکستان میں کتنے فی صد لوگوں کی ماہانہ آمدن 90 ہزار روپیہ ہے؟ ایک فی صد بھی نہیں ہوں گے۔ جبکہ یہ لوگ ہماری ماہانہ مدد ہی 90 ہزار میں کر رہے ہیں۔

میری ایک جرمن دوست کا کام ختم ہوگیا۔ اس کے پاس کام نہیں رہا تو اسے جرمن حکومت بے روز گاری فنڈ دینے لگی۔ یہ بے روزگاری فنڈ پتہ ہے کتنا ہوتا ہے جو ہر جرمن شہری کو کام چھوٹنے پر ملتا ہے؟ بارہ سو (1200) یورو جو کہ پاکستانی تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپیہ بنتا ہے۔ اگر بے روزگاری الاؤنس ڈیڑھ لاکھ ہے تو ماہانہ تنخواہ کتنی ہوگی؟ ترقی یافتہ ملک اس کو کہتے ہیں۔ 8 کروڑ کی آبادی والے اس ملک میں 20 فیصد آبادی باہر سے آتی ہے۔ یہ امریکہ کے بعد دوسرا بڑا ملک ہے جس کا اتنا بڑا حصہ مہاجرین پر مشتمل ہے۔ آپ میں سے کچھ لوگ مجھے عرب ممالک (مسقط، کویت اور سعودی عرب) کا حوالہ دیں گے جہاں کی مقامی آبادی کم اور باہر سے آئے ہوئے لوگ زیادہ ہیں۔ تو جناب! میں ویزے پر آئے ہوئے مزدوروں کی بات نہیں کر رہا بلکہ میں شہریت کی بات کر رہا ہوں۔ یہ وہ غیر ملکی ہیں جو باہر سے آئے ہیں اور یہاں طویل عرصہ رہنے کے بعد جرمن گورنمنٹ نے انہیں جرمن پاسپورٹ دے دیئے ہیں۔

”یار! میں نے تمہارے کام کے لئے اپنے مالک سے بات کی ہے۔ اسے ایک لڑکے کی ضرورت تو ہے، وہ کہہ رہا تھا کہ ایک دو دن تک بتائے گا۔ کام تھوڑا سا زیادہ ہوجائے تو بلالے گا۔“ خلیل اور میں ٹرالی میں بیٹھ چکے تھے اور اب گھر کی طرف سفر کر رہے تھے۔

”جی بھائی! آپ کی مہربانی ہے۔ اگر شہر میں کام مل جائے تو زیادہ آسانی ہے ورنہ پھر فیاض بھائی کے

پاس چلا جاؤں گا۔کھیتی باڑی میں پیسے تھوڑے کم بنتے ہیں لیکن گھر میں فارغ بیٹھنے سے تو اچھا ہے۔میں جلد سے جلد یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں۔'' میں نے ٹرالی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہاں سے نکلنے کا کیا مطلب ہے؟ کیا تم یہاں ہمارے ساتھ نہیں رہنا چاہتے؟'' اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں بھائی!میں آگے جانا چاہتا ہوں۔سال دو سال یہاں لگا تار کام کر لیا تو آگے جانے کا کرایہ بن جائے گا۔اتنی دیر تک کوئی ایجنٹ بھی مل جائے گا۔''

''آگے جانے کے اتنے پیسے نہیں لگتے ہیں۔چار پانچ مہینے تک تم آرام سے پیسے اکٹھے کر لو گے۔میں خود بھی آگے جرمنی جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔تم کدھر جانا چاہتے ہو،سپین یا اٹلی؟'' 2006ء میں یہی دو ملک مہاجرین کے لئے سب سے فیورٹ تھے۔سپین تین سال تک ملک کے اندر رہنے پر ویزہ دے دیتا تھا۔جبکہ اٹلی ہر دو سال بعد اوپن ویزہ جاری کرتا تھا اور اس وقت جتنے بھی لڑکے اٹلی میں سیاسی پناہ کے تحت رہ رہے ہوتے تھے ان سب کو ویزہ دے دیا جاتا تھا۔جرمنی سیاسی پناہ تو دیتا تھا لیکن ویزہ نہیں دیتا تھا۔اس لئے زیادہ تر لڑکے سپین اور اٹلی کا ہی رخ کرتے تھے۔2010ء کے بعد جرمنی نے مہاجرین کو کچھ سہولتیں دی ہیں جن کا میں پیچھے ذکر کر چکا ہوں۔

''نہیں بھائی!میں سپین یا اٹلی جانے کا ارادہ نہیں رکھتا بلکہ مجھے اس سے بھی آگے جانا ہے۔''

''اوہ!تو آپ انگلینڈ جانا چاہتے ہو؟اچھا ملک ہے لیکن امیگریشن نہیں دیتا۔ویزہ چاہیے تو اٹلی یا سپین چلے جاتے،جرمنی بھی اچھا ہے۔'' اس نے میری معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''بھائی!میں اس سے بھی آگے جانا چاہتا ہوں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''انگلینڈ سے آگے کونسا ملک ہے؟اس سے آگے تو صرف سمندر ہی ہے۔کوئی نیا ملک تو نہیں بن گیا انگلینڈ سے بھی آگے؟'' اس نے شرارت سے کہا۔

''بھائی!میں امریکہ جانا چاہتا ہوں۔'' میں ایک بار پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

''امریکہ۔۔۔'' وہ خاموشی سے دوسری طرف دیکھنے لگا۔ اسے شاید میری ذہنیت یا کم عقلی پر شبہ ہونے لگا تھا۔

جس نے امریکہ جانا ہوتا ہے وہ ڈائریکٹ جاتا ہے۔ دو نمبر پاسپورٹ سے شادی کر کے قانونی طریقے سے پہلے کینیڈا کی گیم ہوتی ہے اور پھر امریکہ یا پھر میکسیکو تک ہوائی جہاز کے ذریعے اور پھر میکسیکو سے بارڈر کراس کیا جاتا ہے۔ یہ دو طریقے تھے۔ ساؤتھ افریقہ اور دوبئی سے بھی امریکہ کی گیم ہوتی تھی۔ لیکن پیدل۔۔۔ یورپ اور پھر یورپ سے امریکہ۔ میں شاید پہلا بے وقوف پاکستانی تھا جو اس راستے کا انتخاب کر رہا تھا۔ پاکستان سے امریکہ کی گیم 20 لاکھ (میکسیکو والی) سے شروع ہوتی ہے اور چالیس پچاس لاکھ تک چلی جاتی ہے۔ جبکہ میرے گھر میں تو 20 ہزار روپے بھی نہیں تھے۔ میں ایسے ہی ایک ایک کر کے ملک کراس کرتا ہوا امریکہ پہنچنا چاہتا تھا۔ یونان ترقی یافتہ ملک تھا۔ میں اگر مہینے کا 600 یورو بھی بچا تا تو تین سال میں 20 لاکھ روپیہ جوڑ لیتا اور یونان سے میکسیکو جانے کی کوشش کرتا اور میکسیکو سے آگے پھر امریکہ۔۔۔ منزل ابھی دور بہت تھی لیکن ناممکن کچھ بھی نہیں تھا۔

ہم دونوں گھر پہنچ گئے تو خلیل نہانے کے لئے باتھ روم گھس گیا اور میں دوسرے لڑکوں کے پاس بیٹھ گیا۔ مجھے اب سب لڑکوں کے نام یاد ہو گئے تھے۔ یہاں سب لڑکے ہی بہت اچھے تھے اور سارے ہی بہت جلد میرے دوست بن گئے تھے۔ خلیل کے بعد میں بھی باتھ روم گھسا اور منہ ہاتھ دھونے لگا۔ آج کھانا بنانے کی باری شفاقت کی تھی۔ میں اس کے ساتھ جا کر اس کا ہاتھ بٹانے لگا۔ وہ مجھے منع کرتا رہا لیکن مجھے کام کرنا اچھا لگتا تھا۔

''یار! ابھی تم نئے نئے آئے ہو، چار دن کھاؤ پیو، پھر کام بھی کر لینا! میں نے ایک دو دوستوں کو تمہارے کام کا کہا ہے۔ مجھے امید ہے جلد ہی تمہیں کام مل جائے گا۔'' اس نے میرے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ شفاقت بھائی مجھ سے تقریباً دو سال بڑے تھے اور بہت اچھی طبیعت کے مالک بھی۔ یہ ابھی تک یونان میں ہی رہ رہے ہیں اور ان کے کاغذ بھی بن گئے ہیں لیکن ابھی تک پاکستان چکر نہیں لگا یا۔ ان کی پاکستان میں کوئی خاندانی دشمنی تھی جس کی وجہ سے یہ جان بچا کر یونان بھاگ آئے تھے اور اسی وجہ سے ابھی تک پاکستان نہیں گئے تھے۔

''ہاں جی راضی صاحب! امریکہ جا رہے ہو؟ کب جا رہے ہو؟'' خلیل بھائی بھی کچن میں آ گئے۔ انہوں نے پیچھے سارے لڑکوں کو بتا دیا تھا اور اب ایک کے بعد دوسرا سارے کچن میں اکٹھے ہو گئے تھے۔

''ہاں یار! سنا ہے تم امریکہ جا رہے ہو؟'' وہ سارے میرا مذاق اڑانے لگے۔ میں نے ان کو مسکرانے کا موقع دیا اور خاموشی سے شفاقت کے ساتھ روٹیاں بنانے لگا۔

مجھے ابھی روٹی بنانا نہیں آتی تھی اس لئے میں روٹی سینک رہا تھا اور شفاقت روٹی بنا رہا تھا۔ دو تین دن تک میں گھر میں فارغ بیٹھا رہا اور اس دوران میں نے کھانا بنانا سیکھ لیا تھا۔ چوتھے دن کام نکل آیا۔ یہ شفاقت کے پاس سلائی کا کام تھا۔ مجھے سلائی تو نہیں آتی تھی اس لئے خلیل نے اپنا قدومی (مستریوں) کا کام چھوڑ دیا اور شفاقت کے ساتھ سلائی کے کام پر چلا گیا۔ مہینے کا کارڈ مجھے رات کو ہی خلیل نے بنوا کر دے دیا تھا۔

ہم سات بجے سے 10 منٹ پہلے ہی بلڈنگ پر پہنچ گئے ہمارا کام سات بجے شروع ہوتا تھا اور تین بجے ختم ہوتا تھا جبکہ دو گھنٹے روزانہ اوور ٹائم لگایا جاتا تھا۔ یہ الفا چینل (یونان کا ایک مشہور ٹی وی چینل) کا ایک سٹوڈیو تھا۔ یہ اکٹھے تین سٹوڈیو تھے اور تینوں سات سات منزلہ تھے۔ دو منزلیں نیچے اور 5 منزلیں اوپر تھیں۔ سٹوڈیو گراؤنڈ فلور سے شروع ہوتے تھے اور اوپر آخری منزل تک جاتے تھے۔ یہ بہت بڑی عمارت تھی۔ ہمارا پورا گاؤں اس عمارت میں سما سکتا تھا۔

اس عمارت میں مختلف کمپنیوں کے لوگ کام کر رہے تھے۔ ہم 10 پاکستانی لڑکے تھے اور ہم ان کی ہیلپ کرتے تھے۔ کسی بھی کاریگر کو کسی لڑکے کی مدد کی ضرورت ہوتی تو ہم میں سے کوئی جا کر ان کی مدد کرتا تھا۔ اس کے علاوہ ہم بلڈنگ میں صفائی کا کام کرتے تھے۔ یہاں پر تقریباً 100 سے زیادہ لوگ کام کر رہے تھے اور ہم دس لڑکے کبھی رنگ والے کے پاس، کبھی بلوزر یا کرین والے کے پاس اور کبھی گتے کا کام کرنے والے کے پاس جا رہے تھے۔ مجھے زبان نہیں آتی تھی اس لئے پہلے دن میں صفائی کے کام پر ہی لگا رہا۔ ایک ہفتے تک کام کو دیکھ کر مجھے تھوڑا اندازہ ہو گیا تھا۔ اس لئے اب آہستہ آہستہ میں مستریوں کے پاس جا کر ان کا ہاتھ بٹانے لگا۔

یہاں پر تنخواہ 15 دن کے بعد ملتی تھی اور کام چھ دن ہوتا تھا۔ 15 دن کے بعد مجھے پہلی تنخواہ ملی تو میں

نے ساری تنخواہ لاکر خلیل کے ہاتھ پر رکھ دی۔

''بھائی جی! آپ کا یا گھر کا جتنا بھی خرچہ آیا ہے وہ آپ کاٹ لیں، اب مجھے تنخواہ ملنے لگ گئی۔''

واہ! کیا بات ہے میرے شہزادے کی۔۔۔تنخواہ تو ساری ایسے لاکر میرے ہاتھ پر رکھ رہا ہے جیسے میں تمہاری بیوی ہوں۔'' وہ واقعی میرا انداز دیکھ کر خوش ہوا تھا۔

''نہیں بھائی! آپ کی بہت مہربانی ہے جو آپ نے مجھے سہارا دیا ہے۔ابھی آپ کی وجہ سے میں کمانے لگا ہوں اور آج اس قابل ہوا ہوں جو اپنا خرچہ اٹھا سکوں۔'' میں نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں! یہ بات تو ٹھیک ہے۔تم واقعی بہت شریف لڑکے ہو۔چلو! پھر مجھے کپڑے تبدیل کرنے دو، پھر باہر چلتے ہیں۔یار! پارٹی دو گے نا مجھے؟'' وہ جلدی سے کپڑے تبدیل کرنے لگا۔کپڑے تبدیل کرنے کے بعد وہ مجھے لے کر ایک پاکستانی منی مارکیٹ (کریانہ سٹور) پر پہنچ گیا۔اس نے وہاں سے 4 ڈبے مٹھائی کے لئے اور دکان دار کو پیسے ادا کر کے واپس گھر کی طرف چل پڑے۔

''خلیل بھائی! کوئی چیز تو کھا لیتے آپ؟'' میں نے اس سے کہا تو وہ مسکرانے لگے۔

ہم واپس گھر آ گئے تھے۔رات کے کھانے کے بعد اس نے دو ڈبے کھولے اور سب کا منہ میٹھا کروانے لگا۔ہم چائے کے ساتھ مٹھائی کھاتے رہے اور کمرے والے سارے لڑکے مجھے مبارک باد دیتے رہے۔مٹھائی سے فارغ ہونے کے بعد خلیل نے کاپی اٹھائی اور اس کے اوپر میرا نام لکھ دیا۔

''لو جی راضی صاحب! آج سے تمہارا کھاتا شروع ہو گیا ہے۔آج کے بعد گھر کا کوئی بھی سامان لاؤ گے تو اس صفحہ پر لکھ دینا! مہینے کے آخر پر حساب ہو گا۔آج سے تم اس گھر کے باقاعدہ فرد بن گئے ہو۔'' اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''یہ باقی دو ڈبے کل کام پر لے جانا اور دوسرے ساتھیوں کو بھی کھلانا! تمہارا پہلا پہلا کام ہے، لڑکے خوش ہو جائیں گے۔ہاں! یہ پیسے کس کے نام پر بھیجنے ہیں؟ میں ویسٹرن یونین سے بھجوا دوں گا بلکہ تمہارے پاس تو گھر کا بھی کوئی نمبر نہیں ہے۔۔۔خط لکھ دیا ہے تم نے پاکستان میں؟'' وہ سوچ میں پڑھ گیا۔

''نہیں بھائی! ایک دو دن میں لکھ دوں گا۔آپ اگر میرا بنک اکاؤنٹ بنوا دیں تو میں اکاؤنٹ میں پیسے رکھنا شروع کر دوں گا۔'' میں نے آہستہ سے کہا تو وہ سوچنے لگا۔

''ٹھیک ہے! تم ایسا کرو کل بارہ بجے چھٹی کر کے میری دوکان پر آ جانا، جہاں ہم کام کرتے ہیں۔۔۔ پتہ ہے نا؟

''جی! جی! مجھے پتہ ہے۔''

''ٹھیک ہے پھر! کل آ جانا، میں تمہارا اکاؤنٹ بنوا دیتا ہوں۔سیالکوٹ میں کونسا گاؤں بتایا تھا پیرو چک کے نزدیک؟ ٹھیک ہے تم کل دوکان پر آؤ، میں دیکھتا ہوں کہ کیا کر سکتا ہوں تمہارے ساتھ۔۔۔اور ہاں! ایک اور بات۔۔۔ میں صرف ایک ہفتے کے لئے تمہیں یہاں لایا تھا لیکن ابھی یہ سارے تمہیں اپنے ساتھ رکھنے پر تیار ہو گئے تھے اس لئے تمہارا نام کاپی پر لکھا ہے۔تم ہمارے علاقے کے نہیں ہو اور نہ ہی ہم تمہیں جانتے ہیں لیکن پھر بھی تمہیں اپنے گھر میں رکھ کر اعتبار کر رہے ہیں۔ہمیں کبھی دھوکہ مت دینا یار!'' خلیل نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ دوسرے دن میں نے کام پر باقی لڑکوں کا منہ میٹھا کروایا۔

''راضی بھائی! مزا آ گیا آپ کی مٹھائی کھانے کا، مبارک ہو آپ کو پہلے کام کی پہلی تنخواہ کی۔'' نصیری نے مسکراتے ہوئے کہا۔

یہ افغانی لڑکا تھا لیکن اس کی پیدائش پاکستان کے شہر راولپنڈی میں ہوئی تھی۔اس کا رنگ افغانیوں کی طرح سرخ وسفید تھا لیکن پنجابی بہت روانی سے بول لیتا تھا۔اسے دیکھ کر اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ پنجابی ہے یا پٹھان۔ان کا خاندان 2001ء میں پاکستان سے ہجرت کر کے افغانستان کے شہر کابل چلا گیا تھا۔ بہت تیز طرار لڑکا تھا اور سارا دن کام کے دوران اس کا شور سنائی دیتا رہتا تھا۔

''شکریہ یار! آپ بھی بہت اچھے ہو۔آپ لوگوں کی وجہ سے مجھے کام پر بہت آسانی ہوئی ہے۔'' میں نے انکساری سے کہا۔

نصیری ہم دس لڑکوں کے اوپر فورمین تھا۔اسے یونان آئے ہوئے دو سال سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا تھا

اوراس کے پاس 2005ء کی امیگریشن تھی۔ میں نے اس سے بارہ بجے کی چھٹی لی اور اامونیا خلیل کی دکان پر آ گیا۔

خلیل مجھے لے کر اتھنکی (ATHNIKI) بینک آ گیا۔ بینک اکاؤنٹ کے لئے صرف اسٹے کارڈ (ریڈ کارڈ) اور کرایہ نامہ چاہیے ہوتا تھا۔ خلیل گھر سے صبح اصل کرایہ نامہ لے کر آیا تھا۔ تین دن پہلے وہ میرا اور یجنل ریڈ کارڈ تھانے لے گیا تھا اور وہاں سے اس نے میرا نام کرایہ نامہ پر منتقل کروا دیا تھا۔ بینک والوں نے میرا نام اور ایڈریس لکھا اور آدھے گھنٹے میں ہی مجھے بینک کی کاپی (چیک بُک) پکڑا دی۔ ATM کارڈ بعد میں ڈاک کے ذریعے گھر آتا تھا اور مجھے ایک بار پھر ATM کارڈ کرایہ نامہ اور ریڈ کارڈ کے ساتھ بینک آنا پڑتا تب یہ لوگ مجھے ATM کارڈ کا کوڈ دے دیتے۔ میں نے کاپی سے ہی سارے پیسے بینک میں جمع کروا دیئے۔ ATM کارڈ آنے تک میں کاپی سے ہی پیسے جمع کروا اور نکلوا سکتا تھا۔ بینک میں اپنا کھاتا کھلوا کر خلیل واپس دکان پر چلا گیا اور میں بھی واپس کام پر چلا گیا۔

مجھے شہر گھومنے یا سیر کرنے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ میں امریکہ جانے کے لئے۔۔۔ ایمان کے خواب کو پورا کرنے کے لئے گھر سے نکلا تھا اور یہی میرا مقصد تھا۔ مجھے میرا مقصد بھولا نہیں تھا۔ یورپ کی چکا چوند روشنی مجھے میرے مقصد سے ہٹا نہیں سکتی تھی۔ اتوار کو چھٹی ہوتی تھی تو تقریباً سارے لڑکے ہی گھر ہوتے تھے۔ گھر کی صفائی وغیرہ کر کے لڑکے سمندر پر اور رات کو کلب جاتے تھے لیکن مجھے کسی چیز کا شوق نہیں تھا۔ وہ ضد کرتے رہتے تھے لیکن میں منع کر دیتا۔

الفا چینل کا کام تقریباً 16 مہینے تک مسلسل چلا اور ان 16 مہینوں میں میں 10 ہزار یورو اکٹھے کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ یورو کا ریٹ پاکستانی 75 روپے سے شروع ہوا تھا اور 85 سے اوپر ہو گیا تھا۔ الفا چینل کا کام ختم ہو گیا تو میں گھر میں فارغ بیٹھ گیا۔ یونان کے حالات اب آہستہ آہستہ خراب ہونا شروع ہو گئے تھے۔ کام مل جاتا تھا لیکن تھوڑی مشکل سے ملتا تھا۔ میں روزانہ صبح 5 بجے گھر سے نکل جاتا تھا اور مختلف جگہوں پر کام تلاش کرتا رہتا تھا۔ فیاض بھائی جرمنی چلے گئے تھے۔ سرفراز نے بھی کوس جزیرے سے کام چھوڑ دیا تھا اور وہ بھی ایتھنز آ گیا تھا اور پیرامستری میں رہنے لگا۔ میں دو تین بار اس سے ملنے گیا تھا۔ لکڑی کی ایک فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ بہت اچھا کام تھا۔

فیکٹری کا نام سن کر شاید آپ کے ذہن میں بہت بڑی بلڈنگ اور سینکڑوں لوگوں کا کام آ رہا ہو، تو ایسی کوئی بات نہیں ہوتی ۔ یہاں فیکٹریاں دس دس مرلے کے احاطے میں بھی ہوتی ہیں اور چار پانچ آدمی کام کرتے ہیں ۔ یورپ میں بہت بڑی بڑی فیکٹریاں بھی ہوتی ہیں جس میں ہزاروں آدمی کام کرتے ہیں اور سینکڑوں چھوٹی چھوٹی فیکٹریاں بھی ہوتی ہیں جن میں صرف دو آدمی ہی کام کرتے ہیں ۔ یہاں فیکٹری کے مالک کو اس کا ہمسایہ بھی نہیں جانتا ہوتا ہے جبکہ پاکستان میں تو پورا شہر ہی فیکٹری مالکوں کو جانتا ہے اور ان کی خوشامد بھی کرتا رہتا ہے۔

تقریباً ایک ہفتے تک مسلسل گھر میں فارغ بیٹھنے کے بعد مجھے گاڑیاں دھونے کا کام مل گیا۔ صبح دس بجے سے رات آٹھ بجے تک 10 گھنٹے کی ڈیوٹی تھی ۔ ہفتے میں 3 دن ویک اینڈ کی صبح رش ہوتا تھا جبکہ باقی کے دنوں میں نارمل کام ہوتا تھا۔ یہاں چھٹی اتوار کی بجائے منگل کو ہوتی تھی ۔ گھر میں 9 کی بجائے ہم 12 لڑکے ہو گئے تھے کیونکہ 3 لڑکے مزید آ گئے تھے ۔ خلیل کا ایک کزن بھی آ گیا تھا جو کہ صرف چودہ سال کا تھا اور ساہووالہ کے نزدیک بلو چک کا رہنے والا تھا۔ پورے یونان میں پہلا چودہ سالہ بچہ تھا جو ڈنکی لگا کر پاکستان سے یونان دو مہینے میں پہنچا تھا۔ پورے ایتھنز شہر سے پاکستانی لڑکے سپیشل اس کو دیکھنے کے لئے آتے تھے۔ 30 کلوگرام سے بھی کم وزن کا معصوم سی شکل وصورت والا بچہ جو شکل سے بارہ سال کا بھی نہیں لگتا تھا۔

وقاص باجوہ پہلا بچہ تھا جس نے باقی پاکستانیوں کو نیا راستہ دکھایا تھا اور یہ لوگ اپنے چھوٹے بھائیوں اور بچوں کو پاکستان سے یونان بلانے کے لئے تیار ہونے لگے تھے ۔ 2007ء میں جو بھی پاکستانی ایتھنز میں رہا ہے اسے وقاص کا ضرور پتہ ہوگا۔ اس وقاص نے دوسرے بچوں کا راستہ بنایا تھا اور اس کے بعد دوسرے بچے بھی ڈنکی سے یونان پہنچنے لگے تھے ۔ لوگ اسے دیکھتے تھے تو سوچتے تھے کہ جب یہ بچہ ڈنکی لگا کر یونان پہنچ سکتا ہے تو ہمارے بچے بھی یونان آ سکتے ہیں ۔۔۔ اور پھر دوسرے بچے بھی یونان آئے ۔ وقاص کی عمر کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ اسے 2007ء میں اسٹے کارڈ (ریڈ کارڈ) بغیر فنگر پرنٹ کے ملا تھا۔ وقاص بعد میں میرے ساتھ ہی یونان سے جرمنی پہنچا تھا۔ ابھی اس کی عمر چوبیس سال ہے اور اسکے پاس آج بھی بغیر فنگر پرنٹ کے 2007ء کا یونانی اسٹے کارڈ موجود ہے۔

میں ایک بار پھر کام پر جانے لگا تھا۔ دوسرے لڑکوں کے اصرار پر میں نے ایک موبائل بھی لے لیا تھا۔

یہ نوکیا کا 1600 موبائل تھا۔سمارٹ فون کا زمانہ ابھی نہیں آیا تھا۔ ہاں! نوکیا کا N95 مارکیٹ میں آ گیا تھا اوراس موبائل نے کافی دھوم مچا رکھی تھی ۔ N95 میں میموری کارڈ لگتا تھا اور یہ آڈیو اور ویڈیو گانے چلاتا تھا۔ یہ اس زمانے کا آئی فون تھا اوراس کی قیمت 500 یورو سے زیادہ تھی ۔ ہمارے گھر میں یہ موبائل شفاقت بھائی لے کر آئے تھے اور میرے علاوہ پورا گھر ہی ان کے موبائل کو رشک کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ کیونکہ مجھے موبائل اور فلموں سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ مجھے کام سے چھٹی رات کو آٹھ بجے ہوتی تھی اور گھر میں دیر سے پہنچتا تھا۔ ہفتے کو ویک اینڈ ہوتا تھا اس لئے کام کا بہت رش ہوتا تھا۔ ہمیں رات 9 سے زیادہ ہو جاتے تھے۔ میں کام سے چھٹی کر کے تقریباً ساڑھے نو بجے گھر پہنچا تو سارے گھر والے میرے ہی انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔

''راضی! تم گھر سے لڑ کر آئے تھے؟'' خلیل مجھے گھر میں داخل ہوتے ہی کھڑا ہو گیا تھا۔

''تمہارے گھر میں کسی کو پتہ نہیں ہے کہ تم یونان پہنچ گئے ہو اور پچھلے ایک سال سے تم نے اپنے گھر میں ایک روپیہ بھی نہیں بھیجا ہے؟ یہ سارا پیسہ کدھر ہے؟ کہاں خرچ کرتے ہو؟'' خلیل نے مجھے غصے سے گھورتے ہوئے کہا۔

''بھائی! میرے گھر میں فون نہیں تھا اسی وجہ سے کسی کو پتہ نہیں ہے۔خط میں نے لکھے تھے لیکن شاید نہیں پہنچ سکے۔۔۔اور پیسے بھی میرے پاس ہیں۔'' میں باتھ روم کی طرف کپڑے بدلنے کے لئے جانے لگا تو اس نے میرا بازو پکڑ لیا۔

''راضی صاحب! تمہارے گھر میں موبائل بھی ہے اور وہ تمہاری خیریت کی خبر کے لئے ترس بھی رہے تھے۔ میں تو تم کو بہت شریف اور اچھا انسان سمجھتا تھا لیکن تم سے زیادہ گھٹیا اور بے غیرت لڑکا میں نے آج تک نہیں دیکھا۔'' اس نے مجھے گریبان سے پکڑ لیا۔

''پتہ ہے تمہارے ماں باپ اور بہن بھائیوں کو آج میں نے روتے ہوئے سنا ہے؟ وہ لوگ تمہاری خیریت کی خبر کے لئے پچھلے دو سال سے ترس رہے ہیں اور کسی کو کوئی خبر نہیں کہ تم مر گئے ہو یا زندہ ہو؟ اور تم یہاں پتہ نہیں کونسی عاشقیاں پال رہے ہو۔۔۔ پاکستان کس کو پیسے بھیج رہے ہو؟ پچھلے ڈیڑھ سال کی کمائی برباد کر کے رکھ دی ہے تم نے۔۔۔'' وہ غصے سے مجھے جھنجھوڑ رہا تھا۔

آج دن کو خلیل کے والد کسی کی فوتگی پر میرے نانا کے گاؤں گئے تھے۔ خلیل اکثر میرا ذکر اپنے والد سے کرتے رہتے تھے۔ خلیل کے والد کی میرے نانا سے گپ شپ ہوئی تو باتوں باتوں میں کہیں میرا ذکر بھی آ گیا اور پھر مزید تفصیل سے ان کو شک پڑ گیا۔ شاید میں ہی اصل میں ان کا نورِ نظر ہوں اور انہوں نے فوراً خلیل کو فون کر دیا۔ خلیل میرا نام پتہ سب جانتا تھا۔ اس کے پاس میرے ریڈ کارڈ کی فوٹو کاپی بھی تھی جس پر میرا بہاولپور کا ایڈریس بھی لکھا ہوا تھا۔ اس نے بہاولپور کے گاؤں کا بتایا تو میرے نانا کو پتہ چل گیا۔ انہوں نے فوراً بہاولپور کال ملائی اور پھر خلیل کی بات میرے گھر والوں سے ہو گئی تھی۔

''خلیل بھائی! میں نے کسی کو پاکستان پیسے نہیں بھیجے ہیں۔ وہ میرے بینک اکاؤنٹ میں پڑے ہوئے ہیں سارے کے سارے۔۔۔ میں نے آپ کو بولا تھا نا کہ میں امریکہ جانے کی کوشش کر رہا ہوں؟ یہ پیسے میں امریکہ جانے کے لئے اکٹھے کر رہا ہوں۔'' میں نے زمین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ میرا گریبان ابھی تک خلیل کے ہاتھ میں تھا۔

''ٹھیک ہے تو پھر اپنے گھر بات کیوں نہیں کی ان کو اپنی خیریت کی اطلاع تو دے سکتے تھے نا؟'' خلیل کا غصہ ابھی تک کم نہیں ہوا تھا۔

''اس لئے کہ میں اپنے گھر فون نہیں کرنا چاہتا، میں کوئی رابطہ نہیں رکھنا چاہتا اور جن عاشقیوں کی آپ بات کر رہے ہو نا خلیل بھائی! اس عاشقی کے لئے اگر میں اپنے گھر کو اپنے ماں باپ کو چھوڑ سکتا ہوں نا تو پھر اس گھر کو بھی چھوڑ سکتا ہوں۔ پچھلے ڈیڑھ سال سے بیڈ پر سو رہا ہوں لیکن سڑک پر سونا ابھی بھولا نہیں ہوں۔ محبت کے دور ہو جانے سے محبت کم نہیں ہو جاتی خلیل بھائی!'' میں نے آہستگی سے خلیل سے اپنا گریبان چھڑوایا اور باتھ روم میں گھس گیا۔ میں باتھ روم سے کپڑے تبدیل کر کے باہر آیا تب تک خلیل میرے گھر فون کر چکا تھا۔

''راضی! تمہارے والد کا فون ہے ان سے بات کر لو۔'' اس نے میری طرف موبائل فون بڑھاتے ہوئے کہا۔

''خلیل بھائی! میں نے اپنے گھر بات نہیں کرنی ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"کیا۔۔۔؟ کیا کہہ رہے ہو؟ مجھے تمہاری بات کی سمجھ نہیں آئی ہے؟" اس نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔اسے واقعی میری گھر بات نہ کرنے کی سمجھ نہیں آئی تھی۔

"خلیل بھائی! آپ بہت اچھے ہو اور میں آپ کی عزت بھی کرتا ہوں لیکن پلیز! مجھے مجبور مت کرو۔ میرا دل نہیں مانتا اپنے گھر بات کرنے کے لئے، اگر آپ مجبور کرو گے تو میں یہ گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا اور خاموشی سے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

میرے گھر والوں کی ان سے کیا بات ہوئی مجھے اس کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ ویسے بھی میں ان سب چیزوں سے دور رہنا چاہتا تھا۔ مجھے گھر بات کرنے میں کوئی اعتراض نہیں تھا بلکہ میں صرف غیر ضروری پرابلم سے بچنا چاہتا تھا۔ ماں باپ اور بہن بھائیوں کی محبتیں آپ کا راستہ روک لیتی ہیں۔ میں ان سے بچ کر آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ میں نے سی ڈی آن کی اور ایک پرانی فلم دیکھنے لگا۔تھوڑی دیر بعد خلیل بھی میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

"راضی یار! مجھے تمہارے ماضی کا کوئی پتہ نہیں ہے۔تمہارے والد نے ابھی کچھ باتیں بتائی تو ہیں اور انہی سے تھوڑا اندازہ ضرور ہوا ہے۔تمہارے ساتھ بہت بڑی زیادتی ہوئی تھی یار! ساری دنیا ہی محبت کرتی ہے اور ساری دنیا ہی محبت کے مخالف ہوتی ہے لیکن اتنا غصہ اور اتنی نفرت نہیں پالتے جو اس نفرت کو کم کرنے کے لئے تمہارے باپ کو معافی مانگنی پڑے۔ یار! باپ باپ ہی ہوتا ہے اور جب ایک باپ اپنے بیٹے سے معافی مانگتا ہے نا تو ایک بیٹے کو معاف کر دینا چاہئے۔لوگ تو قتل بھی معاف کر دیتے ہیں۔تمہارے باپ سے ایسی کونسی غلطی ہو گئی تھی جس کی سزا تم اپنے پورے خاندان کو دے رہے ہو؟" خلیل نے ٹی وی کی آواز تھوڑی کم کر دی۔سارے لڑکے اس وقت اکٹھے ہو گئے تھے اور وہ میری طرف دیکھ رہے تھے۔

"خلیل بھائی! بات معاف کرنے یا نہ کرنے کی نہیں ہے، بس میرا دل ہی نہیں کرتا گھر بات کرنے کو۔۔۔ مجھے ماضی یاد آنا شروع ہو جاتا ہے اور میں اس ماضی سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہوں۔ میں بہت کمزور ہوں اور ماضی کی یادیں مجھے توڑنا شروع کر دیتی ہے۔خلیل بھائی! اسلام میں اگر خودکشی حرام نہ ہوتی تو میں کب کا مر چکا ہوتا۔ میں زندہ ہوں اور جینے کی کوشش کر رہا ہوں تاکہ قیامت کے دن خدا سے اپنے محبوب کا ہاتھ مانگ سکوں۔محبتیں اتنی آسانی سے کہاں ملتی ہیں۔۔۔ اگر مر جانے سے محبتیں حاصل ہوتی ہوں نا تو دنیا

کا ہر عاشق ہی مر جائے۔ کوئی رانجھا نہ ہو کوئی ہیر نہ ہو۔ اس کے لئے محنت کرنا پڑتی ہے۔ محبوب کو بھی منانا پڑتا ہے اور خدا کو بھی۔ خلیل بھائی! مجھے کسی سے نفرت نہیں ہے، مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ میں صرف اپنے محبوب کو راضی کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ محبت کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' میری آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے اور میں خلیل کے کندھے پر سر رکھ کر رونے لگا۔

''خلیل بھائی! شکر کرو جو محبت کا روگ نہیں لگا ہے آپ کو، یہ محبت کاٹ کر رکھ دیتی ہے۔ بہت درد دیتی ہے۔ یہ محبت۔۔۔آپ اس کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔'' میں خلیل کے کندھے پر سر رکھے مسلسل رو رہا تھا۔

''بھائی! محبت تو ہم نے بھی کی ہے، آپ سے۔۔۔انتہائی ٹوٹ کر۔۔۔پھر آپ کی محبت اور ہماری چاہت کیا؟'' مجھے خلیل کی سامنے والی جیب میں پڑے موبائل کے سپیکر سے ارم کی آواز سنائی دی۔ خلیل نے میرے پاس بیٹھنے سے پہلے لاؤڈ سپیکر پر کال لگا کر موبائل جیب میں ڈال لیا تھا اور میری ساری باتیں گھر والے سن رہے تھے۔

''بھائی! اپنی اس محبت میں کبھی ہمارا بھی سوچا ہے؟ پچھلے دو سال سے کبھی ایک بار بھی ذہن میں یہ بات آئی ہے کہ پیچھے بہاولپور میں تمہاری ایک چھوٹی بہن بھی ہے جو تم سے بہت محبت کرتی ہے؟ کبھی ایک بار بھی مجھ سے بات کرنے کو دل نہیں کیا بھائی؟ خدا اور قیامت کی بہت باتیں کرتے ہو۔۔۔ایک بار قیامت آنے تو دو!'' مجھے ارم کی رونے کی آواز آ رہی تھی۔ خلیل نے موبائل جیب سے باہر نکال لیا۔

''ارم۔۔۔!'' مجھ سے مزید بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔ موبائل میرے ہاتھ میں کانپنے لگا۔

''ارم کیسی ہو؟ امی کا کیا حال ہے؟'' میں نے آہستہ سے کہا۔ ارم کی آواز کے اچانک جھٹکے سے اب میں سنبھل گیا تھا۔

''جی بھائی! سارے گھر والے ٹھیک ہیں۔ امی بہت اداس رہتی ہے۔ بھائی! آپ کا دکھ امی کو کھا گیا ہے۔ ان کی نظر بھی کمزور ہو گئی ہے۔'' ارم ایک بار پھر رونے لگی تھی۔

''بھائی! آپ ٹھیک تو ہو نا؟ یونان کیسے پہنچ گئے؟ واپس آ جاؤ بھائی! صرف تمہارے اکیلے کے جانے سے ہی ہمارا پورا گھر قبرستان بن گیا ہے۔۔۔قسم سے ایک ایک خوشی کو ترس گئے ہیں، واپس آ جاؤ بھائی اور

سب کو بھول کر نئے سرے سے جینے کی کوشش کرو، ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔'' ارم کا کہا ہوا ایک ایک لفظ میرے دماغ میں ہتھوڑے کی طرح لگ رہا تھا۔ میں محبت کے راستے پر چلتا چلتا اپنے گھر کا راستہ بھول گیا تھا۔

''ارم! میں ایمان سے ملا تھا، وہ کراچی میں ہوتی ہے۔ اس نے شادی کر لی ہے اور بہت خوش لگ رہی تھی یا شاید خوش لگنے کی کوشش کر رہی تھی۔ بہت بڑی گاڑی میں آئی تھی، لاکھوں دینے کی بات کر رہی تھی۔'' میں نے ارم کی بات درمیان سے کاٹتے ہوئے کہا۔

''بھائی! آپ ایمان سے ملے تھے، کراچی ہوتی ہے تو کوئی بات نہیں، آپ واپس آ جاؤ! ہم دونوں جائیں گے اسے منانے کے لئے اور اس بار میں اسے گھر لے کر ہی آؤں گی۔ بھائی! شادی کی فکر مت کرو! تم دونوں کی محبت بہت بڑی ہے اور تمہاری خاطر وہ اپنی شادی کو بھی چھوڑ سکتی ہے۔ ہم دونوں اسے گھر لے کر ہی آئیں گے۔'' ارم جلدی جلدی بول رہی تھی۔

''ارم! کراچی بہت بڑا ہے۔ دو کروڑ کی آبادی والے اس شہر میں ہم اسے کہاں تلاش کریں گے؟ مجھے نہیں پتہ وہ کہاں رہتی ہے۔ اگر اس کا پتہ معلوم ہوتا تو یونان نہیں اس کے گھر کے باہر پڑا ہوتا۔ لیکن یار! انسانوں کے سمندر میں وہ پھر کہیں کھو گئی تھی۔ ابھی اس کا خواب پورا کرنا ہے، ایک بار امریکہ جانا ہے۔ امریکہ کے اس خدا کے پاس جانا ہے اور اس مجسمے کے پیروں میں کھڑے ہو کر ایمان کا ہاتھ مانگنا ہے۔ نہیں ارم! میں واپس نہیں آ سکتا۔ مجھے ایک بار امریکہ پہنچ جانے دو، پھر آ جاؤں گا۔'' میری آواز ابھی تک بہت آہستہ تھی۔

''راضی پُتر! تو ٹھیک ہے نا؟'' میری امی کی آواز آئی تو میں بے بسی سے مسکرانے لگا۔ صرف ایک میری وجہ سے میرا پورا گھر برباد ہو گیا تھا۔ ایک چھوٹی سی محبت نے ایک ہنستے بستے گھر کو تباہ کر کے رکھ دیا تھا۔

''جی امی! میں ٹھیک ہوں۔ بس دعا کر دیجئے گا ایک دن سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' میرے ہاتھوں میں ایک بار پھر موبائل کانپنے لگا تھا۔

''بیٹا! ٹھیک تو سب کچھ ہو جاتا ہے وقت کے ساتھ ساتھ ہر زخم بھر جاتا ہے لیکن تب تک ہم دوسرے

زخم کے قابل نہیں رہتے۔ جوانی چلی جاتی ہے اور بڑھاپا زندگی کی ساری رونقیں اور رعنائیاں چھین کر لے جاتا ہے۔ بیٹا! بچپن اور جوانی بہت خوبصورت ہوتی ہے اسے محبت کی بھینٹ مت چڑھاؤ۔ لوٹ آؤ بیٹا! لوٹ آؤ!'' میرے ہاتھ سے موبائل گر گیا اور میں بیڈ پر گرتا چلا گیا۔ میرے چاروں طرف اندھیرا چھیل گیا تھا اور میں اس اندھیری غار میں گرتا چلا جا رہا تھا۔ اچانک میرے منہ پر پانی کے چھینٹے پڑے تو مجھے ہوش آ گئی۔ وقاص میرے چہرے پر جھکا ہوا تھا۔ میں ہوش میں آ گیا اور دوسرے لڑکوں کی طرف دیکھنے لگا۔

دوسرے دن صبح صبح میں نے خلیل سے اپنے گھر کا نمبر لیا اور ایک ہزار یورو اپنے گھر بھیج دیا۔ پیسوں سے محبتیں تو نہیں خریدی جا سکتی تھیں لیکن پھر بھی میرے چند پیسوں سے کچھ پل کے لئے ہی سہی ان کے چہروں پر خوشی تو آئی ہوگی۔ خدا کو شاید میری یہی ادا پسند آ گئی اور مجھے ایک میکسیکو لے جانا والا ایجنٹ مل گیا۔ وہ پاکستانی آدمی تھا جو ہمارے سروس اسٹیشن پر گاڑی دھلوانے کیلئے آیا تھا۔ وہ دس دس ہزار یورو لیکر لڑکوں کو میکسیکو پہنچاتا تھا۔ میکسیکو میں اس کا رابطہ ایک انڈین سردار سے تھا جو پندرہ پندرہ ہزار ڈالر لے کر میکسیکو سے امریکہ پہنچاتا تھا۔ مجھے صرف میکسیکو تک ہی جانا تھا۔ میکسیکو سے امریکہ کے لئے کوئی اور تلاش کر لیتا یا پھر وہیں پر کام کر کے آگے جانے کی کوشش کرتا رہتا۔ میں نے اس سے میکسیکو کی بات کی۔

10 ہزار یورو گارنٹی کے طور پر مجھے ایک پاکستانی دکان دار کو دینے تھے جو کہ کامیابی کی صورت میں گارنٹی کا 500 یورو لیتا تھا۔ ناکام ہونے پر وہ پورے پیسے واپس کر دیتا تھا اور کوئی کمیشن نہیں لیتا تھا۔ اگر میں میکسیکو پہنچ جاتا تو میرا ایجنٹ اس دکان دار سے ساڑھے نو ہزار یورو لے لیتا۔ 500 یورو کی کمیشن ایجنٹ ہی دیتا ہے۔ یونان میں ہر قسم کی گیمیں (اٹلی، سپین، جرمنی) گارنٹی پر ہی ہوتی ہیں۔ ایتھنز کے اندر دس بارہ دکاندار یہ کام کرتے ہیں اور مکمل اعتماد کا کام ہوتا ہے۔ آپ 10 ہزار کی بجائے ایک لاکھ بھی جمع کروا دیں پھر بھی یہ دکان دار دھوکہ نہیں کرتے کیونکہ ان کا اعتماد ہی کاروبار ہوتا ہے۔ اگر یہ کسی لڑکے کی گارنٹی کھا جائیں تو پھر کوئی بھی ان کے ساتھ کام نہیں کرتا۔ اس طرح دکان دار کا نام خراب ہو جاتا ہے۔

یہ دکاندار دکان سے زیادہ پیسہ گارنٹیوں سے کما لیتے تھے اور کاروبار کے لئے ان کے پاس پیسہ بھی بہت ہوتا تھا۔ یہ لوگ اسی پیسے پر سود کا کاروبار بھی کرتے تھے۔ پیسے کی کمی نہیں تھی۔ ایک گارنٹی جاتی تھی تو دو اور آ جاتی تھیں۔ میں نے اگلے دن ہی کام سے جواب دیا اور 10 ہزار یورو گارنٹی پر امونیا میں ایک دکان دار کو

دے دیا۔ یہ دکان دار سیالکوٹ کا رہنے والا تھا اور خلیل بھائی کی برادری کا تھا۔ ایجنٹ نے امونیا سے ایک پاکستانی پاسپورٹ کو پی سی کروایا۔ یہ اوریجنل پاسپورٹ ہوتا ہے جس پر یونان اور میکسیکو کا ویزہ لگا ہوتا ہے۔ پی سی کرنے والے پاسپورٹ سے اوریجنل تصویر نکال کر آپ کی تصویر لگا دیتے ہیں۔ اب یہ پاسپورٹ تصویر کے علاوہ بالکل اصل ہوتا ہے اور اس کے اوپر ویزے بھی اوریجنل ہوتے ہیں۔

امیگریشن کا عملہ زیادہ تر ویزے کے اصل اور نقل ہونے پر دھیان دیتا ہے۔ اس میں جہاز پر چڑھ جانے کے چانس 25 فیصد سے کم ہی ہوتے ہیں لیکن ایجنٹ کے لئے یہ بھی بہت ہوتا ہے۔ ایجنٹ کا ٹوٹل خرچہ پانچ سو یورو کے قریب ہوجاتا ہے۔ اگر سوار ہوگئے تو پورے 9 ہزار کی بچت ہوتی ہے اور اگر پکڑے گئے تو پانچ سو یورو ڈوب جاتا ہے۔ پاسپورٹ کی چوری کی رپورٹ ہوجاتی ہے اور پاسپورٹ واپس مل جاتا ہے۔ جس کو وہ چار پانچ مہینے استعمال نہیں کرتے اس کے بعد پھر استعمال شروع ہوجاتا ہے۔ لڑکوں کو غیر قانونی طریقے سے سفر کرنے پر ایک سے تین مہینے کی سزا ہوتی ہے۔ وہ بھی 100 میں سے کسی ایک لڑکے کو ہی۔۔۔ زیادہ تر لڑکوں کو ائیر پورٹ سے ہی چھوڑ دیا جاتا ہے جو کہ دوسری پھر تیسری ٹرائی کرتا ہے۔ سوار ہو گیا تو ٹھیک ورنہ پیسے واپس ہوجاتے ہیں۔

یہ یونان سے پورے یورپ اور میکسیکو کی بائی ائیر گیم ہوتی ہے۔ بائی ائیر ایجنٹ نے مجھے پاسپورٹ، رینودس اور میکسیکو کے شہر ہرموسیلو (Hermosillo) کی ٹکٹیں پکڑا دیں۔ ہرموسیلو سے امریکی بارڈر 300 کلومیٹر کے قریب ہے۔ اسے امریکی ریاست اری ڈونا (ARIZONA) لگتی ہے۔ اور اری زونا کی پہچان کے لئے گرینڈ کینن ہی کافی ہے۔ 446 کلومیٹر لمبا اور 29 کلومیٹر چوڑا یہ آبی درہ 1857 میٹر گہرا ہے۔ تقریباً دو کلومیٹر گہرے اس سلسلے کو دیکھ کر انسان خدا کی عظمت کا قائل ہوجاتا ہے۔

ایتھنز کے مرکزی ائیر پورٹ سے جانا بہت مشکل تھا کیونکہ یہاں بہت سختی ہوتی تھی۔ جبکہ یونان کے جزیروں سے کام آسان تھا۔ سیاحوں کے لئے یونان کے جزیرے کشش رکھتے تھے اور ان کی آمد بھی انہی جزیروں پر ہی ہوتی تھی۔ سیاحوں کی وجہ سے امیگریشن کا عملہ بھی زیادہ سختی نہیں کرتا تھا۔ یونان کی آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ سیاحت تھی اور یونانی گورنمنٹ ان سیاحوں کو پریشان نہیں کرتی تھی۔

میں نے ایجنٹ سے ٹکٹیں اور پاسپورٹ لئے اور پیریا سے رینودس جانے والے شپ پر بیٹھ گیا۔

رینوڈس پیریا سے 440 کلومیٹر دور ہے۔ یہاں سے بلیو سٹار فیریز کا شپ نکلتا جو راستے میں آنے والے جزیروں پر رکتا ہوا 14 گھنٹوں میں رہوڈس پہنچ جاتا تھا۔ یہی شپ کوس سے ہو کر جاتا تھا۔ میں 10 بجے شپ پر سوار ہوا تھا اور اس نے مجھے دوسرے دن 12 بجے رہوڈس اتار دیا۔ یہاں سے شپ کریتی (KRITI) اور سائیرس (قبرص) جاتے ہیں۔ ترکی صرف 20 کلومیٹر دور ہے اور چھوٹی تیریاں ترکی بھی جاتی ہیں۔

میری ٹکٹ رات کو گیارہ بجے کی تھی اور ابھی دن کے بارہ بجے تھے۔ میں ایک پارک کے بنچ پر بیٹھ گیا۔ میری پچھلی طرف ایک بہت بڑا قلعہ تھا اور اس سے نیچے سمندر۔۔۔ قلعے کی دیوار سے ڈائریکٹ سمندر لگتا تھا۔ یونان کے اندر پارکوں کی کمی نہیں ہے۔ یہاں پر جگہ جگہ پارک بنے ہوئے ہیں۔ پارک پاکستانی سٹائل کے نہیں ہوتے، بڑے بڑے گھاس کے گراؤنڈ اور فوارے۔۔۔ یہ درختوں سے گھرا ہوا پارک تھا۔ جس کے بیچو بیچ ایک چھوٹا سا جوگنگ ٹریک بنا ہوا تھا۔ جوگنگ کرتے ہوئے آپ کو ایک طرف جنگل اور دوسری طرف قلعہ نظر آئے گا جس کی دیواروں سے پرے گہرا نیلا سمندر نظر آ رہا ہوتا ہے۔ صبح صبح جوگنگ کرتے ہوئے آپ کو جنگل اور سمندر اکٹھے دیکھنے کا مزا آئے گا اور قلعے تو ہمیشہ ہی لوگوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔

میرے پاس ٹائم بہت تھا اور اس لئے میں نے آرام سے بنچ کی پشت سے سر ٹکایا اور آنکھیں بند کر لیں۔ رات کو 9 بجے کے قریب میں اٹھا اور پارک سے باہر نکل کر ائیر پورٹ کی طرف جانے والی بس پکڑ لی۔ بس نے صرف آدھے گھنٹے میں ہی مجھے ائیر پورٹ اتار دیا۔ میکسیکو جانے والے جہاز کی امیگریشن 9 بجے شروع ہو جاتی تھی اور ساڑھے دس بجے تک ختم ہو جاتی تھی۔ پھر اس کے بعد بورڈنگ شروع ہو جاتی تھی۔ ایجنٹ نے مجھے سوا دس بجے امیگریشن کروانے کا کہا تھا۔ اس وقت جہاز کی روانگی کا ٹائم ہو رہا ہوتا ہے اس لئے امیگریشن کا عملہ جلدی میں ہوتا ہے۔ امیگریشن کے بعد بورڈنگ آسان ہوتی ہے۔ امیگریشن اگر کلیئر ہو جائے تو بورڈنگ پاس مل جاتا ہے۔ اس کے بعد آپ اڑنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ میں ائیر پورٹ سے باہر مہمان خانے میں بیٹھ گیا۔

ٹھیک سوا دس بجے میں اٹھا اور میکسیکو کے شہر ہرموسیلو (HERMOSILLO) کے کاؤنٹر کے آگے لگی قطار میں کھڑا ہو گیا۔ یہاں پر مجھ سے آگے دس بارہ افراد اور تھے جو امیگریشن کروا رہے تھے۔ تھوڑی دیر تک کچھ مزید افراد مجھ سے پیچھے آ کر کھڑے ہو گئے۔ یونان یورپی یونین کا ملک تھا اور اس کے مقابلے

میں میکسیکو غریب ملک تھا اس لئے امیگریشن انتہائی نارمل تھی اور زیادہ سختی نہیں تھی۔ کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھا ہوا عملہ پاسپورٹ اور ٹکٹ دیکھتا تھا۔ ایک دوسوال کرتا اور کلئیر کر دیتا۔ یہ لوگ دو دو منٹ میں ہی مسافروں کو کلئیر کر رہے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر سیاح تھے جو یونان میں چھٹیاں گزار کر واپس جا رہے تھے۔

تقریباً پندرہ منٹ تک میری باری آ گئی تو میں نے کاؤنٹر پر موجود لڑکی کو ہیلو کہا اور اپنا پاسپورٹ اور ٹکٹ اس کو پکڑا دیا۔ اس نے ایک نظر میرے پاسپورٹ کی طرف دیکھا اور ساتھ پڑے ہوئے ٹیلی فون کا کریڈل اٹھا کر ایک ہندسہ دبایا اور واپس رکھ دیا۔

”آپ ایک سائیڈ پر ہو جائیں اور پیچھے والوں کو آگے آنے دیں! دو منٹ تک میں دیکھتی ہوں۔“ لیڈی نے مجھے انگلش میں کہا اور میں ایک سائیڈ پر ہو کر کھڑا ہو گیا۔

مجھ سے پیچھے والے اپنی امیگریشن کروانے والے سب لوگ میری طرف عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے اور میں ان لوگوں کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ لوگ امریکہ تو نہیں جا رہے تھے بلکہ زیادہ تر میکسیکو کے شہری ہی تھے۔ امریکہ کے ہمسائے۔۔۔ امریکہ سے چلنے والی ہوائیں ان کے بالوں کو تو اڑاتی ہوں گی۔ امریکہ سے آنے والی ٹھنڈی ہوائیں ان کے گالوں کو بھی تو ٹھنڈک پہنچاتی ہوں گی اور ان میں سے اکثر لوگوں نے تو امریکہ دیکھا بھی ہو گا۔

میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ سات آٹھ پولیس والے ہمارے کاؤنٹر پر آ دھمکے۔ یہ سارے سادہ کپڑوں میں ملبوس تھے لیکن ان کے انداز واطوار سے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ پولیس والے ہیں۔ انہوں نے آتے ہی کاؤنٹر پر موجود لڑکی سے پوچھا تو لڑکی نے میرا پاسپورٹ اور ٹکٹ ایک پولیس والے کے حوالے کر دیا اور میری طرف اشارہ کیا۔ پولیس والوں نے میرے کاغذات پکڑے اور مجھے بازو سے پکڑ کر اپنے ساتھ لے گئے۔

یہاں ائیر پورٹ پر پولیس والے وردی میں گرفتار نہیں کرتے ہیں بلکہ زیادہ تر سادہ کپڑوں والے اہلکار ہی ہوتے ہیں۔ وردی کی وجہ سے تھوڑا سا خوف محسوس ہوتا ہے اور سیاح اچھا محسوس نہیں کرتے تھے۔ یہاں ائیر پورٹ کی ہی دوسری منزل پر ایک پولیس تھانہ تھا۔ سادہ کپڑوں والے اہلکار مجھے وہاں لے گئے۔ انہوں نے مجھے انکوائری روم میں بٹھایا اور مجھ سے پوچھ گچھ کرنے لگے۔ بالکل فلمی سا ماحول لگ رہا تھا شاید

انہوں نے بہت زیادہ فلمیں دیکھ رکھی تھیں یا پھر فلمیں ہی حقیقت پر مبنی ہوتی ہیں۔ میں ٹیبل کی ایک طرف بیٹھا ہوا انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں انہیں بول رہا تھا کہ آپ دونوں ویزے چیک کرلو، یونان کا بھی اور میکسیکو کا بھی لیکن وہ ماننے کے لیے تیار ہی نہیں ہو رہے تھے اور ویزے کو دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کر رہے تھے۔ وہ مجھے منانے کی کوشش کر رہے تھے کہ میں چپ چاپ مان جاؤں کہ میرے پاس پاسپورٹ دونمبر ہے اور خاموشی سے پاسپورٹ لیکر واپس چلا جاؤں۔ وہ مجھے میکسیکو جانے کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔

''سر! آپ زیادتی کر رہے ہیں۔۔۔ میرا پاسپورٹ اور ویزہ آپ کے سامنے ہے، آپ چیک کرنا چاہیں تو بے شک کریں۔ میں دونمبر نہیں ہوں اور مجھے کسی چیز کا ڈر بھی نہیں ہے۔ میرے پاس سارے کاغذات اصل ہیں۔'' میں نے نڈر لہجے میں کہا۔

''اے! بکواس بند کرو! کونسے اصل کاغذات؟ ایتھنز میں دوسو یورو میں تمہارا یہ پاسپورٹ بن جاتا ہے جس کے اوپر تم اکڑ دکھا رہے ہو۔ پولیس والے ہیں، روزانہ پتہ نہیں کتنے بے وقوفوں سے واسطہ پڑتا ہے۔'' ایک پولیس والے نے آگے بڑھ کر میرے منہ پر تھپڑ مارتے ہوئے کہا۔

یورپین یونین میں پولیس کبھی بھی کسی کو تھپڑ نہیں مارتی ہے۔ اگر کوئی پولیس والا تھپڑ مارتے ہوئے پکڑا جائے تو اسی وقت نوکری سے برخاست ہو جاتا ہے۔ جتنا مرضی بڑا مجرم ہو لیکن پولیس والے کبھی بھی ہاتھ نہیں اٹھاتے۔ ہاں! دھرنے یا احتجاجی مظاہروں کی بات اور ہے۔ مظاہروں کے درمیان پولیس لاٹھی چارج بھی کرتی ہے اور مارتی بھی ہے۔ اس وقت ہجوم کو کنٹرول کرنے کے لیے اجازت ہوتی ہے جس میں آنسو گیس کا استعمال بھی ہوتا ہے۔ لیکن عام نارمل حالات میں شہری جتنی مرضی گالیاں دے رہا ہو ہتھکڑی لگا سکتے ہیں لیکن مار نہیں سکتے۔

آہستہ آہستہ پاکستانی پولیس کا یہ سٹائل یہاں پاکستانیوں پر بھی استعمال ہونا شروع ہو گیا تھا اور اس کی سب سے بڑی وجہ ہم پاکستانیوں کو پولیس والوں سے مار کھانے کی عادت پڑ گئی تھی۔ یہ پولیس والے کسی بھی اور ملک کے آدمی کو تھپڑ مارتے تھے تو آگے سے لڑ پڑتا تھا۔ ایک تھپڑ کی بجائے دس تھپڑ کھاتا تھا اور آگے سے مارتا بھی تھا۔ وہ آدمی تھانے میں بھی جا کر بتاتا تھا اور جج کو بھی۔ انکوائری شروع ہو جاتی تھی تو تھپڑ مارنے والا

پولیس والا اگر پہلی بار بچ بھی جاتا تو دوسری تیسری بار پکڑا جاتا تھا اور نوکری سے اتر جاتا تھا۔ جبکہ ہم پاکستانی یا انڈین مار کھا لیتے تھے۔ اگر کوئی پولیس والا تھپڑ مار دیتا تو چپ کر کے اسے سہہ لیتے تھے۔ یہ چیز ہماری نفسیات میں بیٹھ چکی ہے کہ پولیس والوں کو مارنے کا حق ہے۔ میں پولیس والے کے تھپڑ کے زور سے کرسی سمیت الٹ گیا تھا۔

’’کتنے میں پاسپورٹ خریدا ہے؟ ایجنٹ کون ہے اور کتنے پیسوں میں میکسیکو جا رہے ہو؟‘‘ اس نے مجھے گریبان سے پکڑ کر اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

’’سر! آپ چیک کر سکتے ہیں۔۔۔ میرے پاس اصل کاغذات ہیں۔‘‘ میں ابھی تک اپنی بات پر اڑا ہوا تھا۔

’’دیکھو! آرام سے بتا دو گے تو ہم تم کو جانے دیں گے، ورنہ دو نمبر کاغذات رکھنے کے جرم میں سیدھے جیل جاؤ گے۔‘‘ ایک پولیس والے نے مجھے پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

’’نہیں سر! آپ چیک کر سکتے ہو میں اوریجنل ہوں اور میرے پاس اصل کاغذات ہیں۔ آپ مجھے میکسیکو جانے کی اجازت دے دیں۔‘‘ میں نے اٹک اٹک کر کہا۔ تھپڑ کے زور کی وجہ سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

’’مسٹر محمد سلیم! آپ نے محسوس کیا ہے کہ 400 لوگوں کی فلائیٹ میں سے صرف آپ کو ہی ہم نے کیوں چنا ہے؟ کیونکہ پاکستانی پاسپورٹ کی کوئی ویلیو نہیں ہے۔ کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھے ہوئے امیگریشن عملے کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ پاکستانی پاسپورٹ کو کلیئر کریں۔ آپ کے پاسپورٹ کو ہم کلیئر کر کے دیتے ہیں اور پھر امیگریشن والے بورڈنگ پاس دیتے ہیں، کیوں؟ کیونکہ آپ دو نمبر ہو۔۔۔ آپ کا چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا افسر سب پیسہ لیتے ہو اور کام کرتے ہو۔ ہمیں معلوم ہے یہ پاسپورٹ بھی دو تین سو روپے کا بنوا کر لاتے ہو اور اس کے اوپر موجود سارے ویزے جعلی ہوں گے۔‘‘ انہوں نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔ میں مسلسل مزاحمت کرتا رہا یہاں تک کہ جہاز کی روانگی کا وقت ہو گیا اور جہاز چلا گیا۔

’’ٹھیک ہے سر! مجھے پاسپورٹ واپس کر دیں میں واپس چلا جاتا ہوں۔‘‘

جہاز اڑان بھر چکا تھا۔ اگر وہ مجھے پاسپورٹ واپس کر دیتے تو میں کسی دوسرے جزیرے سے ٹرائی کر سکتا تھا مگر انہوں نے مجھے پاسپورٹ واپس نہیں کیا اور مجھے باہر لے گئے اور دروازہ بند کر دیا۔ میں انکوائری روم میں کرسی پر بیٹھا سوچتا رہا۔ وہ پاسپورٹ کو چیک کرنے کے لیے لے گئے۔ مجھے معلوم تھا پاسپورٹ اصل ہے اور ویزے بھی اصل تھے لیکن میں غلط سوچ رہا تھا۔ پاسپورٹ بھی دو نمبر تھا اور اس کے اوپر لگے ہوئے ویزے بھی جعلی تھے۔ ایجنٹ نے مجھ سے دھوکہ کیا تھا اور ساری چیزیں دو نمبر بنوا کر دیں تھیں۔ اگر میکسیکو پہنچ جاتا تو 10 ہزار ڈالر کما لیتا ورنہ 500 کا نقصان۔۔۔

''مسٹر محمد سلیم! آپ کے تمام کاغذات دو نمبر نکلے ہیں۔ اب آپ کیا کہتے ہو؟'' ایک پولیس افسر نے میرے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس کے ساتھ دو اور پولیس والے بھی آئے تھے۔ مجھے یہاں بیٹھے ہوئے آدھے گھنٹے سے زیادہ ہو گیا تھا اور وہ مکمل انکوائری کر کے آئے تھے۔

''سوری سر! مجھ سے غلطی ہو گئی ہے، مجھے معاف کر دیں۔'' میں نے صاف الفاظ میں معافی مانگتے ہوئے کہا۔

''نہیں! معاف کرنے کا اختیار مجھے نہیں بلکہ جج کو ہے، اس کی مرضی ہوگی تو معاف کر دے گا۔ آپ نے غلط کام کیا ہے تو اس کی سزا دینے کا اختیار ہماری عدالت کو ہے۔ آپ کدھر سے آئے ہو؟'' اس نے قلم اٹھا لیا۔

میں نے اسے ایتھنز کا بتایا (کیونکہ سارے لڑکے ایتھنز سے ہی آتے تھے) اور نام وہی محمد سلیم ہی بتایا۔ اس نے خاموشی سے نام لکھا اور باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد دو پولیس والے اندر آئے، انہوں نے مجھے ہتھکڑی پہنائی اور ائیر پورٹ سے باہر کھڑی پولیس جیپ میں بٹھا دیا۔ پولیس جیپ مجھے لیکر جلد ہی تھانے آ گئی۔ تھانے پہنچ کر انہوں نے میری تلاشی لی اور لاک اپ میں بند کر دیا۔ میں نے موبائل سے اپنے گھر ایتھنز میں اطلاع کر دی تھی۔

تھانے میں تلاشی کے دوران آپ کی چیزیں نہیں رکھتے بلکہ یہ آپ کو واپس کر دیتے ہیں۔ کچھ تھانوں میں موبائل لے لیتے ہیں لیکن زیادہ تر تھانوں میں موبائل بھی نہیں رکھتے۔ البتہ جب آپ کو سزا ہو جاتی ہے اور آپ جیل جاتے ہو تو پھر سارا سامان جیل کا عملہ اپنی تحویل میں لے لیتا ہے اور سزا ختم ہونے پر آپ کو

واپس کر دیا جاتا ہے۔جیل کے اندر موبائل رکھنے کی اجازت نہیں ہوتی۔

خلیل بھائی میرے گھر پاکستان میں فون کر کے بتانے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن میں نے منع کر دیا۔ میں بلا وجہ اپنے گھر والوں کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ پہلے ہی میری وجہ سے وہ بے چارے بہت دکھی تھے۔میں ان کے دکھوں میں مزید اضافہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مجھے یہاں اس تھانے میں دو دن رکھا گیا اور اس کے بعد ایک پولیس والا میرے کمرے کے پاس آیا۔ اس نے میرا نام پکارا تو میں سامنے آ گیا۔ یہاں کمرے میں میرے علاوہ مزید پندرہ سولہ اور لڑکے بھی تھے اور تقریباً سب کا کیس ایک جیسا ہی تھا۔ وہ سب اٹلی یا سپین جانا چاہتے تھے جن میں سے چار لڑکے جرمنی والے بھی تھے۔ میں اکیلا میکسیکو والا تھا۔

''رضوان علی! آپ کو ایک مہینے کی سزا ہوئی ہے۔کل صبح آپ کو شپ کے ذریعے ایتھنز پہنچایا جائے گا۔آپ اپنی ایک مہینے کی سزا ایتھنز میں ہی پوری کرو گے۔'' انہوں نے میرے فنگر پرنٹ لیے تھے اور میری انگلیوں کے نشانات سے میری پہچان ہو گئی تھی۔

''اگر آپ اپنی سزا خریدنا چاہتے ہو تو خرید سکتے ہو۔'' اس نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

یورپ میں یہ قانون تھا کہ آپ اگر سزا نہیں کاٹنا چاہتے ہو تو پیسے ادا کر کے باہر آ سکتے ہو۔ یہ ہر سزا کے لیے نہیں ہوتا۔ بڑے جرموں کے لیے سزائیں نہیں خریدی جاسکتیں بلکہ یہ جج کے اوپر منحصر ہوتا ہے۔ وہ چاہے تو پوری سزا ہی پیسوں کے عوض خرید سکتے ہو یا پھر آدھی سزا کاٹنے کے بعد سزا خریدنے کی اجازت دے دے۔اس کے بعد آپ کی مرضی ہے آپ کتنی سزا خریدنا چاہتے ہو۔ یہ بہت زیادہ پیسے ہوتے ہیں اور ہم جیسے مہاجرین سزا نہیں خرید سکتے بلکہ جیل کاٹنا ہی پسند کرتے ہیں۔ میں نے بھی انکار کر دیا تو وہ واپس چلا گیا۔ باقی لڑکوں کی سزا کا فیصلہ بھی آ گیا تھا اور وہ سارے ہی میرے ساتھ ایک ایک مہینے کی سزا کاٹنے والے تھے۔

ہم اگلے دن صبح اٹھتے ہی ایتھنز جا رہے تھے۔اس سے اگلے دن صبح ایک بڑی پولیس کی گاڑی میں ہمیں بٹھا کر بندرگاہ پر لایا گیا اور شپ میں بٹھا دیا گیا۔شپ کے اندر ایک چھوٹا سا سیل نما کمرہ تھا جو سب سے اوپری منزل پر تھا۔ پولیس والوں نے ہم سب لڑکوں کو اندر کمرے میں بٹھایا اور دروازہ بند کر کے باہر بیٹھ گئے۔ہم بیس لڑکے تھے اور تقریباً 10 پولیس والے باہر ہماری سیکورٹی کے لیے کھڑے تھے۔ 14 گھنٹے

کے اس واپسی کے سفر میں شپ سات آٹھ جگہ پر رکا تھا۔ باتھ روم وغیرہ جانے کے لیے ہم باہر آتے اور پولیس والا ہمیں ساتھ لیکر باتھ روم چلا جاتا۔شپ پر سفر کرنے والے دوسرے مسافر ہمیں دیکھتے تھے اور پتہ نہیں کیا کیا سوچتے ہوں گے۔شاید سوچتے ہوں گے کہ یونان کیسا ملک ہے جس میں سارے ہی مجرم 18 سے 25 سال کے لڑکے ہوتے ہیں اور سارے ہی ایشیائی ملکوں کے۔۔۔ پولیس والے ہمیں دوسروں سے بات کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے اور جب شپ کسی چھوٹے جزیرے پر کھڑا ہوتا تو تب بھی ہمیں باتھ روم یا باہر جانے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔کھانا وغیرہ ہم نے اپنے پیسوں سے خرید کر کھانا ہوتا تھا۔

شام کو ہم ایتھنز کی بندرگاہ پر پہنچ گئے۔ باہر پولیس کی بڑی گاڑی کھڑی تھی۔ جب سب مسافر شپ سے باہر نکل گئے تو پولیس والوں نے ہمیں پانچ پانچ لڑکوں میں تقسیم کیا اور ایک ایک گروپ کر کے لے جانے لگے۔ جب ہم سب لڑکے پولیس کی گاڑی میں بیٹھ گئے تو گاڑی ہمیں لیکر نیکیا (NIKEA) کی طرف چل پڑی۔ نیکیا کے دوسری طرف کردیلیو (Kardelio) کا علاقہ ہے جہاں بہت بڑی جیل ہے۔ ہماری بس نیکیا سے دس منٹ میں کردیلیو پہنچا دیتی تھی۔ میں اپنے گھر کے بالکل نزدیک آ کر قیدی ہو گیا تھا۔ پولیس والوں نے ہماری تلاشی لی اور ہماری جیبوں میں موجود سارے سامان کو اپنی تحویل میں لیکر اس کی لسٹ بنائی اور ہمیں جیل بھیج دیا گیا۔

یورپ کی جیلیں پاکستانی جیلوں کے مقابلے میں بہت زیادہ اچھی ہوتی ہیں۔ یہاں کی سہولتیں دیکھ کر ہم حیران رہ گئے۔ بالکل گھر جیسا ماحول تھا۔صرف وقت کی پابندی تھی، ہمیں وقت پر اٹھنا اور سونا پڑتا تھا۔ کھانا اور کھیل سب وقت پر ہوتا تھا۔کوئی پاکستانی یا انڈین فلمی سٹائل نہیں ہوتا جس میں اچانک جیلر آتا ہے ایک قیدی کو پکڑتا ہے اور ٹکٹکی باندھ کر کوڑے مروانا شروع کر دیتا ہے۔ ایسا کچھ بھی یہاں نہیں ہوتا تھا۔ یورپ کی کچھ جیلوں میں تو باقاعدہ انٹرنیٹ بھی ہوتا ہے۔تین ٹائم کا کھانا آپ ٹرے پکڑتے ہو اور کاؤنٹر پر جا کر کھانا لیتے ہو اور ٹیبل پر بیٹھ کر عزت سے کھانا کھاتے ہو۔

ایک مہینے کی جیل تھی۔ اس میں چھٹی یا دن رات والا کوئی چکر نہیں تھا۔ایک مہینے کی جیل ہوتی تھی اور پورا ایک مہینہ ہی جیل کاٹنی پڑتی تھی لیکن حقیقت میں ایک مہینے کی جیل کاٹنے کا پتہ ہی نہیں چلا اور ہماری رہائی کا دن آ گیا۔مہینہ پورا ہوا تو انہوں نے مجھے جیل سے باہر نکالا اور میرا سارا سامان اور پیسے جو میری جیب میں

تھے وہ واپس کر دیئے۔

میں جیل سے باہر آ گیا تھا۔ایک مہینے میں شہر نے کونسا بدل جانا تھا، ویسا ہی شہر تھا جیسا چھوڑ کر آیا تھا۔ میں گھر سے صرف 10 منٹ کے فاصلے پر ہی تھا۔بس میں سوار ہونے کی بجائے میں پیدل ہی گھر کی طرف جانے لگا اور آرام سے چلتا ہوا ایک گھنٹے میں گھر پہنچ گیا۔ مجھے صبح صبح 9 بجے کے قریب جیل سے رہا کیا گیا تھا۔ میں گھر آیا تو تب تک سارے کام پر چلے گئے تھے۔خلیل امونیا (Amonia) میں شفاقت بھائی کے ساتھ درزی کا کام کرتا تھا۔ مجھے ان کی دکان کا پتہ تھا اور میں وہاں سے چابی لیکر آ سکتا تھا۔میرے پاس بس کا پاس نہیں تھا اور ٹکٹ پر پیسے لگانے کی بجائے میں نے گھر کے باہر ہی بیٹھ کر انتظار کرنا مناسب سمجھا۔

تین بجے کے بعد لڑکے ایک ایک کر کے آنا شروع ہو جاتے تھے۔ میں باہر دروازے کے سامنے بنی ہوئی سیڑھی پر بیٹھ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔سب سے پہلا لڑکا ساڑھے 3 بجے کے قریب آیا۔ یہ بازاری کا کام کرتا تھا اور صبح 5 بجے کام پر نکل جاتا تھا۔اسے اڑھائی بجے چھٹی ہو جاتی تھی اور ایک گھنٹے میں گھر آ جاتا تھا۔

''اوئے راضی بھائی! آپ آ گئے ہو جیل سے واپس؟ قسم سے آپ کے بغیر سارے گھر والے بہت پریشان ہو رہے تھے۔'' وہ مجھے دیکھ کر خوش ہو گیا اور اس نے جلدی سے تالا کھولا اور مجھے لیکر گھر آ گیا۔

فریج کے اندر کولا کی بوتل پڑی ہوئی تھی۔اس نے ایک گلاس بھر کر مجھے دیا تو میں مسکرانے لگا۔

''یار! میں کوئی مہمان تھوڑی ہوں؟ اس گھر کا ایک فرد ہوں۔آپ کیوں میری خدمت کرنے کی کوشش کر رہے ہو؟

''نہیں بھائی! آپ بہت اچھے ہو۔ایجنٹ بڑا بے غیرت آدمی تھا جس نے دو نمبر کاغذات بنوا کر دیئے اور آپ ایک ماہ کے لیے اندر ہو گئے۔'' وہ ایجنٹ کو گالیاں دینے لگا۔

''کوئی بات نہیں یار! یہ سب کچھ میری قسمت میں لکھا ہوا تھا۔میرے پیسوں کا کیا بنا ہے؟ خلیل بھائی نے دکان دار کو بتا دیا تھا نا؟'' میں نے جس دکان پر گارنٹی کے طور پر پیسے رکھے تھے وہ خلیل کا جاننے والا تھا۔خلیل نے ہی مجھ سے پیسے لیکر اس دکان پر رکھوائے تھے۔ مجھے ان پیسوں کی فکر ہو رہی تھی۔10 ہزار یورو

بہت بڑی رقم ہوتی ہے۔ یہ پاکستانی 10 لاکھ روپیہ تھا۔ آج سے 10 سال پہلے کا دس لاکھ روپیہ میرے ڈیڑھ سال کی محنت کا سرمایہ تھا۔

''جی جی! وہ تو خلیل بھائی نے اسی دن واپس لے لئے تھے جس دن آپ نے فون کیا تھا کہ آپ پکڑے گئے ہو۔ وہ دوسرے دن صبح صبح دکان پر جا کر پیسے واپس لے آئے تھے اور انہوں نے وہ سارے پیسے آپ کے گھر بھیج دیئے ہیں۔''

''کیا۔۔۔؟ کیا کہہ رہے ہو؟'' میں اس کی بات سن کر شاک میں آ گیا۔

''خلیل بھائی نے سارے کے سارے پیسے گھر بھیج دیئے ہیں لیکن انہوں نے پیسے میرے گھر کیوں بھیجے ہیں؟'' میں نے کولے کا گلا ٹیبل پر رکھا اور دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔ میں نے یہ سارا پیسہ آگے جانے کے لیے اکٹھا کیا تھا اور خلیل نے سارا پیسہ اٹھا کر میرے گھر بھیج دیا تھا۔

''یار! ایک منٹ کے لیے میں اپنے گھر فون کر سکتا ہوں؟'' میں نے اس سے گھر فون کرنے کے لئے مانگا۔ میرے پاس موبائل موجود تھا لیکن اس میں کال کرنے کے لئے پیسے نہیں تھے۔

''جی جی! آپ بات کر لو۔'' اس نے جلدی سے موبائل میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ میں نے اس سے موبائل لیا اور اپنے گھر کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

''السلام علیکم!'' دوسری طرف ابو کی آواز آئی۔

''خلیل نے پیسے آپ کو بھجوائے ہیں؟'' میں سیدھا مطلب کی بات پر آ گیا۔ میرا ابو سے بات کرنے کو دل نہیں کرتا تھا۔ پیسوں کی وجہ سے مجبوری تھی اس لئے بات کر رہا تھا۔

''بیٹا! شکر ہے تمہاری آواز سننے کو ملی ہے۔ کیسے ہو؟ جیل سے رہا ہو گئے ہو؟ ہم سب تمہارے لئے بہت پریشان ہو رہے تھے۔'' وہ ایک ہی سانس میں مسلسل بولے چلے جا رہے تھے۔

''میں پیسوں کا پوچھ رہا ہوں۔۔۔ خلیل نے آپ کو پیسے بھجوائے ہیں تو وہ پیسے کدھر ہیں؟ مجھے وہ پیسے واپس چاہئیں۔ وہ آپ کے لئے نہیں تھے بلکہ میں نے آگے امریکہ جانے کے لئے اکٹھے کر کے رکھے ہوئے

تھے۔'' میں ابھی تک پیسوں پر ہی اٹکا ہوا تھا۔ ایمان کو میرا گاؤں چھوڑے ہوئے 4 سال سے زیادہ عرصہ بیت چکا تھا لیکن میرا غصہ ابھی تک قائم تھا اور آج بھی میرا دل انہیں باپ کہنے کو نہیں کرتا تھا۔

''بیٹا! پیسے تو ہم سے خرچ ہو گئے ہیں۔ دو مہینے تک فصل آ جائے گی تو فصل کے پیسے اور بینک سے قرضہ لے کر تمہیں تمہارے پیسے لٹا دیں گے۔'' میں نے تو باپ کہنا چھوڑ دیا تھا مگر وہ تو ابھی بھی مجھے پنا بیٹا ہی مانتے تھے اور ہر وقت ہی اپنے کئے کی معافی مانگتے رہتے تھے۔

''کیا؟ پیسے خرچ ہو گئے؟ یہ کوئی دس روپے نہیں تھے جو خرچ ہو گئے۔ جب آپ کو پتہ تھا کہ یہ میرے پیسے ہیں تو پھر آپ نے میری اجازت کے بغیر انہیں استعمال ہی کیوں کیا؟'' مجھے غصہ آ گیا اور میں غصے میں بولتا چلا گیا۔

''بیٹا! وہ ہم نے ٹریکٹر خرید لیا ہے۔ کھیتی باڑی کا کام بغیر ٹریکٹر کے بہت مشکل ہوتا ہے۔ سارے پیسے تو ٹریکٹر والا لے جاتا ہے۔ ابھی گھر کا ٹریکٹر ہے تو زیادہ بچت ہو جایا کرے گی۔ جو پیسے باقی بچے تھے اس سے مزید دس بھینسیں لے لی ہیں۔ بیٹا! جب سے میں تھانے سے واپس آیا تھا تب سے آج تک ہمارے گھر کے حالات کبھی بھی ٹھیک نہیں رہے تھے۔ پچھلے چھ سال سے میں اور تمہارے تینوں بھائی مسلسل محنت کر رہے تھے لیکن پھر بھی گھر کی غربت ختم نہ کر سکے۔'' ان کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔

''اچھا! آپ میری وجہ سے تھانے گئے تھے؟ آپ کا سارا کاروبار میری محبت کی وجہ سے تباہ ہو گیا تھا تو بدلے میں آپ نے بھی تو ہم دونوں کی زندگی تباہ کر دی تھی؟ جب دونوں طرف سے حساب برابر ہو گیا تھا تو پھر اب آپ نے میرے پیسے کیوں استعمال کئے؟'' میں ایک بار پھر ان کی باتیں سن کر غصے میں آ رہا تھا۔

''بیٹا! بات بدلے کی نہیں ہے۔۔۔ ہمارے گھر کی بربادی کے تم جواب دار نہیں ہو۔ میں گھر کا سربراہ ہوں اور ساری جواب داری میری ہی ہے۔ ہاں! مجھ سے غلطی ضرور ہوئی تھی اور اس غلطی کی معافی میں ہمیشہ تم سے مانگتا رہوں گا۔ رات کو صرف تم دونوں ہی نہیں جاگ کر گزارتے بلکہ ساری ساری رات میں بھی تڑپتا رہتا ہوں۔ تم جوان ہو اور تمہارے سر پر کوئی جواب داری یا ذمہ داری نہیں ہے اس لئے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ایمان کا خواب پورا کرنے کے لئے نکل پڑے ہو۔ لیکن میرے اوپر پورے گھر کی ذمہ داری ہے اس لئے نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرانا پڑتا ہے۔ بیٹا! گھر چلانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ تمہیں تب ہو گا

جب تمہارے بھی اپنے بچے ہوں گے۔'' مجھے ان کے رونے کی آواز آنے لگی۔

''اچھا اب رونا مت شروع کر دیں، میں دو مہینے تک انتظار کرلوں گا۔ امریکہ کے لئے ایجنٹ اتنی آسانی سے نہیں ملتا ہے۔ آپ پیسے اپنے پاس ہی رکھنا مجھے کسی بھی وقت ضرورت پڑ سکتی ہے۔ فصل کتنے کی ہو جائے گی دو مہینے بعد؟''

بینک سے قرضہ لینے کی صورت میں سود بہت زیادہ دینا پڑتا تھا۔ زمین کے کاغذات بینک گارنٹی کے طور پر رکھ لیتا تھا۔ پنجابی معاشرے میں بینک سے سود پر قرضہ لینا اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے میرا ارادہ قرضہ لینے کا نہیں تھا۔

''جی بیٹا! وہ دولاکھ کے قریب ہو جائے گی۔'' دوسری طرف سے ابو نے جواب دیا۔

''کیا؟ دولاکھ کی فصل ہو گی اور آپ آٹھ لاکھ قرضہ لو گے؟ اس پر دولاکھ تو سود ہی بن جائے گا۔ یہ کونسا نیا بینک آ گیا ہے جو دولاکھ کی آمدن پر 8 لاکھ قرضہ دے رہا ہے اور اگر مل بھی گیا تو واپس کیسے کرو گے؟ ساری زندگی اس قرضے کی قسطیں ہی ادا کرتے رہو گے۔'' مجھے ان کی باتوں پر مسلسل غصہ آ رہا تھا۔

''نہیں بیٹا! فصل کے ساتھ میں پانچ چھ گائے بھی بیچ دوں گا اور باقی قرضہ لے لوں گا۔ بہر حال تمہارے پیسے واپس کر دوں گا۔'' وہ جلدی جلدی بول رہے تھے۔

میرا نفرت انگیز انداز بھی انہیں غصہ دلانے میں ناکام ہو رہا تھا۔ وہ واقعی بہت اچھے اور نفیس طبیعت کے مالک تھے۔ ان کے بنائے ہوئے اصولوں پر میں آج بھی اپنی زندگی گزار رہا تھا۔ صرف ایک غلطی نے انہیں آسمان سے اٹھا کر زمین پر گرا دیا تھا۔

''نہیں! آپ رہنے دیں۔ صرف فصل کے پیسے آپ جمع رکھیں اور جانور بھی اسی وقت بیچیں گے جب امریکہ کے لئے ایجنٹ مل جائے گا۔ دو تین مہینے تک میں بھی کام کر کے مزید پیسے اکٹھے کرلوں گا۔ آپ پریشان مت ہوں میں کچھ نہ کچھ بندوبست کرلوں گا۔'' میں نے نرم پڑتے ہوئے کہا۔

''جی بیٹا! صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔'' انہوں نے ڈرتے ڈرتے مجھ سے بولا تو میں ایک سیکنڈ کے لئے خاموش ہو گیا۔ آج میرا باپ مجھ سے بات کرتے ہوئے ڈر رہا تھا۔

''جی جی! آپ بات کرو میں سن رہا ہوں۔'' میں نے زیادہ انتظار کروانا مناسب نہ سمجھا۔

''بیٹا! ہو سکے تو مجھے معاف کرنے کی کوشش ضرور کرنا۔ دعا کرتا ہوں کہ اسی زندگی میں ایک بار ایمان سے سامنا ہو جائے تو اس کے پیر پکڑ کر اس سے معافی مانگوں۔ بیٹا! تمہاری قسم! میں ساری ساری رات سو نہیں سکتا ہوں۔ میں نے اس بچی سے واقعی زیادتی کی تھی اور ہر رات اس بچی کا چہرا میری آنکھوں میں گھسا رہتا ہے۔ بیٹا! اگر ایمان مل جائے تو ایک بار اسے میرے پاس ضرور لانا میں مرنے سے پہلے ایک بار اس سے ملنا چاہتا ہوں اور اس سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔'' میں نے آہستگی سے موبائل کا بٹن آف کر دیا۔ میری آنکھوں سے مسلسل آنسو نکل رہے تھے اور میں رو رہا تھا۔ درد کی تیز لہریں میرے پورے جسم سے گزر رہی تھیں اور میں ان اذیتوں کو برداشت کرتے کرتے بے ہوش ہو گیا۔

شام کو ایک ایک کر کے باقی سارے لڑکے بھی آ گئے تھے۔ خلیل اور شفاقت بھائی بھی آ گئے تھے۔ خلیل بھائی آتے ہی مجھ سے حالات پوچھنے لگے۔ میں ان کو رہوڈس ائیر پورٹ پر ہونے والی ساری تفصیل بتانے لگا۔ پیسوں کا ذکر آیا تو انہوں نے بتا دیا کہ انہوں نے سارے پیسے پاکستان بھجوا دیے ہیں۔ انہیں یقین تھا کہ میں غصہ کروں گا لیکن میں نارمل ہی رہا۔ پیسے ایک بار پاکستان چلے گئے تھے اور اب میرے غصہ کرنے سے وہ واپس نہیں آ سکتے تھے۔

''یار! مجھے معلوم تھا کہ تم نے وہ پیسے امریکہ جانے کے لئے رکھے تھے۔ لیکن اتنے پیسے میں یہاں نہیں رکھ سکتا تھا اس لئے میں نے سارے تمہارے گھر بھیجوا دیئے ہیں۔ تم واپس منگوا لینا اور یہاں پر جب تک کام پر نہیں لگ جاتے میں تمہارا خرچہ بھرتا رہوں گا۔ بعد میں لوٹا دینا!'' خلیل مجھے مطمئن کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''کوئی بات نہیں خلیل بھائی! آپ نے اگر بھجوا دیئے ہیں تو ٹھیک ہے۔۔۔ اب کیا ہو سکتا ہے؟ آپ مجھے بس اپنا پاس دے دیں۔ میں سروس اسٹیشن تک جاتا ہوں اور کام کا پتہ کرتا ہوں، شاید وہ مجھے دوبارہ کام پر رکھ لیں۔'' میں نے خلیل سے بس پاس لیا اور سروس سٹیشن پر آ گیا۔

ان لوگوں نے میری جگہ پر ایک نیا لڑکا رکھ لیا تھا۔ میں نے مالک سے بات کی تو اس نے مجھے ایک ہفتے تک آنے کا کہا۔ وقتی طور پر اس کے پاس لڑکا موجود تھا اس لئے وہ مجھے کام پر نہیں رکھ رہا تھا۔ لیکن صاف

جواب بھی نہیں دے رہا۔ مالک بھی صاف جواب نہیں دیتے۔ کام کے لئے لڑکے کی ضرورت کبھی بھی پڑھ سکتی ہے اس لئے مالک صاف جواب دینے کی بجائے ہفتے دو ہفتے کا ٹائم دے دیتے ہیں اور فون نمبر رکھ لیتے ہیں۔ضرورت ہو تو بلا لیتے ہیں ورنہ منع کر دیتے ہیں۔ میں وہاں سے واپس گھر آ گیا۔

تقریباً آٹھ دس دن تک گھر میں بیٹھنے کے بعد اس باررنگ کا کام ملا۔ یہاں 25 یورو مزدوری تھی اور صبح 7:30 سے اڑھائی بجے تک کام ہوتا تھا۔ یہ بہت سخت کام تھا۔ سارا دن دیواریں رگڑ رگڑ کر جان نکل جاتی تھی۔ میرا مالک البانوی تھا۔ البانیہ (ALBANIA) یونان کے شمال مغرب میں واقع مسلم اکثریتی یورپی ملک ہے۔ اس کی سرحدیں یونان، مقدونیا، سربیا اور مونٹی نیگرو سے ملتی ہیں۔ البانیہ کے مغرب میں سمندر کی چھوٹی سی پٹی ہے جو اٹلی کو لگتی ہے۔ البانیہ اور اٹلی کا درمیانی سمندری فاصلہ صرف 75 کلومیٹر ہے۔ یہ یورپ کا واحد کمیونسٹ ملک ہے جس کی 70 فیصد سے زائد آبادی مسلمان ہے۔

مغربی ممالک (یورپ) ہمیشہ سے ہی کمیونزم کے خلاف ہیں۔ چونکہ یہاں مسلمان اکثریت میں ہیں اس لئے وہ یہاں مسلم گورنمنٹ کی بجائے کمیونسٹ گورنمنٹ کو فوقیت دیتے ہیں۔ میرا گورا مالک صرف نام کا مسلمان تھا۔ اسے کلمہ تک نہیں آتا تھا۔ اور وہ شراب، سور (پورک کا گوشت) سب کچھ کھا جاتا تھا۔ اسے ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ کسی صحابی کا نام تک نہیں آتا تھا اور آگے ان کی نئی نسل کے تو نام تک یورپین تھے۔

یہ ملک البانیہ سابقہ سلطنت عثمانیہ کا حصہ تھا جو پہلی جنگ عظیم سے پہلے علیحدہ ہو گیا تھا اور اٹلی کے زیرِ نگیں آ گیا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے وقت جرمنی نے قبضہ کر لیا اور پھر بعد میں اس کے کچھ حصے یونان اور کوسوہ اور مونٹی نیگرو کو دے دیئے گئے۔ باقی ماندہ البانیہ ایک الگ کمیونسٹ ملک بن گیا۔ یونان میں سب سے زیادہ مزدور طبقہ البانیہ سے ہی آتا ہے۔ یونان اور البانیہ کا بارڈر سارا پہاڑی علاقے میں ہے اس لئے البانوی آسانی سے بارڈر کراس کر کے یونان آ جاتے ہیں اور یہاں کام کرتے رہتے ہیں۔ یونانی گورنمنٹ اگر ڈی پورٹ بھی کرتی ہے تو یہ پھر واپس آ جاتے ہیں۔ ہمسایہ ملک ہے اس لئے البانوی بڑی تیزی سے زبان سیکھتے ہیں اور یہاں یونان میں شادیاں کر کے یونانی شہریت لے لیتے ہیں۔

میرے مالک کا نام اسماعیل آرسٹیدی (ISMAIL ARSTIDI) تھا۔ اسماعیل اس کے والد کا نام

تھااور آرسٹیدی اس کا نام تھا۔اس کے پاس یونانی شہریت تھی۔ یہ صرف رنگ کا کام ہی نہیں کرتا تھا بلکہ جو بھی کام مل جائے کر لیتا تھا۔میں نے اس کے ساتھ تقریباً ڈیڑھ سال کام کیا اور اس ڈیڑھ سال کے عرصے میں نیا کام بھی تلاش کرتا رہا اور ایجنٹ بھی۔۔۔لیکن اب کام ملنا مشکل ہو گیا تھا۔عوام بہت زیادہ تعداد میں یونان میں آ گئی تھی اور ہر گھر میں ایک دو لڑکے فارغ بیٹھے ہوئے تھے۔آرسٹیدی کے پاس کام مستقل نہیں ہوتا تھا۔ ہفتے میں صرف پانچ دن کام ہوتا تھا اور بعض دفعہ تو پورا پورا ہفتہ کام ہی نہیں ملتا تھا۔اگر کام مل بھی جاتا تو کم ملتا تھا اور وہ اکیلا ہی چلا جاتا تھا۔ میں کام کے ساتھ ساتھ مختلف جگہوں پر جا کر نیا کام تلاش کرتا رہتا لیکن کام نہیں ملتا تھا۔ایجنٹ کی تلاش بھی ساتھ جاری تھی لیکن کوئی بھی ایجنٹ حامی نہیں بھرتا تھا۔

2010ء کے شروع میں مجھے ایک بازاری میں کام مل گیا۔ یہاں بھی تنخواہ 25 یورو تھی لیکن یہ سات دن کام تھا۔ مجھے صرف پیسے سے غرض تھی۔گھر میں فارغ بیٹھنے کا مجھے کوئی شوق نہیں تھا اس لئے میں نے رنگ کا کام چھوڑا اور بازاری میں چلا گیا۔ بازاری کو یونانی زبان میں لائیکی (LAIKY) کہتے ہیں۔آپ اسے اتوار بازار یا رمضان بازار سمجھ سکتے ہیں۔اس میں فرق صرف یہ ہے کہ اتوار بازار یا رمضان بازار مخصوص جگہوں پر لگتے ہیں جبکہ یونان میں ایک ہی شہر میں کم از کم بیس پچیس جگہ پر اور پورے یونان میں دس ہزار سے زیادہ جگہوں پر روزانہ لگتی ہے۔ ہفتے میں ایک بار ایک جگہ بازاری لگتی تھی اور ہر ہفتے اسی جگہ پر بازاری لگتی تھی۔ یہ گلیوں کے اندر لگتی ہے اور اس کے لئے سالانہ بنیاد پر جگہ کرائے پر لینی پڑتی ہے۔ یہ منٹوں کے حساب سے ملتی ہے اور اسے بلدیہ والے کرائے پر دیتے ہیں۔

میرا مالک 7 دنوں میں سات مختلف جگہوں پر بازاری لگاتا تھا۔اس کے پاس پلاسٹک کا سامان تھا جو ایک یورو سے شروع ہو کر 5 یورو تک جاتا تھا۔ بازاری میں زیادہ تر تازی سبزیاں ہی ہوتی ہیں۔ ہفتے میں ایک بار آپ کے گھر کے سامنے بازاری لگتی تھی۔لوگ پورے ہفتے کا راشن اس بازاری سے خرید لیتے اور اگلے ہفتے تک یہی راشن استعمال کرتے تھے۔اگر ہفتے کے درمیان میں سامان ختم ہو جائے تو دکان سے مہنگے داموں ملتا تھا یا پھر دوسری کالونی میں جہاں اس دن بازاری لگتی ہے وہاں سے جا کر خریدنا پڑھتا تھا۔یونان میں روزانہ دس ہزار سے زائد جگہوں پر بازاری لگتی تھی۔ایک بازاری میں 100 کے قریب سبزیوں، مچھلیوں کپڑوں اور پلاسٹک کے سامان کے سٹال لگتے ہیں۔یعنی روزانہ 10 لاکھ سٹال، ایک سٹال پر کم از کم 3 لوگ ضرور کام کرتے ہیں جو سات آٹھ گھنٹے تک چلے جاتے ہیں۔اگر تین کی اوسط بھی لگاؤ تو 30 لاکھ لوگ روزانہ

اس کاروبار سے ڈائیریکٹ مزدوری کماتے ہیں اوراس کے لئے کسی جگہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہفتے میں ایک دن کے لئے اسی گلی میں گاڑیوں کے گزرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔لوگ گاڑیاں دوسری گلی میں پارک کرتے ہیں اوراس سے زیادہ اور کچھ بھی نہیں۔

شاید ہمارے حکمرانوں کو بھی شرم آجائے۔ کرنا کچھ بھی نہیں پڑتا۔ بس جنرل سٹور اور بڑی بڑی مارکیٹوں کوسبزی بیچنے سے روکنا پڑتا ہے۔ وہ سگریٹ، ڈرنک اوردوسرا سامان (صابن شیمپووغیرہ) بیچ کراپنی دکان چلاتے ہیں۔ بڑی بڑی مارکیٹوں کوسبزی بیچنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ یہ اضافی منافع ہوتا ہے۔ یونان کی گورنمنٹ اگرآپ سگریٹ بیچتے ہواپنی دکان پرتو وہ آپ کوسبزی نہیں بیچنے دے گی اوراگرآپ سپر مارکیٹ پرسبزی بیچتے ہوتو وہ 23 فیصد کے حساب سے ٹیکس لے گی۔ جبکہ بازاری والوں سے صرف کرایہ وصول کیا جاتا ہے۔اسی وجہ سے سبزی کا ریٹ کم ہوجاتا ہےاورعورتیں بازاری سے ہی سبزی خریدتی ہیں۔

اس وقت بازاری سے آلو 20 سینٹ سے لے کر 30 سینٹ تک کلو ملتے تھے۔ جبکہ سپر مارکیٹ سے 50 سینٹ کے کلو۔ٹیکس، بجلی اورسپر مارکیٹوں کا کرایہ یہ سب مل کرآلو کی قیمت 20 سے 50 کردیتے ہیں۔اس لئے عوام بازاری سے سستے داموں سبزی خریدلیتی ہے اور پورا ہفتہ استعمال کرتی ہے۔ اگرکسی کو ایمرجنسی میں سبزی خریدنی پڑےتو وہ سپر مارکیٹ سے مہنگے داموں خریدتا ہے۔حکومت اس کو کہتے ہیں۔ہم لوگ یورپ کوگالیاں تو دیتے ہیں لیکن اسی یورپ کےایک ویزے کے لئےترس رہے ہوتے ہیں۔

بازاری کا یہ کام صرف چھ مہینے چلااوراس کے بعدمیں لکڑی کی فیکٹری میں چلا گیا۔میرا کام کرسیوں اور میزوں کی رگڑائی کرنا تھا۔ بعدمیں اس پررنگ کرکے بیچا جاتا تھا۔ یہ کام بہت اچھااورآرام دہ تھا لیکن صرف پانچ مہینے ہی چل سکا۔اس دوران میں میکسیکو کے لئے دوسری مرتبہ بھی کوشش کرچکا تھا۔ایک بارہوائی جہاز کے ذریعےاوردوسری بارکارگوشپ کے کنٹینروں میں چھپ کر۔۔۔لیکن دونوں بارہی ناکام رہا۔سزا سے بچ گیا تھا لیکن کامیاب نہ ہوسکا۔میری قسمت میں بڑی سزا لکھی ہوئی تھی اوروہ مل گئی۔بغیرکسی قصور کے۔۔۔ میں نے کچھ بھی نہیں کیا تھا لیکن پھربھی پکڑا گیا اور 20 مہینے جیل کاٹی۔

میرا لکڑی کا کام چھوٹ گیا تو میں روزانہ صبح صبح گھرسے نکل جاتا اورشہرمیں کام تلاش کرتا رہتا۔انہی دنوں یونان میں سکوپیا آپریشن (SCOPA OPPERSTION) شروع ہوا۔یونان نے دوسال پہلے

ہی پاکستانی اورانڈین افراد کو سٹے کارڈ (RED CARD) دینا بند کر دیئے تھے۔ کسی بھی نئے پاکستانی یا انڈین کو سٹے نہیں دیا جاتا تھا۔لڑکے اپنے دوستوں کے سٹے کارڈ کی فوٹو کاپیاں کروا کر اپنے پاس رکھ لیتے تھے۔ (میں اس بات کا پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں) پرانے سٹے کارڈ وہ ہر چھ مہینے کے بعد نیو کر کے دے دیتے تھے۔ البتہ نئے کارڈ جاری نہیں ہوتے تھے۔ میرے پاس پرانا سٹے کارڈ تھا اور وہ نیو ہو رہا تھا اس لئے مجھے باہر نکلنے کی کوئی پریشانی نہیں تھی۔ سکوپیا آپریشن ان لڑکوں کے لئے تھا جن کے پاس ریڈ کارڈ نہیں تھے یا دو نمبر ریڈ کارڈ تھے۔

پاکستان سے ایک نیا ایمبیسڈر (AMBASDOR) یونان آیا اور اس نے یونانی حکومت کے ساتھ مل کر پاکستانیوں کو ڈی پورٹ کرنا شروع کر دیا۔ یہ پاکستانی تھا، گورنمنٹ آف پاکستان کا ملازم تھا لیکن کام یونانی حکومت کے لئے کرتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم اس نے کتنے پیسے سے یا کتنی مراعات اس نے یونانی حکومت سے حاصل کیں لیکن اس ایک آدمی نے ہزاروں پاکستانیوں کی زندگیاں تباہ کر کے رکھ دیں۔ ایک ایمبسڈر سالانہ کروڑوں روپیہ تنخواہ لیتا ہے لیکن پھر بھی پیٹ نہیں بھرتا اور یہ زیادہ سے زیادہ کی لالچ کرتے رہتے ہیں۔

یونان میں سب سے پہلے بغیر پاسپورٹ کے پاکستان ڈی پورٹ کرنے کا کام اسی ایمبیسڈر نے شروع کیا تھا۔ اس نے ڈی پورٹ کرنے کا ایک نیا ہی طریقہ ایجاد کر لیا۔ یونانی پولیس کسی بھی پاکستانی کو پکڑتی اور اسے لے کر ایمبیسی چلی جاتی۔ یہ وہاں سے اس لڑکے کے پاکستانی ہونے کا لیٹر جاری کر دیتا اور دوسرے دن لڑکے کو جہاز پر بٹھا کر پاکستان روانہ کر دیا جاتا۔ پاکستانی ائیر پورٹ پر FIA والے پکڑ لیتے اور اپنی دس پندرہ ہزار کی دیہاڑی لگا کر چھوڑ دیتے۔

شروع شروع میں یہ لڑکوں کو دیکھ کر لیٹر دیتا تھا۔ بعد میں جب لڑکے زیادہ ہونا شروع ہو گئے تو وہ دیکھنا بھی گوارہ نہ کرتا اور باہر سے ہی لیٹر بننے شروع ہو گئے۔ اس نے مزید ترقی کی اور لڑکوں کو پاکستانی ایمبیسی تک لانے کی زحمت بھی ختم ہوگئی۔ پولیس والے تھانے سے پاکستانی لڑکوں کی لسٹ بنا کر لاتے اور یہ اس لسٹ کے مطابق لیٹر بنا کر دے دیتا۔ لڑکے ڈی پورٹ ہونا شروع ہوئے تو پولیس نے پکڑنے کی رفتار تیز کر دی۔ لڑکوں نے اس کی ایمبیسی کے سامنے رونا شروع کیا لیکن پھر بھی اس پر اثر نہ ہوا۔ یہاں تک کہ اس نے

ایمبیسی سے ہتھکڑی لگوا کر لڑکوں کو ڈی پورٹ کروایا۔ یہ بھی ایک ریکارڈ ہے۔ پوری دنیا میں ایمبیسی کے اندر سے گرفتار کر کے ڈی پورٹ نہیں کیا جاتا۔

پچاس ساٹھ لڑکے روزانہ ڈی پورٹ ہونا شروع ہوئے تو یونان کے اندر پوری پاکستانی کمیونٹی میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ بغیر کارڈ کے جتنے بھی لڑکے کام کرتے تھے وہ کام چھوڑ کر گھروں میں بیٹھ گئے۔ پولیس پورے یونان میں گھومتی تھی اور ہر نظر آنے والے لڑکے کو روک کر ریڈ کارڈ چیک کرتی تھی۔ صرف اصل ریڈ کارڈ والے کو چھوڑتی اور فوٹو کاپی والے پکڑ کر لے جاتی۔ یہ سلسلہ مسلسل چھ مہینے تک چلا اور اس عرصہ میں ہزاروں پاکستانی اس ایمبسیڈر کے لیٹر کی بھینٹ چڑھ گئے۔

اس کے بعد یونانی حکومت نے سکوپیا آپریشن شروع کر دیا۔ اس آپریشن کے تحت جن لڑکوں کے پاس یونان کا سٹے نہیں تھا ان کو واپس ڈی پورٹ کرنا تھا۔ پولیس نے آپریشن تیز کرنا شروع کر دیا اور آہستہ آہستہ گھروں میں بھی گھسنے لگی۔ اس آپریشن کی گونج پاکستان کے ایوانوں میں بھی گونجنے لگی۔ لڑکوں کو ڈی پورٹ کرنے کی تعداد زیادہ ہو گئی اور پورا پورا جہاز بھر کر جاتا۔ پہلا جہاز ڈی پورٹ ہوا اور اس کے بعد دوسرا ڈی پورٹ ہوا۔ اس وقت پاکستان میں آصف علی زرداری کی حکومت تھی۔ پاکستانی لڑکوں سے بھرا ہوا جہاز لاہور ائیر پورٹ پر اترا تو زرداری نے لڑکوں کو نیچے اترنے سے منع کر دیا۔ جہاز دو گھنٹے تک ائیر پورٹ پر رکا رہا۔ یونانی گورنمنٹ زرداری پر زور دیتی رہی لیکن اس نے لڑکے رسیو کرنے سے منع کر دیا۔ یہ ڈٹ گیا اور آخر کار جہاز دو گھنٹے کے بعد واپس یونان چلا گیا۔ لڑکے واپس یونان آئے اور یہاں انہیں چھوڑ دیا گیا۔

زرداری نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اسی وقت یونان میں اس سفیر کو فون کیا اور اسے فوراً اسلام آباد پہنچنے کا کہا۔ اس دن لڑکوں کی بجائے سفیر پاکستان پہنچے اور میں نے سنا تھا کہ زرداری صاحب نے ایک گھنٹے تک اس کو اپنے سامنے کھڑا رکھا اور کسی بھی پاکستانی لڑکے کے لئے کسی بھی قسم کا لیٹر بنانے سے منع کیا۔ میں نے تو یہاں تک بھی سنا تھا کہ زرداری صاحب نے سفیر کو دھمکی بھی دی تھی۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس دن کے بعد دوبارہ اس سفیر نے کوئی بھی لیٹر جاری نہیں کیا تھا۔

یونان کی حکومت نے لڑکوں کو پکڑنے کے لئے سکوپیا آپریشن شروع کیا تھا۔ پہلے تو لڑکے ڈی پورٹ ہو جاتے تھے لیکن زرداری نے لڑکے لینے سے انکار کیا تو انہوں نے پکڑ پکڑ کر جیلوں میں ڈالنا شروع کر دیا۔

تھوڑی سی جیلیں تھیں ۔ ایک مہینے میں ہی بھر گئیں تو انہوں نے سابقہ فوجی بیرکوں کو جیلوں میں بدل دیا اور وہاں لڑکوں کو رکھنا شروع کر دیا۔ یہ لوگ مسلسل زرداری پر دباؤ ڈالتے رہے لیکن زرداری اپنی بات پر ڈٹا رہا۔اس نے ایک بھی لڑکے کو واپس نہ لیا۔لڑکوں کو جیلوں میں ڈالا اور پھر باہر نکالنا ہی بھول گئے ۔ایک مہینے کی سزا تین مہینے ، پھر ایک سال اور پھر چھبیس چھبیس مہینوں کی سزائیں ہوئیں ۔لڑکوں کو تین سال تک جیلوں میں رکھا گیا۔لڑکے خود پاکستان جانا چاہتے تو ان کی مرضی سے انہیں پاکستان ڈی پورٹ کیا جاتا ورنہ جیل میں ہی رہتے ۔

میرے پاس سٹے کارڈ موجود تھا اور میں کام کی تلاش میں گھر سے نکلا ہوا تھا۔ایک پولیس کی گشتی پارٹی نے مجھے روک لیا۔ میں نے آرام سے انہیں سلام کیا اور اپنا سٹے کارڈ نکال کر انہیں دکھا دیا۔ پولیس والے کچھ دیر تک کارڈ کو بغور دیکھتے رہے کہ اوریجنل ہے یا دو نمبر ہے۔

’’جی سر! اوریجنل ہے۔‘‘ ایک پولیس والے نے میرے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

’’آپ فیکس سے چیک کر سکتے ہیں۔‘‘ میں نے آہستہ سے کہا۔

’’اچھا! پکی بات ہے اوریجنل ہے؟‘‘

’’جی سر! اوریجنل ہے۔‘‘ میں نے دوبارہ ان کو جواب دیا۔

ایک پولیس والا مسلسل مجھ سے بحث کرتا رہا۔ میں نے بحث کرنے کی بجائے خاموش رہنا مناسب سمجھا۔ یونان کے اندر پولیس کو لامحدود اختیارات حاصل تھے۔ میں ان کو غصہ نہیں دلانا چاہتا تھا۔غریب مزدور آدمی تھا۔ دو چار گالیاں کھانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔آخر کار انہوں نے مجھے اپنے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کر لیا اور انہوں نے میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنائی اور تھانے لے گئے ۔ میں تھانے کے کمرے میں بیٹھا انتظار کرنے لگا۔ میرے پاس اوریجنل کارڈ تھا اس لئے مجھے یقین تھا کہ تین چار گھنٹے اندر رکھ کر مجھے چھوڑ دیں گے ۔ میرا موبائل انہوں نے باہر ہی لے لیا تھا اور مجھے کہیں بھی کال نہیں کرنے دی تھی ۔ میں رات تک ادھر ہی انتظار کرتا رہا۔رات کو ایک پولیس والے سے پوچھا کہ وہ مجھے کب تک چھوڑیں گے تو اس پولیس والے نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

دوسرے دن دوپہر کو ایک پولیس والا آیا۔ اس نے مجھے ہتھکڑی لگائی اور باہر لے آیا۔ باہر پولیس کی بڑی گاڑی کھڑی تھی۔ میرے ساتھ مزید سات لڑکے اور تھے، ان سب کو ہتھکڑی لگا کر گاڑی میں بٹھایا اور ہمیں ایک فوجی کیمپ میں لے جایا گیا۔ یہ پرانی فوجی بیرکس تھیں جنھیں اب جیل کے طور پر استعمال کیا جا رہا تھا۔ آرمی کا کنٹرول یہاں سے مکمل ختم ہو گیا تھا اور اب اس کی جگہ پولیس نے لے لی تھی۔ کیمپ کی دیواریں 9 فٹ کے قریب تھیں اور اس کے اوپر خاردار تاریں لگی ہوئی تھیں۔

یہ بہت بڑا کیمپ تھا اور اس کے چاروں کونوں پر ٹاور بنے ہوئے تھے جن کے اندر پولیس والے بیٹھ کر ڈیوٹی دیتے تھے۔ یہاں کم از کم 1000 کے قریب لڑکے قیدی تھے۔ میں اندازاً کہہ رہا ہوں شاید تعداد اس سے بھی زیادہ ہو۔ میں اب حقیقت میں پریشان ہو گیا تھا۔ میرے پاس اوریجنل ریڈ کارڈ موجود تھا لیکن پھر بھی اس کیمپ میں قیدی ہو گیا تھا۔ جیل کے اندر پہنچ کر ہمیں نیچے اتارا گیا اور ہماری ہتھکڑیاں کھول دی گئیں۔ ایک کونے پر ایک چھوٹا سا کمرہ دفتر کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ ہمیں ایک ایک کر کے اس دفتر میں بھیجنا شروع کر دیا۔ میں اپنی باری پر اس کمرے میں چلا گیا۔ وہاں ٹیبل کے دوسری طرف ایک آفیسر اور دو پولیس والے بیٹھے ہوئے تھے۔

''بیٹھ جاؤ! نام کیا ہے اور کونسے ملک سے ہو؟'' مجھ سے سوال پوچھنے والا یونانی پولیس کا افسر تھا۔

''سر! میرا نام رضوان علی ہے۔۔۔ پاکستان سے۔ میرے پاس اصل سٹے کارڈ موجود ہے۔ 2007ء کو اشو ہوا تھا اور لدپون (LADAPONE) یونانی امیگریشن آفس سے یہ چھ مہینے میں رینیو ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ میرے پاس میڈیکل کارڈ، بینک کارڈ اور نیشنل ٹیکس نمبر میرا سب کچھ بنا ہوا ہے۔ میں قانونی طور پر یونان میں رہائش پذیر ہوں۔ میری جیب میں یہ سب کچھ موجود تھا لیکن میری تلاشی کے دوران ان پولیس والوں نے نکال لیا تھا۔ آپ میرے فنگر پرنٹ لے لیں اس سے تصدیق ہو جائے گی۔'' میں رحم طلب نظروں سے اس افسر کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

''سوری! یہ ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ ہمارا کام آپ کو یہاں پر رکھنا ہے اور آپ کا نام اور پتہ آگے امیگریشن ڈیپارٹمنٹ کو دینا ہے۔ وہی آپ کے کیس کا فیصلہ کرتی ہے۔'' میری کسی بھی بات کا اس افسر پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

''آپ واپس اپنے ملک جانا چاہتے ہو؟'' اس نے مجھ سے سوال کیا تو میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''نہیں سر! میں واپس اپنے ملک نہیں جانا چاہتا۔'' میں نے نیچے ٹیبل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

یونان کے اندر اس وقت فرسی اووگی (CHRYSI-AGVI) جماعت کا زور تھا۔ یہ سیاسی جماعت تھی جو مہاجرین کو اپنے ملک سے نکالنے پر زور دے رہی تھی۔ اس جماعت نے بہت زور پکڑ لیا تھا اور اس جماعت کے اپنے مسلح ونگ بن گئے تھے۔ یورپ میں مسلح ونگ عجیب سی بات لگتی ہے لیکن یہ حقیقت تھی۔ یہ موٹر سائیکلوں پر بیس بیس تیس تیس کی تعداد میں نکلتے تھے اور کوئی بھی ایشیائی (پاکستانی انڈین) نظر آجاتا تو اسے مارتے تھے اور بہت زیادہ مارتے تھے۔ سر اور جسم تک پھاڑ دیتے تھے۔ یہ اتنا مارتے تھے کہ ہڈیاں تک ٹوٹ جاتی تھیں۔

ایک طرف سکو یا ایڈیشن اور دوسری طرف فرسی اووگی کے غنڈے پورے یونان میں دہشت کا ماحول تھا۔ پاکستانی لڑکوں نے کام چھوڑ دیا اور گھروں سے باہر نکلنا ہی بند کر دیا تو یہ لوگ گھروں میں گھسنا شروع ہو گئے۔ یونان میں چوری ڈکیتی کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا تھا اس لیے گھروں کے مین دروازے اور کھڑکیاں زیادہ تر شیشے کی ہوتی تھیں۔ یہ رات کو دو تین کے قریب آرام سے شیشہ توڑتے اور گھر کے اندر گھس آتے۔ یہ لوگ گھر کا سارا سامان توڑ دیتے، پیسے اور کاغذات چھین لیتے اور مارنا شروع کر دیتے۔

انسان جب نفرت سے مارتا ہے تو جانور کو بھی پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔ فرسی اووگی کے لیڈروں کی نفرت انگیز تقریروں نے ان نوجوانوں کو جانور بنا دیا تھا اور یہ جانوروں کی طرح ہی پاکستانیوں کو مارتے تھے۔ چالیس پینتالیس منٹ کا یہ کھیل ہوتا اور اس کے بعد یہ لڑکے موٹر سائیکلوں پر بیٹھتے اور بھاگ جاتے۔ دس منٹ سے بھی پہلے حادثے پر پہنچنے والی پولیس ایک ایک گھنٹہ تاخیر سے پہنچتی اور ایک سادہ رپورٹ بنا کر لے جاتی۔ ہم مہاجرین تھے اس لیے کوئی بھی ہماری مدد نہیں کرتا تھا۔

یہ نفرت فروسی اووگی سے شروع ہوتی اور آہستہ آہستہ پورے یونانی معاشرے میں پھیل گئی۔ یونانیوں کو ہمارے جسموں سے بدبو آنا شروع ہو گئی اور یہ لوگ بسوں میں ہمارے ساتھ بھی کھڑے نہیں ہوتے تھے۔ ہمیں زبردستی بس کے آخری حصے کی طرف دھکیل دیا جاتا۔ اگر کسی سٹاپ پر اکیلا پاکستانی کھڑا ہوتا تو بس ڈرائیور بس ہی کھڑی نہیں کرتا تھا۔ یونان میں ایتھنز سے سلونیکی (ATHENS TO

(THESACONIKI کے لیے روزانہ رات کو گیارہ بجے دونوں طرف سے ایک ٹرین نکلتی تھی۔ یہ غریب مسافروں کے لیے تھی اور اس کا کرایہ نارمل کرائے کے آدھے سے بھی کم ہوتا تھا۔ نارمل کرایہ 65 یورو تھا جبکہ اس ٹرین کا کرایہ 22 یورو تھا۔ اس لیے روزانہ گنجائش سے زیادہ مسافر سفر کرتے تھے۔ اگر آپ ایک گھنٹہ پہلے ٹکٹ لیتے ہیں تو سیٹ مل جاتی تھی۔ اس کے بعد نیچے بیٹھ کر ہی یا کھڑے ہو کر سفر کرنا پڑتا تھا۔

نفرت کی انتہا یہ تھی کہ پاکستانی لڑکا اگر ایک دن پہلے بھی ٹکٹ لیتا تو تب بھی کاؤنٹر سے یہی جواب ملتا کہ سیٹیں ختم ہوگئی ہیں۔ پورا یونان ہی پاکستانیوں کے لیے جنگل بن گیا تھا۔ آپ کی مدد کرنے والا کوئی بھی نہیں تھا اس لیے ہر کوئی زیادتی کر رہا تھا۔ آخر خدا کو ہماری حالت پر رحم آ گیا اور فرسی اووگی کے ہاتھوں تشدد کرتے ہوئے ایک یونانی کی موت ہوگئی۔ یورپی معاشرہ جیسا بھی ہو قانون کے لیے بہت سخت ہے۔ انکوائری شروع ہوگئی۔ فروسی اووگی کی یونانی پارلیمنٹ کے اندر سیٹیں تھیں لیکن پھر بھی ان کے لیڈران کو جیل میں ڈالا گیا۔ مسلح ونگ اور امن و امان کو خراب کرنے کے جرم میں فرسی اووگی پر پابندی لگ گئی۔ آج یونان کے اندر فرسی اووگی پر مکمل پابندی ہے اور یہ جماعت ہی تقریباً ختم ہوگئی ہے۔

پاکستان میں بھی کچھ جماعتیں ہیں جو نفرت پھیلاتی ہیں، علاقائی سیاست کرتی ہیں اور نسلی بنیادوں پر ووٹ لیکر اسمبلی میں پہنچتی ہیں۔ یہ کام سیاست کا نہیں ہے بلکہ پاکستانی ایجنسیوں کا ہے۔ یونانی سپریم کورٹ کے ایک فیصلے سے ملک کی تیسری بڑی اور سب سے پاپولر جماعت پر پابندی لگ گئی۔ آج یونان کے حالات ٹھیک ہو گئے ہیں۔ ہماری ایجنسیاں بھی کام کریں۔۔۔ سیاسی بنیادوں پر نہیں۔ جو بھی پارٹی نسلی بنیادوں پر ووٹ لیتی ہے اور مسلح ونگ رکھتی ہے تو اسے مکمل بین کر دیں۔ ہمارا ملک بھی ٹھیک ہو جائے گا۔

پولیس والوں نے میرا نام اور ملک کا نام لکھا اور مجھے ایک سیل میں لے جا کر بند کر دیا۔ میں روزانہ ہر پولیس والے کی منتیں کرتا کہ وہ میرا ایک فون کروا دیں یا میری انگلیوں کے نشانات ہی لے لیں۔ مجھے کوئی ایک موقع ہی دے دیں تا کہ میں اپنی بے گناہی ثابت کر سکوں لیکن کوئی بھی میری بات سننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ہر روز ان کا ایک ہی مطالبہ ہوتا کہ ہم رضا کارانہ طور پر ان کا ملک چھوڑ کر چلے جائیں۔ ورنہ تب تک ادھر ہی رہیں جب تک کوئی نیا قانون نہیں آ جاتا۔

پہلا قانون چھ مہینے کا آیا تو ہر لڑکا ہی چھ مہینے کی جیل کاٹنے پر تیار ہو گیا۔ چھے مہینے سے جیل ایک سال

اور پھر 18 مہینے کی کر دی گئی۔ اصل سزا 18 مہینے کی تھی لیکن لڑکوں کو چھتیس چھتیس مہینوں تک رکھا گیا۔ لڑکے تنگ آ کر اپنے ملکوں کو جانے لیے راضی ہو جاتے تو دوسرے دن ہی اس کے کاغذات تیار کیے جاتے اور ایک ہفتے کے اندر اندر اس کی ساری سزا معاف اور پاکستان ڈی پورٹ کر دیا جاتا۔ یہ ہر ڈی پورٹ ہونے والے لڑکے کو 300 یورو بھی دیتے تھے جو لاہور ائیر پورٹ پر FIA والے چھین لیتے۔

شہباز شریف صاحب! رشوت لینے والا اور دینے والا دونوں جہنمی ہوتے ہیں۔ اس رشوت کو ختم کرنے کی طاقت تو آپ کے ہاتھ میں ہے۔ رشوت لینے والے افسر کو پکڑنا اور نوکری سے نکالنا آپ کے اختیار میں ہے۔ جنت تو آسانی سے آپ کو بھی نہیں ملے گی نوے نوے دن میں پل بنانا اور لمبے بوٹ پہن کر سیلاب کے پانی میں کھڑے ہونا چھوڑ دیں۔ جنت اتنی آسانی سے کہاں ملتی ہے۔ پورے پنجاب میں کوئی ایک ادارہ ایسا بتا دیں جس میں رشوت نہ چلتی ہو۔ صدیوں تک لیڈر یاد رکھے جاتے ہیں، حکمران نہیں۔ اس لیے لیڈر بنو لیڈر۔۔۔ اس ملک کو لیڈروں کی ضرورت ہے۔ حکمرانی تو ہزاروں کرتے ہیں اور ہزاروں چلے جاتے ہیں۔

یہاں جیل میں کھانا دو ٹائم کا دیا جاتا تھا۔ زیادہ اچھا تو نہیں تھا لیکن پھر بھی بہت تھا۔ اس کے علاوہ کچھ انسانی حقوق کی تنظیمیں بھی دے جاتی تھیں۔ پاکستانی سفیر بھی ایک بار ہماری حالت زار دیکھنے کے لیے آئے تھے۔ ایک اچھا سا پیارا سا لیکچر دیا اور چلتے بنے۔ کام تقریروں سے نہیں بنتے بلکہ اس کے لیے عملی محنت کرنی پڑتی ہے۔

میں لگاتار ہر روز ڈیوٹی پر آنے والے پولیس والے کو اپنی کہانی سناتا رہتا۔ میری کوشش تھی کہ کسی طرح میری اطلاع باہر چلی جائے۔ اگر خلیل یا شفاقت بھائی کو پتہ چل جاتا کہ میں یہاں ایتھنز میں ہی پولیس کی قید میں ہوں تو وہ کوئی نہ کوئی وکیل کر لیتے اور میں باہر آ جاتا۔ میرے پاس یونان میں رہنے اور کام کرنے کا قانونی سٹے تھا۔ اس لیے یونانی پولیس مجھے قید رکھنے کا اختیار نہیں رکھتی تھی۔ لیکن پولیس والے میری کسی بھی بات کا یقین نہیں کرتے تھے۔ میں کھانا بنانے والے، کھلانے والے ڈیوٹی پر کھڑے اہلکار یا صفائی کرنے والے سب سے کہتا تھا کہ وہ میری اطلاع باہر دے دیں لیکن سب لوگ ہی مجھے جھوٹا سمجھتے تھے۔

یہاں پر پاکستانی کمیونٹی کے چیئرمین جاوید اسلم آرائیں اور دوسری سماجی تنظیمیں کے سربراہ بھی ملنے کے لیے آتے لیکن میری ان تک رسائی نہیں ہوئی۔ میں ہر روز ایک نئے جذبے سے بیدار ہوتا، سیل کے

سامنے سے گزرنے والے ہر پولیس والے کو وہی پرانی کہانی سناتا اور ناکام ہو کر پھر کسی دوسرے پولیس والے کے گزرنے کا انتظار کرتا رہتا۔ کیمپ کے اندر آہستہ آہستہ میں پاگل مشہور ہونے لگا جو جیل کے اندر رہتے رہتے اپنے ہواس کھو بیٹھا تھا اور ایک ہی سٹوری روزانہ ہر ایک کو سناتا رہتا تھا۔

''سر! میرے پاس سارے کاغذات ہیں۔۔۔ سٹے کارڈ بینک کارڈ، نیشنل ٹیکس نمبر آپ چیک کر لیں! نیکیا (NIKEA) کے اندر میرا گھر ہے۔ آپ ایک بار نیکیا میں میرے دوستوں کو اطلاع کر دیں وہ میرے لئے وکیل کر لیں گے۔ پلیز سر! ایک بار نیکیا میں میری اطلاع کر دیں، صرف ایک بار؟'' میں ہر ایک سے یہی بات کہتا رہتا لیکن کوئی بھی میری بات سننے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتا تھا۔

پولیس والے اب میری بات بھی نہیں سنتے تھے لیکن میں پھر بھی کوشش کرتا رہتا تھا۔ مجھے اس کیمپ میں رہتے ہوئے تقریباً 15 مہینے سے اوپر ہو گئے۔ اس دن صبح صبح ایک ینگ پولیس والا ڈیوٹی پر آیا۔ یہ بالکل ابھی نیا نیا ہی پولیس سروس میں آیا تھا۔ خوبصورت یورپین چہرہ اور سنہری بال اس کی عمر صرف اکیس یا بائیس سال تھی۔

''سر پلیز! مہربانی کر دو۔ ایک بار میری اطلاع باہر بھجوا دو میرے پاس اصل کاغذات ہیں۔ آپ میری اطلاع میرے گھر تک پہنچا دیں، نیکیا میں میرا گھر ہے۔'' میں جلدی جلدی بول رہا تھا۔ زیادہ تر پولیس والے میری بات پوری سنے بغیر ہی آگے نکل جاتے تھے لیکن وہ کھڑا رہا اور اس نے میری پوری بات سنی۔

''تمہارے پاس تمہارے گھر کا فون نمبر ہے؟'' اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی جی! میرے پاس نمبر ہے۔'' مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ مجھ سے میرے گھر کا نمبر مانگ رہا تھا۔

''ٹھیک ہے! مجھے لکھوا دو، میں بات کرتا ہوں۔'' اس نے موبائل نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا اور میں جلدی جلدی نمبر بتانے لگا تو اس نے اسی وقت نمبر ڈائل کر کے موبائل کان سے لگا لیا۔ دوسری طرف سے نمبر آف تھا۔

پاکستان میں نیا نیا پیکج سسٹم متعارف ہوا تھا۔ کمپنیاں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے ایک

سے بڑھ کر ایک اچھا پیکج اور کال ریٹ متعارف کروا رہی تھیں۔ ہمارے گھر والوں نے بھی پرانی کمپنی چھوڑ کر ایک دوسری کمپنی کی سم لے لی تھی کیونکہ نئی کمپنی کا کال ریٹ اچھا تھا۔ میرے پاس پاکستان کا صرف ایک ہی نمبر تھا۔ وہاں بھی میں مہینے میں کہیں ایک بار فون کرتا تھا۔

''یہ تو آف ہے، میں ایک بار پھر ٹرائی کرتا ہوں۔'' اس نے دوبارہ مجھ سے پوچھ کر نمبر ملایا لیکن اس بار بھی دوسری طرف سے نمبر آف تھا۔

''یہ نمبر تو پکا آف ہے، کوئی دوسرا نمبر ہے تو بتاؤ، یہاں نیکیا کا کوئی نمبر بتادو!'' اس بار میں نے خلیل کا نمبر بتایا اور پھر شفاقت کا۔۔۔دونوں کے نمبر بند جا رہے تھے۔

یہاں بھی ایک پرابلم تھی۔ پہلے پہلے یونان میں ووڈا فون (VODA PHONE) کی سم استعمال ہوتی تھی اور پاکستان بات کرنے کے لیے ٹیلی فون بوتھ کے کارڈ استعمال ہوتے تھے۔ پاکستان بات کرنے کے لیے جو بوتھ کارڈ استعمال ہوتے تھے وہ یہاں پاکستانی کمپنیاں بناتی تھیں۔ ووڈا فون سے ووڈا فون 5 یورو کا کارڈ لوڈ کرنے پر 5 ہزار منٹ فری تھے۔ پاکستانی فون بوتھ کمپنیاں اسی چیز کا فائدہ اٹھاتی تھیں۔ انہوں نے کرائے پر گھر لیے تھے اور پندرہ بیس سمیں رکھی ہوئی تھیں۔ ہم ان پندرہ بیس نمبروں میں سے کسی ایک نمبر پر فون کرتے اور اگر وہ نمبر مصروف ہوتا تو دوسرا نمبر ٹرائی کرتے۔ نمبر لگ جاتا تو وہاں پر رکھا ہوا کمپیوٹر ہمارا رابطہ کمپنی کے مین سرور تک کروا دیتا۔ اس کے بعد ہم کارڈ کے اوپر دیے ہوئے سکریچ نمبر ڈائل کرتے تو ہمارا بیلنس بتایا جاتا اور پھر ہم پاکستان اپنے مطلوبہ نمبر پر فون کر سکتے تھے۔

ہمارا ڈبل ریچارج ختم ہوتا تھا۔ ایک پانچ ہزار والا ووڈا فون ٹو ووڈا فون اور دوسرا بوتھ کارڈ کا بیلنس ۔۔۔ یہ دو نمبر کا کام ایک نمبر طریقے سے ہوتا تھا۔ ووڈا فون والے ان نمبروں کو پکڑتے تھے اور بلاک کر دیتے تھے۔ پاکستانی کمپنی والے پرانی بلاک سموں کو پھینک دیتے اور نئی خرید لیتے تھے۔ ووڈا فون والوں نے بہت زور لگایا لیکن اس چیز کو ختم نہ کر سکے۔ پورے یونان میں پاکستان کے لیے فون اسی طریقے سے ہوتا تھا۔

آخر کار یونانی کمپنی نے ایک پاکستانی کمپنی سے معاہدہ کیا اور شراکت داری کی بنیاد پر اس سارے سسٹم کو ایک کر کے ایک نئی سم نکال دی۔ مارکیٹ میں ووڈا فون اور براق ٹریول کے اشتراک سے تازا (TAZA) سم آ گئی۔ یہ ڈائریکٹ پاکستان کال کرواتی تھی اور یونان کے اندر بھی کال ہو جاتی تھی۔ بوتھ کارڈ

کا سسٹم کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہوگیا اور ہر پاکستانی نے تازا سم خرید لی۔ آج یونان کے اندر جتنے بھی پاکستانی ہیں ان کے پاس تازا کی سم ہے۔ اس نوجوان پولیس والے نے خلیل اور شفاقت دونوں کے نمبروں پر ٹرائی کیا لیکن دونوں ہی اپنی اپنی سمیں تبدیل کر چکے تھے۔ میرا باہر کی دنیا سے رابطہ مکمل طور پر ٹوٹ چکا تھا۔

''آپ کا تو کوئی بھی نمبر نہیں لگ رہا، اب میں کیا کر سکتا ہوں آپ کے لیے؟'' اس نے میرے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''سوری سر! میں نے بہت زیادہ آپ کا ٹائم لے لیا۔ 15 مہینے ہو گئے ہیں میرا گھر سے رابطہ نہیں ہوا ہے۔ پتہ نہیں کیوں سب کے ہی نمبر بند ہیں۔'' میں نے بے چارگی سے کہا۔

''کیا واقعی تمہارے پاس اصل کاغذات ہیں؟'' اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی سر! میرے پاس اصل کاغذات ہیں۔ پتہ نہیں کیوں کوئی بھی میری بات نہیں سن رہا ہے۔'' میں نے زمین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں! بہت سے لوگ فرسی اووگی سے متاثر ہیں کیونکہ یہ لوگ مہاجرین سے نفرت کرتے ہیں۔'' اس نے موبائل جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''سر! آپ نفرت نہیں کرتے ہم سے؟'' میں نے اس سے پوچھا تو وہ مسکرانے لگا۔

''نہیں یار! میرا والد سبزی کا کام کرتا ہے۔ تھیوا (THIWA) میں ہماری زمین ہے جن کے اوپر میرا والد سبزی لگاتا ہے اور ایتھنز کی سبزی منڈی میں لا کر بیچتا ہے۔ جب سے یہ حالات ہوئے ہیں تھیوا کے اندر مزدور ملنا مشکل ہوگیا ہے۔ سبزی کا کام کرنے کے لیے کوئی لڑکا ہی نہیں ملتا اور سبزیاں کھیتوں میں پڑی گل جاتی ہیں۔ رضوان صاحب! یونان کو مزدوروں کی ضرورت ہے۔ سبزی کی سب سے کم کاسٹ (Cost) یہاں یونان میں پڑتی ہے اور ہم پورے یورپ کو ایکسپورٹ کر لیتے تھے لیکن ان بے وقوفوں کی وجہ سے اٹلی اور سپین ہم سے آگے نکل رہا ہے۔ مزدور کم ہوگا تو مزدوری بڑھے گی اور چیزیں مہنگی بنتی ہیں۔ جب رومانیہ اور بلغاریہ سے بغیر کسٹم کے سستا سامان بن کر یونان آئے گا تو یہاں کا مہنگا سامان کون خریدے گا؟ یونان کو

مہاجرین کی ضرورت ہے۔ آپ لوگ اگر چلے گئے تو ہماری انڈسٹری بند ہو جائے گی، جیسے زراعت بند ہو رہی ہے۔ پھر یہ بیٹھے رہیں گے فیکٹریوں میں۔۔۔'' وہ بات کرتے کرتے کافی سیریس ہو گیا۔

''اچھا اب میں نکلتا ہوں یار! کوئی اور کام ہے تو بتاؤ؟'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''مجھے نیکیا کے گھر کا ایڈریس پتا ہے۔ اگر آپ مہربانی کرنا چاہتے ہو تو میرے گھر چلے جاتے؟'' میں نے آہستہ سے کہا۔ فون تک تو بات ٹھیک تھی لیکن گھر تک جانے کی محنت شاید وہ نہ کرتا۔

''چلو یار! کیا یاد کرو گے۔۔۔ مجھے اپنے گھر کا ایڈریس لکھا دو!'' اس نے ایک بار پھر موبائل نکال لیا۔ میں نے اسے اپنے نیکیا کے گھر کا ایڈریس لکھوایا تو اس نے نوٹ کیا اور آگے چلا گیا۔ دوسرے دن وہ دوبارہ آیا تو ایک اور بری خبر ملی۔ نیکیا میں ان لوگوں نے مکان چھوڑ دیا تھا اور اب ان کا کوئی پتہ نہیں تھا کہ وہ کہاں رہ رہے ہیں۔

''رضوان صاحب! معذرت کے ساتھ۔۔۔ آپ کا باہر کی دنیا سے رابطہ مکمل ٹوٹ چکا ہے اور اب کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ شاید تمہاری قسمت میں جیل لکھی ہوئی ہے۔'' اس نے افسردہ لہجے میں کہا۔

''کوئی بات نہیں سر! آپ کی بہت مہربانی آپ نے میرے لیے محنت تو کی ہے۔ باقی خدا کرم کرے گا۔'' میں آرام سے پیچھے جا کر بیٹھ گیا۔

میرے سارے راستے بند ہو گئے تھے۔ ایک ہفتہ ایسے ہی گزر گیا۔ تب تک وہ پولیس والا میرا دوست بن گیا تھا۔ میری اب روزانہ ہی اس سے بات ہوتی تھی۔ اس نے ہمارے مالک مکان سے بھی پوچھ لیا تھا لیکن ان کو بھی نہیں پتہ تھا۔ اس نے آ کر پاس کے پاکستانی مکانوں سے بھی معلومات لی تھیں لیکن وہ پولیس والے کی وجہ سے اعتبار نہیں کر رہے تھے یا شاید ان کو پتہ ہی نہیں تھا۔ بحرحال میں باہر رابطہ کرنے میں ناکام ہو رہا تھا۔ خلیل اور شفاقت جس جگہ کام کرتے تھے مجھے اس جگہ کا تو پتہ تھا لیکن اس کا ایڈریس معلوم نہیں تھا۔ یہ امونیا کی پچھلی طرف پانچ چھ گلیاں ہیں جہاں سلائی کا کام ہوتا تھا۔ یہاں کم از کم 100 سے زائد دکانیں تھیں جہاں سلائی کا کام ہوتا تھا۔ مجھے ان کی دکان کا کوئی پتہ یا نشانی بھی نہیں تھی اس لیے وہ وہاں تک بھی نہیں پہنچ سکا تھا۔

دوسرا ہفتہ بھی گزر گیا۔ اس نے امونیا کے تین چکر لگائے تھے لیکن پھر بھی ناکام رہا تھا۔

''یار! کچھ تو کرو، کوئی تو ملا ہوگا تمہیں؟ اپنے اسٹے کارڈ کا نمبر تک یاد نہیں ہے؟ اب باہر کے حالات ٹھیک ہو گئے ہیں۔ اگر تمہاری کوئی بھی چیز مل گئی تو تم آسانی سے باہر آ سکتے ہو۔'' اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یار! کوئی نہ کوئی حل تو ہوگا ہی نا؟ آخر ایسے ہی بے نام کیسے رہ سکتے ہو؟'' وہ دو مہینے سے ٹرائی کر رہا تھا۔ اس نے امیگریشن آفس سے بھی پتہ کروالیا تھا لیکن وہاں سے بھی کچھ نہیں ملا تھا۔

''ایک راستہ ہے! پاکستانی کمیونٹی آفس میں اگر آپ ٹرائی کرو تو شاید کام بن جائے۔ جاوید اسلم آرائیں بہت اچھا انسان ہے وہ اگر چاہے تو کام بن سکتا ہے۔'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے! میں آج ہی چھٹی کر کے چلا جاتا ہوں، تم مجھے اس کے دفتر کا پتہ بتا دو۔'' وہ میری بات سنتے ہی پرجوش ہو گیا۔

''سر! میرے پاس اس کے دفتر کا پتہ نہیں ہے۔'' میں نے بے چارگی سے کہا تو اسے غصہ آ گیا۔

''یار کیسے انسان ہو؟ پانچ سال ہو گئے تمہیں یونان میں رہتے ہوئے اور تمہیں کچھ بھی پتہ نہیں ہے؟ پاکستان کے وزیر اعظم کا پتہ ہے کیا نام ہے اس کا؟'' اس نے غصے سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''سر! آپ امونیا کے اندر کسی بھی پاکستانی دکان سے پتہ کرو گے تو آپ کو جاوید اسلم آرائیں کا پتہ مل جائے گا۔ اس کے لیے محنت نہیں کرنی پڑے گی۔''

''اوہ! یہ تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ ظاہر ہے کمیونٹی کا چیئرمین ہے تو سب کو پتہ ہوگا!'' اس نے سر کھجاتے ہوئے کہا تو میں مسکرانے لگا۔

''میں آج ہی ڈیوٹی آف کر کے چلا جاؤں گا۔ اس بار امید ہے کام ہو جائے گا۔'' اس کی آنکھوں میں جوش چھلکنے لگا۔

''سر جی! کمیونٹی والوں سے اپنے آپ کو بھی بچا کر رکھنا، یہ آپ کو اس معاملے میں گھسیٹنے کی کوشش کریں

گے۔'' میں نے اسے روکتے ہوئے کہا۔

''نہیں نہیں! میں صرف تمہاری اطلاع ان تک پہنچاؤں گا، اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔'' اس نے میرے خدشات کی نفی کرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے! لیکن پھر بھی محتاط رہنا! آپ کی ملازمت پہ کوئی بات نہ آجائے۔'' وہ بہت اچھا انسان تھا اور مجھے اس کی فکر تھی کہ کہیں میری وجہ سے وہ اپنی نوکری سے نہ ہاتھ دھو بیٹھے۔

''رضوان صاحب! ہم اتنے بھی بے وقوف نہیں ہیں جتنے تم سمجھ بیٹھے ہو۔ مالک مالک ہی ہوتا ہے اور ہم بحرحال یہاں آپ کے مالک ہیں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ شام کو وہ ڈیوٹی ختم کر کے چلا گیا۔ دوسرے دن صبح صبح سیدھا میرے ہی سیل پر آ گیا۔

''رضوان صاحب! مبارک ہو، آپ کا کام ہو گیا ہے۔ میری ملاقات ہوئی ہے جاوید اسلم سے اور اس نے آپ کی مدد کرنے کی ہامی بھر لی ہے۔ یار! وہ ایک دو دن تک سارا پیپر ورک مکمل کر لے گا اور پھر آئے گا۔ تم اب باہر آ جاؤ گے۔'' اس کا چہرا خوشی سے دمک رہا تھا۔

''یہ سب آپ کی مہربانی ہے۔ آپ نے بہت محنت کی ہے میرے لیے۔ خدا آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔'' میں نے اس کے ہاتھ کو پکڑتے ہوئے کہا۔

''واقعی سر! آپ نے میرے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ میں ایک غریب سا پاکستانی مزدور ہوں۔ اگر آپ کی مدد میرے ساتھ نہ ہوتی تو میں پتہ نہیں اور کتنا عرصہ یہیں قید رہتا۔'' واقعی اس نوجوان پولیس والے کی بدولت آج میرا کیس اس جیل سے باہر چلا گیا تھا۔

''یار! ابھی اتنا خوش مت ہو، صرف اس نے حامی بھری ہے۔۔۔تم باہر نہیں چلے گئے۔ اس لئے پہلے سے ہی خوش مت ہو۔ بہت زیادہ بھروسہ کر لو تو ٹوٹنے پر دکھ بھی اتنا ہی ہوتا ہے۔ دو تین دن تک ہمیں انتظار کرنا ہو گا ورنہ پھر کوئی اور راستہ دیکھنا ہو گا۔'' اس نے مجھے ٹوکتے ہوئے کہا۔

''ویسے تم یہاں سے پھر کہاں جاؤ گے اور کام وغیرہ کا کیا کرو گے؟ وہ مجھ سے پوچھنے لگا۔

''دیکھ لوں گا، مجھے امونیا میں خلیل کی دکان کا پتہ ہے وہاں چلا جاؤں گا۔'' میں نے سلاخوں سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

''یار! ایتھنز میں کام ملنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ انڈسٹری بند ہو گئی ہے اور لوگ گھروں میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اگر کام کرنا ہو تو میرے والد کے ساتھ تھیوے میں کر سکتے ہو۔ تم نے بتایا تھا کہ تمہیں کھیتی باڑی کے کام کا بہت تجربہ ہے۔ سبزی کا کام جانتے ہو؟ میرے والد اب سبزی کا کام تو نہیں کرتے بلکہ صرف گندم بیچتے ہیں۔ ایک لڑکے کی ضرورت تو بہرحال ہوتی ہے۔ تم چلے جاؤ گے تو ابو کو سہولت مل جائے گی۔ باقی تمہاری مرضی ہے۔''

''جی ٹھیک ہے! جیسے آپ کہتے ہو، میں خلیل سے ایک بار مل لوں گا۔ ان کے رابطہ نمبرز وغیرہ لے لوں گا تو پھر اس کے بعد تھیوے چلا جاؤں گا۔'' اس نوجوان پولیس والے نے میرے لیے بہت کچھ کیا تھا اور اب میں اس کے لیے کچھ تو کر سکتا تھا۔ مجھے کام ہی چاہیے تھا، چاہے شہر میں ملے یا گاؤں میں کھیتوں کا کام۔۔۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔''

''نہیں نہیں رضوان! تم آرام سے چیک کر لو، صرف میری وجہ سے مت جاؤ۔ میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا ہے جو تم اس کا بدلہ اتارو گے۔ مجھے معلوم ہے شہر میں تمہیں 25 یورو سے زیادہ مزدوری نہیں ملے گی اور وہ بھی ہفتے میں 5 دن۔۔۔ گھر کا کرایہ، بجلی پانی کا بل اور کھانا، تم دو سو یورو بھی مہینے کا نہیں بچا سکو گے۔ تم پچھلے 18 مہینوں سے جیل میں ہو، شہر کے حالات بالکل بدل گئے ہیں۔ اب کام نہیں ملتا، اگر مل بھی جائے تو اس سے صرف گھر کا خرچہ چلتا ہے۔ مجھے تم اچھے لگتے ہو اور میں تمہارے کام آنا چاہتا ہوں۔'' وہ میری مدد کرنا چاہتا تھا۔

''یار! حقیقت میں تم بہت معصوم اور پیارے ہو۔ تمہاری آنکھوں میں بہت درد نظر آتا ہے۔ پتہ نہیں کیوں مجھے لگتا ہے کہ تم وہ نہیں ہو جو باہر سے نظر آتے ہو۔'' اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں یار! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے صرف کام چاہیے اور سبزی کا کام کرتے ہوئے مجھے خوشی ہوتی ہے۔ صرف ایک بات اور ہے۔۔۔ میں آگے جانا چاہتا ہوں، اس لئے صرف کچھ مہینے ہی کام کروں گا۔ جیسے ہی مجھے آگے جانے کا کوئی سہارا مل گیا تو میں کام چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ یہ بات میں پہلے ہی بتا دیتا

ہوں تاکہ بعد میں آپ کو کوئی پریشانی نہ ہو۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''آگے کہاں جانا چاہتے ہو؟ جرمنی جانے کا ارادہ ہے؟'' اس نے مجھ سے سوال کیا۔

اس وقت جرمنی نے مہاجرین کی کھل کر مدد کرنا شروع کر دی تھی۔ جرمنی نے مہاجرین کو پناہ دینے کے لئے بڑے بڑے کیمپ بنانا شروع کر دیئے تھے۔ اس لئے لڑکوں نے یونان چھوڑ کر جرمن اور اٹلی جانا شروع کر دیا تھا۔

''نہیں! میں کہیں اور جانا چاہتا ہوں۔'' مجھے اسے صرف یہی بتانا تھا کہ میں کسی بھی وقت کام چھوڑ کر جا سکتا ہوں۔

''پھر بھی یار! بتاؤ تو۔۔۔آخر کہاں جانا چاہتے ہو؟'' اس نے اصرار کرنا شروع کر دیا۔

''میں امریکہ جانا چاہتا ہوں کوستا!''

اس کا پورا نام چیچوز کوستا (TSITSOS-KOSTA) تھا۔ اپنا نام چیچوز اور فیملی نام کوستا تھا۔ یونان میں کوستا، اندونی اور دیمتری (KOSTA, ANDONY AND DEMITTRY) یہ تین نام ہی پورے نام میں رکھے جاتے ہیں۔ ہر 10 میں سے آٹھ آدمیوں کا نام ان تینوں میں سے کوئی ایک ہو گا۔ جس طرح ہمارے پاکستانی ناموں میں محمد اور علی استعمال ہوتا ہے اور پٹھانوں کے ناموں میں خان (Khan) استعمال ہوتا ہے بالکل اسی طرح تقریباً ہر یونانی نام ان تینوں میں سے کسی ایک نام پر مشتمل ہوتا ہے۔

''تم امریکہ جانا چاہتے ہو؟ لیکن امریکہ کیسے؟ میں سمجھا نہیں!'' اس کو واقعی میری بات کی سمجھ نہیں آئی تھی۔

''سر جی! سمجھنے کی کیا ضرورت ہے؟ ویسے بھی آپ پولیس والے ہو اور میں آپ کو کوئی بھی معلومات نہیں دے سکتا، بس اتنا کافی ہے۔ مجھے جب بھی کوئی راستہ مل گیا تو میں چلا جاؤں گا۔ اگر کامیاب ہو گیا تو ٹھیک ورنہ پھر واپس آ جاؤں گا اور دوبارہ پھر کسی اور راستے کی تلاش شروع کر دوں گا۔ تب تک کوشش کرتا رہوں گا جب تک امریکہ پہنچ نہیں جاتا۔'' میں نے اس کو کوئی بھی تفصیل دینا مناسب نہ سمجھا۔

’’چلو! ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔‘‘ وہ دوسری بیرکوں کی طرف چلا گیا۔

جاوید اسلم آرائیں کو اس کیمپ تک پہنچنے میں ہفتہ لگ گیا۔ ہفتے بعد آیا لیکن وہ آ گیا۔ وہ اپنی پوری تیاری کے ساتھ آیا تھا۔ یہاں اس کیمپ میں ملاقات کا ٹائم 3 بجے سے 5 بجے تک تھا اور وہ ٹھیک 3 بجے اپنے ساتھ ایک یونانی وکیل کو لے کر آ گیا تھا۔

’’رضوان صاحب! کیسے ہو؟‘‘

’’کوستا! آپ کیسے ہو؟‘‘ کوستا اس وقت میرے ساتھ ہی کھڑا تھا جب جاوید اسلم آرائیں ادھر آیا۔ اس نے پہلے مجھ سے حال چال پوچھا اور پھر کوستا سے ہاتھ ملانے لگا۔ کوستا نے خاموشی سے اس سے ہاتھ ملایا اور دوسری طرف چلا گیا۔ وہ اپنی جاوید اسلم سے پہچان ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

’’رضوان بیٹا! کیسے ہو؟ میں جاوید اسلم آرائیں ہوں!‘‘ اس نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

میں نے جاوید اسلم آرائیں کا صرف نام سنا ہوا تھا۔ مجھے معلوم تھا وہ پاکستانی کمیونٹی کے چیئر مین ہیں اور ان کی خدمات کا ذکر بھی سنتا رہا تھا۔ یہ پاکستانی کمیونٹی کا واحد سربراہ ہے جس کی کمیونٹی کے لیے اعتراف ایمنسٹی انٹرنیشنل نے کیا ہے اور انہیں ایوارڈ سے بھی نوازہ تھا۔ اس کی سحر انگیز شخصیت کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہو کہ یہاں پاکستانی مہاجرین اپنی کسی بھی قسم کی پرابلم کے لیے پاکستانی ایمبیسی کی بجائے پاکستانی کمیونٹی آفس جاتے تھے۔ ان کی خدمات کا اعتراف پاکستانی حکومت نے انہیں بلیک لسٹ کر کے کیا تھا۔ ہم پاکستانی قوم ہیں۔۔۔ اگر ہم اپنے ایٹمی سیاستدان سے معافی منگوا سکتے ہیں، انہیں جبراً ریٹائرڈ کر کے گھر بھیج سکتے ہیں تو پھر ایسی حکومت سے آپ کیا امید لگا سکتے ہو؟

پوری دنیا میں یہ بھی ایک ریکارڈ ہے کہ ہماری پاکستانی ایمبیسی نے پورے یونان میں مقبول ترین اور عوام کے ووٹوں سے منتخب ہونے والے جمہوری لیڈر کو نہ صرف بلیک لسٹ کیا بلکہ ان کے ساتھ دو سو سے اوپر لوگوں کو بلیک لسٹ کر دیا۔ دنیا کی کوئی بھی ایمبیسی دو چار لوگوں سے زیادہ بلیک لسٹ نہیں کرتی لیکن ہماری ایمبیسی نے دو سو سے زیادہ لوگوں کو صرف ان کی شہرت سے حسد کر کے بلیک لسٹ کر دیا۔

’’جی رضوان بیٹا! سوری مجھے ایک ہفتہ لگ گیا یہاں آتے آتے۔۔۔ میں پوری تیاری سے یہاں آنا

چاہتا تھا۔ میں نیکیا میں گیا تھا۔تمہارا دوست، کیا نام ہے۔۔۔خلیل، میں نے اس کو ڈھونڈ نکالا تھا۔ میں اس سے تمہارے ریڈ کارڈ اور میڈیکل کارڈ کی فوٹو کاپی لے کر امیگریشن آفس گیا۔تم نے ڈیڑھ سال سے اپنا کارڈ رینیو نہیں کروایا تھا۔ امیگریشن ڈیپارٹمنٹ تمہارا کیس ختم کرنے والا تھا۔انہوں نے تین لیٹر بھی تمہارے گھر بھیجے تھے لیکن وہ سارے پرانے گھر کے پتے پر گئے تھے اور واپس آ گئے۔ان کو کسی نے بھی رسیو نہیں کیا۔ میں وکیل کو لے کر ان کے پاس گیا اور ساری کہانی سنائی تو وہ تمہارا کیس سننے کو تیار ہو گئے ہیں۔ ابھی میں جیل انچارج سے بات کرتا ہوں اور دو تین دن تک امیگریشن ڈیپارٹمنٹ سے کوئی آدمی آ کر تمہارے فنگر پرنٹ لے لے گا اور اگر تم واقعی سیاسی پناہ کے لئے کارڈ ہولڈر ہو اور تمہارا ریڈ کارڈ اور یجنل ہے تو وہ انکوائری بورڈ بٹھائیں گے اور اس کے ذمہ داروں کو سزا ملے گی۔ یونان کا کوئی قانون تمہیں پھر سزا کے طور پر ایک دن بھی اندر نہیں رکھ سکتا۔ انہوں نے تمہیں ڈیڑھ سال اندر رکھا ہے تو اس کی سزا بھی انہیں ملے گی۔فرسی اووگی ختم ہو گئی ہے اور یہ لوگ پولیس کے اندر بھی فرسی اووگی کے ہمدرد ڈھونڈ رہے ہیں جنہوں نے تجھے صرف نفرت کی بنیا پر ڈیڑھ سال تک جیل میں رکھا۔'' میں کسی عقیدت مند کی طرح ان کی باتیں سن رہا تھا۔

میں جاوید اسلم آرائیں سے پہلی بار مل رہا تھا لیکن ان کی سحر انگیز شخصیت کے سحر میں کھو گیا تھا۔ یونان میں رہنے والے پاکستانی میری اس بات سے اتفاق ضرور کریں گے۔ حقیقی لیڈر اگر کسی نے دیکھنا ہے تو وہ اسے آ کر دیکھ لیں۔ میں صرف تعریف نہیں کر رہا ہوں۔اس نے مجھے جیل سے رہا کروایا تھا تو میں بدلے میں اس کی تعریف کر رہا ہوں۔نہیں! میں ویسے بھی یونان سے آ چکا ہوں۔ میری منزل یونان نہیں تھی جو میں یونانی بندوں کی بات کروں۔ میرے جیسی سینکڑوں کہانیاں یونان میں بکھری ہوئی ہیں جن کی اس آدمی نے مدد کی ہے۔ یہ بلیک لسٹ ہوا، کاروبار چھوڑ دیا، یہاں تک کہ جیلوں کی ہوا کھائی لیکن کبھی بھی کسی سے ڈرا نہیں۔ میری میاں برادران (نواز شریف اور شہباز شریف) سے گزارش ہے کہ آپ ایک بار اس شخص سے مل لیں۔ آپ کو لیڈر کے حقیقی معنوں کا پتہ چل جائے گا۔

''جی سر! آپ کا بہت شکریہ! آپ نے واقعی میرے لئے بہت کام کیا ہے۔'' میں نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں بیٹا! کوئی بات نہیں۔ خدا نے اگر مجھے آپ لوگوں کی خدمت کا موقع دیا ہے تو یہ میرا فرض ہے کہ میں آپ کی مدد کروں۔'' انہوں نے میری گالوں کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

''ہاں! اب پریشان مت ہونا، ایک ہفتے کے اندر اندر تم اس جیل سے باہر ہو گے اور یہاں جتنے بھی پولیس والے پھر رہے ہیں، یہ سب انکوائریاں بھگت رہے ہوں گے۔ انہوں نے ہم لوگوں کو کمزور سمجھا ہوا ہے۔'' اس نے غصے سے پولیس والوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہاں سامنے ہی کوستا کھڑا تھا، میں اسے دیکھ کر ہنس پڑا۔

''ٹھیک ہے! اب میں جیل انچارج کے پاس جاتا ہوں۔'' وہ سامنے ہی جیل انچارج کے دفتر کی طرف چل دیئے۔ جیل انچارج نے انہیں اندر بلایا اور وہ اندر چلے گئے۔ صرف دو منٹ بعد ہی مجھے اس کی اونچی اونچی آواز سنائی دینے لگی۔ وہ جیلر سے لڑ رہا تھا کہ اس نے کیوں مجھے سٹے کارڈ ہونے کے باوجود بھی 18 مہینے تک جیل میں رکھا اور کیوں مجھے اپنی صفائی دینے کا موقع نہیں دیا۔ تقریباً دس منٹ تک زور و شور سے بیان بازی کے بعد دو پولیس والے زبردستی انہیں بازوؤں سے پکڑ کر باہر لے آئے۔

''تم پاکستانی کمیونٹی کے صدر ہو اس لیے سب برداشت کر رہا ہوں ورنہ ابھی جیل میں ڈال دیتا!'' انچارج نے غصے سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم کیا تمہارا باپ بھی مجھے جیل میں نہیں ڈال سکتا۔ جنگل کا قانون نہیں ہے اور تم کسی ریاست کے راجا نہیں ہو جو اپنی مرضی کرتے پھرو گے۔ اس جیل کے انچارج ہو اور تمہیں ان اٹھارہ مہینوں کا حساب بھی دینا پڑے گا۔ اس بچے کے چہرے کی طرف دیکھو! کیا جرم کیا تھا اس بے چارے نے؟ تمہارے بھی بچے ہوں گے۔۔۔ ان بچوں کا چہرہ اس کے چہرے میں دیکھو گے تو رات کو سونا بھی بھول جاؤ گے۔ خدا کی پناہ! 18 مہینے سے تم نے اس بیچارے کو بغیر کسی جرم کے قیدی بنا کر رکھا ہوا ہے۔ اس کے ماں باپ کو پتہ بھی نہیں ہے کہ یہ کہاں ہے۔۔۔ زندہ بھی ہے یا مر گیا ہے۔ تم لوگ تو جانوروں پر بھی ظلم نہیں کرتے ہو اور یہ تو پھر بھی انسان ہے۔ مرنا بھی ہے ایک دن تم لوگوں نے۔۔۔ خدا کو کیا جواب دو گے؟ انسان ہو اور انسان ہی رہو! خدا بننے کی کوشش مت کرو۔'' اس نے میرے کاغذات کی فوٹو کاپیوں کی فائل انچارج کے ہاتھوں میں پکڑائی اور خاموشی سے وکیل کے ساتھ کیمپ سے باہر چلا گیا۔ ہم سب اسے باہر جاتے ہوئے دیکھ رہے

تھے۔

جاوید اسلم آرائیں کی باتوں کا جیلر پر اثر ہو گیا تھا اور وہ میری فائل لے کر کمرے میں چلا گیا۔ آدھے گھنٹے بعد اس نے مجھے اندر بلایا تو میں اندر چلا گیا۔ جیلر بوڑھا آدمی تھا۔۔۔ تقریباً 50 سال کی عمر کا۔ یونان میں کوئی بھی نوجوان آفیسر نہیں ہوتا ہے۔ پولیس کے محکمے میں صرف کانسٹیبل ہی بھرتی ہوتے ہیں اور یہی کانسٹیبل آہستہ آہستہ ترقی کرتے ہوئے اونچے عہدوں پر پہنچتے ہیں۔ پولیس کے محکمے میں اے ایس آئی، انسپکٹر اور ایس پی بھرتی کرنے کا نظام پاکستان اور انڈیا دونوں میں استعمال ہوتا ہے اور یہی سے افسر شاہی شروع ہوتی ہے۔

یہ انگریزوں کا نظام نوآبادیاتی ممالک میں اپنے انگریز افسر بھرتی کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، وہ بطور کانسٹیبل تو ہمارے انڈین بھرتی کر لیتے تھے اور ان پر افسر گورے انسپکٹر یا ایس پی بھرتی کرتے تھے۔ یہ نظام آج بھی پاکستان اور انڈیا میں رائج ہے۔ گوروں کی جگہ رشوت خوروں نے لے لی ہے جو بیس پچیس لاکھ دے کر اے ایس آئی بھرتی ہو جاتے ہیں۔

''کرسی پر بیٹھ جاؤ بیٹا!'' اس نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میں خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔

''یہ کاغذات تمہارے ہیں؟ نام کیا ہے تمہارا؟ اس نے مجھ سے نام اور پتہ پوچھا۔

میں اسے اپنا نام، پتہ اور ایڈریس بتاتا رہا اور وہ کاغذات سے دیکھ کر تصدیق کرتا رہا۔ میرے سٹے کارڈ پر تصویر لگی ہوئی تھی۔ وہ اس تصویر کو بھی بغور دیکھتا رہا۔ آخر کار تقریباً آدھے گھنٹے کے مسلسل انٹرویو کے بعد وہ مطمئن ہو گیا کہ میں واقعی اوریجنل لڑکا ہوں اور میرے ساتھ زیادتی ہو گئی ہے۔ اس کے بعد وہ میرا گھر بار اور فیملی وغیرہ کا پوچھتا رہا، ایک گھنٹے تک اس نے مجھے فارغ کر دیا اور میں واپس اپنے بیرک میں آ گیا۔

دوسرے دن جیلر صبح صبح آٹھ بجے کے قریب آیا۔ اس نے ایک کاغذ پر میری انگلیوں کے نشان لئے اور واپس چلا گیا۔ دوبارہ واپسی اس کی 3 بجے کے قریب ہوئی اور اس نے آتے ہی مجھے اندر بلا لیا۔ اس بار کمرے میں کوستا کو بھی بلا لیا گیا۔

''تم دونوں بیٹھ جاؤ!'' اس نے کرسیوں کی طرف اشارہ کیا تو ہم دونوں بیٹھ گئے۔ میری اور کوستا کی دوستی کا اسے پتہ تھا اس لئے اس نے ہم دونوں کو اکٹھا ہی بلا لیا تھا۔

''رضوان بیٹا! سب سے پہلے تو میں تم سے معافی مانگتا ہوں، واقعی مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔ میں تم کو جھوٹا سمجھتا تھا۔ تمہیں راستے میں روکنے والے اور تھانے میں لانے والے پولیس والوں نے تمہیں جان بوجھ کر تھانے میں بند کر رکھا تھا اور تمہارے سارے کاغذات ضبط کر کے شاید جلا دیئے ہوں گے۔ یہ سارا قصور اس پولیس والوں کا تھا جس نے تمہارا کیس بنایا تھا اور تمہیں اس کیمپ میں بھیج دیا۔ ہم لوگ تو صرف اسی کے بنائے ہوئے کیس پر کام کر رہے تھے۔ لیکن پھر بھی غلطی ہم سب سے ہوئی ہے اور اب انکوائری میں ہم سب پھنس جائیں گے۔ میری جگہ پر کوئی اور انچارج ہوتا تو کسی اور کیس میں تمہارا نام ڈال کر اپنی جان بچا لیتا مگر میں ایسا نہیں کروں گا۔ تمہارے ساتھ پہلے ہی زیادتی ہوئی ہے اور میں مزید اور کچھ بھی نہیں کروں گا بلکہ صرف تم سے معافی مانگتا ہوں۔۔۔ مجھے معاف کر دو! میں تمہیں ابھی آزاد کر سکتا ہوں۔ صرف کچھ کاغذات پر دستخط کرنا ہوں گے۔ ان کاغذات کے مطابق تمہیں صرف تین دن پہلے گرفتار کیا گیا تھا اور آج تمہاری انگلیوں کی شناخت ہونے پر تمہیں چھوڑا جا رہا ہے۔ معافی نامہ لیٹر کے ساتھ تم ہم پر کسی قسم کا کوئی کیس نہیں کر سکتے۔ دیکھو بیٹا! ہم تمہیں تمہارے اٹھارہ مہینے تو نہیں لوٹا سکتے۔ انکوائری بہت لمبی ہو جائے گی۔۔۔ سال دو سال مزید تم تھانوں کے چکر لگاتے رہو گے۔ آخر میں پھر بھی معاف ہی کرنا پڑے گا۔ باقی جو تمہاری مرضی ہے۔ تمہارا یہ دوست کوستا بھی اسی انکوائری میں آ جائے گا۔ میری تو ملازمت تقریباً ختم ہو گئی ہے۔ میں ریٹائرڈ ہونے والا ہوں اور یہ تو جوان ہے اور اس نے ابھی بہت اوپر تک جانا ہے۔ اگر یہ کیس اس کے کاغذات پر لگ گیا تو ساری زندگی چھوٹے لیول پر ہی نوکری کرتا رہے گا، کبھی بھی ترقی نہیں کر سکے گا۔ سوچ لو بیٹا! میں تحریری طور پر تم سے معافی مانگ رہا ہو۔'' اس نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا اور ایک فائل میری طرف بڑھا دی۔ کوستا نے وہ فائل لے کر پڑھنا شروع کر دی۔ مجھے یونانی زبان بولنی آتی تھا اور پڑھ بھی لیتا تھا لیکن اتنی روانی سے نہیں۔

''کوستا! کدھر دستخط کرنے ہیں؟ میں دستخط کرنے کے لئے تیار ہوں۔'' میں نے کوستا سے مخاطب ہو کر کہا۔ وہ فائل پڑھنے میں مصروف تھا۔

''نہیں یار! تم اچھی طرح دیکھ لو، جاوید اسلم آئے تو ان سے بھی پوچھ لینا۔ اتنی جلدی مت کرو!'' کوستا نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''نہیں یار! مجھے کسی سے بدلہ نہیں لینا۔ میرے ساتھ جس نے بھی زیادتی کی ہے میں اسے معاف کرتا ہوں۔'' میں نے دوٹوک الفاظ میں کہا۔

''یار! تم میری فکر مت کرو، تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے تو تمہیں انصاف بھی چاہیئے۔'' وہ مجھے قائل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

''نہیں یار! مجھے انصاف ہی نہیں چاہیئے۔ میں پہلے ہی بہت دکھی ہوں۔ اس انصاف کے چکر میں کسی کا دل دکھا کر میں اپنے خدا کو ناراض نہیں کرنا چاہتا۔ میری زندگی کا مقصد کچھ اور ہے۔ آپ صرف یہ بتاؤ کہ میں نے دستخط کدھر کرنے ہیں؟'' میں نے اس کے ہاتھ سے فائل لیتے ہوتے کہا۔

''میں بتاتا ہوں کدھر کدھر دستخط کرنے ہیں۔'' جیلر اپنی کرسی سے اٹھا اور وہ مجھے دستخط کرنے والی جگہ بتاتا رہا۔ میں اس کی بتائی ہوئی جگہوں پر دستخط کرتا رہا۔ بعد میں اس نے پیڈ سے کچھ جگہوں پر میری انگلیوں کے نشانات بھی لیے اور فائل بند کر کے باہر کھڑے ایک پولیس والے کو اس کی فوٹو کاپیاں کروانے کا کہا۔

''بیٹا! میں ایک بار پھر تم سے معذرت کرتا ہوں۔'' وہ ایک بار پھر معذرت کرنے لگا۔

''کوئی بات نہیں سر! آپ بڑے دل والے ہو جو اپنی غلطی تسلیم کر رہے ہو۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ بھی مسکرانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ایک پولیس والا کاغذات کی فوٹو کاپیاں کروا کر لایا تو اس نے کچھ کاغذات نکال کر مجھے دے دیئے۔

''رضوان صاحب! آپ فری ہو، اب جیل سے باہر جا سکتے ہو۔'' اس نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

''کوستا! تم بھی اس کے ساتھ جانا چاہتے ہو تو جا سکتے ہو! کل کو ڈیوٹی پر آ جانا، آج چھٹی کر لو۔'' اس نے کوستا سے کہا تو وہ مجھے لے کر کھڑا ہو گیا۔

''شکریہ سر! میں پھر کل آ جاؤں گا۔'' ہم دونوں آفس سے باہر آئے تو وہ جلدی سے وردی تبدیل کرنے لگا۔ وردی اتار کر اس نے سادہ کپڑے پہنے اور مجھے لے کر کیمپ سے باہر آ گیا۔ اس کے پاس کار تھی، اس نے مجھے کار میں بٹھایا اور امونیا آ گیا۔ ہم دونوں سب سے پہلے جاوید اسلم آرائیں کے دفتر چلے گئے۔

''ابھی تو میں تمہاری انگلیوں کے نشانات لینے کے لئے امیگریشن والوں سے تاریخ لے رہا تھا لیکن تم پہلے ہی باہر کیسے آ گئے؟ انہوں نے حیرانگی سے پوچھا۔

''جیلر نے آج ہی مجھے چھوڑ دیا ہے۔'' میں نے کاغذات ان کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ انہوں نے میرے ہاتھ سے کاغذات لے کر پڑھنا شروع کر دیئے۔ ہم دونوں مجرموں کی طرح اس کے سامنے کھڑے ہوئے تھے۔ دفتر میں سات آٹھ اور بھی آدمی بیٹھے ہوتے تھے۔

کمیونٹی آفس تین کمروں پر مشتمل تھا۔ ایک انتظار گاہ(Waiting Room)دوسرا کمیونٹی اخبار(Safiran Pakistan) کا دفتر اور تیسرا جاوید اسلم آرائیں کا دفتر۔ کمیونٹی کا اپنا ویکلی اخبار بھی تھا۔ میرے ساتھ چونکہ کوستا یونانی پولیس مین تھا اس لئے انتظامیہ نے ہمیں انتظار کروانے کی بجائے سیدھا ہی دفتر بجھوا دیا تھا۔

''یہ کیا ہے؟'' اس نے پوری فائل صرف دو منٹ میں ہی پڑھ لی اور غصے سے میری طرف دیکھنے لگے۔

''وہ۔۔۔ جی! میں نے اس کو بولا تھا کہ ایک بار سوچ لے۔'' کوستا نے درمیان میں بولنا چاہا لیکن انہوں نے اسے روک دیا۔

''تم خاموش رہو کوستا صاحب! 18 مہینے اس نے جیل میں گزارے ہیں تم نے نہیں اور اس درد کو میں محسوس کرتا ہوں تم نہیں۔۔۔ اس لیے مجھے اس سے بات کرنے دو!'' کوستا خاموش ہو گیا اور وہ میری طرف غصے سے دیکھنے لگے۔

''تمہیں پتہ بھی ہے تم نے کیا کیا ہے؟ صرف ایک منٹ میں ہی سارا کیس ختم کر دیا ہے۔ تم نے کیوں

معاف کیا ہے ان سب کو؟ مجھ سے مشورہ تک نہیں کیا؟ میں ایک ایک کو گھر بھجواتا۔ ان کو سزا ملتی تو دوبارہ کسی اور پاکستانی کے ساتھ ایسا کچھ کرنے کی جرأت نہ کرتے۔ کس نے بولا تھا تم کو دستخط کرنے کو؟'' وہ غصے سے گرج رہے تھے۔

''سوری سر! مجھ سے غلطی ہوگئی۔ پلیز! معاف کر دیں۔'' میں نے معافی مانگتے ہوئے کہا۔

''او یار! بات معافی کی نہیں غیرت کی ہوتی ہے۔ قانون اسی لیے بنائے جاتے ہیں۔ اگر ایسے ہی ہر کوئی معاف کرنے لگے تو یہ لوگ کسی اور کو پکڑ کر اندر کریں گے۔ میں تمہارے لئے نہیں تم سب پاکستانیوں کے لئے لڑ رہا ہوں۔ کسی ایک کو سزا ملے گی تو باقی کسی بے قصور پاکستانی کو پکڑنے سے ڈریں گے۔''

''سر! مجھ سے غلطی ہوگئی ہے مجھے معاف کر دیں۔ میں بہت غریب آدمی ہوں اس انکوائری کے چکر میں نہیں پڑھنا چاہتا۔'' میں ایک بار پھر معافی مانگنے لگا۔

''معافی مت مانگو تم جیسے لوگ ہوتے ہیں جو تھپڑ کھا کر چپ رہتے ہیں اور تھپڑ مارنے والا شیر ہو کر مزید دس اور لوگوں کو تھپڑ مارتا ہے۔ پہلے تھپڑ کو روکو گے تو باقی دس لوگ اس تھپڑ سے محفوظ رہیں گے۔'' انہیں مزید غصہ آ رہا تھا۔

''کوئی بات نہیں! میں وکیل سے بات کرتا ہوں۔ ہم نئے سرے سے کیس تیار کریں گے۔ اتنی آسانی سے چھوڑنے والا نہیں ہوں۔ تمہیں بے گناہ اگر 18 مہینے انہوں نے جیل میں رکھا ہے تو اس کی سزا بھی انہیں ملنی چاہیئے۔'' انہوں نے نرم پڑتے ہوئے کہا۔

''سر! مجھے کیس نہیں کرنا ہے، میں نے ان کو معاف کر دیا ہے۔'' میں نے نیچے ٹیبل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا کیا کہہ رہے ہو؟ ان لوگوں نے تمہیں 18 مہینے بغیر کسی جرم کے قید میں رکھا ہے۔ دنیا کا کوئی بھی قانون اس چیز کی اجازت نہیں دیتا۔ یہ لوگ جانور ہیں۔ میں انسانی حقوق کی تنظیموں کے پاس جاؤں گا اور انہیں بتاؤں گا کہ دنیا میں ابھی تک ایسا ایسا بھی ظلم ہو رہا ہے۔ ظالم کا ہاتھ روکنا بھی سنت ہے اور میں ان چیزوں سے ڈرتا نہیں ہوں۔'' وہ میرے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔

''سر! آپ نے 23 مارچ یا 26 جنوری کو پاکستان اور انڈیا کے قومی دنوں پر دونوں طرف کے قیدیوں کو چھوڑے جانے کی کوئی ویڈیو دیکھی ہے؟'' میں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں! مجھے تمہاری بات کی سمجھ نہیں آئی۔'' انہوں نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔

''آپ کے پاس انٹرنیٹ ہے، یوٹیوب کھول کر دیکھ سکتے ہو۔ ایک دو نہیں کوئی سو سے زیادہ ویڈیو مل جائیں گی۔ ان غریب ماہی گیروں کے چہروں کو ذرا غور سے دیکھنا، آپ کو انسانی حقوق کے مطلب کی سمجھ آجائے گی۔

''تمہارے کیس کا ان ماہی گیروں سے کیا تعلق ہے؟'' ان کو ابھی تک میری بات کی سمجھ نہیں آئی تھی۔

''سر! میں تعلق کی نہیں انسانی حقوق کی بات کر رہا ہوں۔ سمندر کے اندر کوئی تاریں نہیں ہوتی، کوئی بارڈر کا نشان نہیں ہوتا ہے۔ غلطی سے اگر کوئی کشتی اِدھر یا اُدھر چلی جائے تو کئی کئی سال کی قید اور اذیتیں مقدر بن جاتی ہیں۔ روزی کی تلاش میں گھر سے نکلتے ہوئے یہ غریب مچھیرے۔۔۔ کبھی ان کے چہروں پر درد تلاش کرنے کی کوشش بھی ضرور کیجیئے گا، انسانی حقوق کی بات کرتے ہوئے ہمیں شرم آنی چاہیئے۔ مجھے کسی پر بھی کیس نہیں کرنا ہے۔

''سر! میں غریب آدمی ہوں اور یونان کے اندر چار پیسے کمانے آیا ہوں۔ کیس لڑنے کے لئے مجھے کسی سے نہیں لڑنا۔'' میں نے ٹشو پیپر سے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

''سر! آپ کے وکیل کی جتنی فیس ہے وہ میں دینے کے لئے تیار ہوں۔'' جاوید اسلم آرائیں نے میرے کیس کے لئے ایک وکیل کیا تھا۔ وہ اس دن وکیل کے ساتھ ہی کیمپ میں آئے تھے۔ میں نے اس کی فیس بھی دینی تھی۔

''نہیں بیٹا! وہ وکیل کمیونٹی کی طرف سے کیس لڑتا ہے۔ تم صرف 12 یورو دے کر باہر سے ایک سال کا ممبر شپ کارڈ لے لو یہی بہت ہے۔ پاکستانی کمیونٹی اپنے تمام ممبران سے ایک یورو مہینے کا لیتی تھی۔ اس سے کمیونٹی کے تمام اخراجات چلائے جاتے تھے۔

''جی ٹھیک ہے سر! میں باہر سے لے لیتا ہوں۔ آپ کی بہت مہربانی جو آپ نے میرے لئے اتنی

تکلیف اٹھائی۔'' میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور کوستا سے 12 یورو لے کر باہر سے کمیونٹی کا ممبر شپ کارڈ لے لیا۔

''رضوان بیٹا! ان مچھیروں کے درمیان انڈین جاسوس یا دہشت گرد بھی تو ہوتے ہیں جو پاکستان کے اندر دہشت گردی پھیلاتے ہیں۔'' میں باہر نکلنے لگا تو انہوں نے مجھے پیچھے سے روکتے ہوئے کہا۔

''سر! میں جانتا ہوں کہ ان مچھیروں کے روپ میں دہشت گرد بھی ہوتے ہیں۔آپ پاکستانی حدود میں داخل ہونے والی ہر کشتی کو پکڑو، انڈیا بھی پکڑے۔دونوں طرف سے انکوائری کرو لیکن یہ انکوائری سالوں پر نہیں بلکہ دنوں میں ختم ہونی چاہیئے۔دہشت گردوں کو پکڑواور ان کو سزا بھی دو لیکن جو بے گناہ ہیں ان کو اگر چھوڑتے ہو تو ان کو ان کی کشتیاں بھی واپس کیا کرو۔دو تین لاکھ کی کشتی ہوتی ہے۔جس طرح ہم زمینداروں کے لئے جانور بیٹوں کی طرح ہوتے ہیں اس طرح یہ کشتی بھی ان کے بیٹے کی طرح ہوتی ہے اور پورے گھر کی کفیل ہوتی ہے۔'' میں نے دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔اس بار میرا رخ خلیل اور شفاقت کی دکان کی طرف تھا۔ہم دونوں کپڑے کی دکان پر آ گئے۔خلیل مجھے دیکھتے ہی مجھ سے لپٹ گیا۔شفاقت بھی ان کے پیچھے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا۔

''یار! کدھر چلے گئے تھے؟ ہم نے ہر جگہ سے تمہارا پتہ کروایا تھا۔تمہیں تلاش کرتے کرتے تمہارے گھر والے پاگل ہو گئے ہیں۔''خلیل مجھ سے جلدی جلدی سارے سوالات پوچھ رہا تھا۔

''خلیل بھائی! میں جیل میں تھا۔ڈیڑھ سال بعد آج اس پولیس والے کی وجہ سے رہا ہوا ہوں۔'' میں نے کوستا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اوہ یار! اب کدھر سے میکسیکو جانے کی کوشش کر رہے تھے؟ میں پہلے بھی میکسیکو جانے کی کوشش کرتے ہوئے پکڑا گیا تھا اور ایک مہینے کی سزا کاٹ کر باہر نکلا تھا۔وہ سمجھا شاید اس بار پھر میں میکسیکو جانے کی کوشش کرتا ہوا پکڑا گیا اور لمبی سزا ہو گئی۔

''خلیل بھائی! اس بار میکسیکو نہیں جا رہا تھا بلکہ بے قصور ہی پکڑا گیا تھا اور بلا وجہ ہی 18 مہینے جیل میں گزار آیا۔'' میں انہیں ساری تفصیل بتانے لگا۔

''چلو کوئی بات نہیں ہے۔۔۔ابھی بھی جوان ہو، کونسا بوڑھے ہو گئے ہو۔ میں مالک سے چھٹی لے لیتا ہوں اس کے بعد تمہیں گھر چھوڑ آؤں گا۔آج کل کام کے حالات بھی بہت سخت ہو گئے ہیں۔ تین چار لڑکے گھر میں فارغ بیٹھے ہیں، کوئی کام ہی نہیں ملتا۔ وقاص بھی گھر میں بیٹھا ہوا ہے۔ اس بار تو مالٹے کا سیزن بھی نہیں لگا ہے۔ ورنہ تین مہینے مالٹے کا سیزن بھی اچھا لگ جاتا ہے۔تم پریشان مت ہونا کوئی نہ کوئی آسرا بن جائے گا۔'' خلیل نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''جی بھائی جی! کوئی نہ کوئی آسرا مل ہی جائے گا۔ یہ کوستا بھی کام دے رہا ہے۔ تھیوا (THIWA) میں اس کے والد کھیتی باڑی کا کام کرتے ہیں۔ 25 یورو مزدوری دے گا۔ ہفتے میں چھ دن کام، کھانا اور رہائش سب مالک کی ہوگی۔'' میں نے خلیل سے کہا تو وہ خوش ہو گیا۔

''بہت اچھا ہے یار! میں یہاں سے 30 یورو لیتا ہوں لیکن بس ماہانہ کھانے اور مکان کے کرائے نکال کر مجھے 20 یورو بھی نہیں بچتے ہیں۔تم چلے جاؤ اس کے ساتھ! یہاں شہر میں اگر کوئی کام نکلا تو واپس آ جانا، یہاں سے تھیوا صرف ایک گھنٹے کا ہی تو سفر ہے۔'' خلیل نے مجھے قائل کرتے ہوئے کہا۔

''جی بھائی! جیسے آپ کہتے ہو۔ مجھے آپ کا مشورہ ہی چاہیئے تھا۔'' میں نے سعادت مندی سے کہا۔ خلیل مجھ سے ایک سال ہی بڑا تھا لیکن وہ بہت سلجھا ہوا اور سمجھدار لڑکا تھا۔ میں ایک بڑے بھائی کی طرح اس کی عزت کرتا تھا۔ وہ بھی مجھے اپنا چھوٹا بھائی سمجھتا تھا۔

''تھیوا جا کر وقاص کے کام کا بھی پتہ کرنا! وہ ابھی 18 سال سے چھوٹا ہے اس لیے کہیں بھی کام نہیں ملتا۔ شاید کھیتوں کا کام مل جائے۔'' وہ اندر چلا گیا۔ اس نے مالک سے چھٹی لی اور ہمارے ساتھ باہر آ گیا۔

کوستا کے پاس کار تھی وہ ہمیں لے کر نیکیا آ گیا۔ خلیل نے دوسرا مکان بھی نیکیا میں ہی لیا تھا۔ زیادہ تر لڑکے کام سے واپس آ گئے تھے۔ سارے گھر والے مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ کھانا بن گیا تھا، میں نے کوستا کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا اور اسے کام کے لئے ہاں کر دی۔ وہ تھیوا سے روزانہ ایتھنز آتا تھا۔ تھیوا سے جیل تک کار کا صرف 40 منٹ کا سفر تھا۔ اس لئے اس نے ایتھنز میں مکان لینے کی بجائے روز آنا زیادہ مناسب سمجھا۔

''شکریہ یار! مجھے واقعی بہت خوشی ہوئی ہے۔ تم بہت اچھے اور با اعتماد ہو۔'' وہ میرا فیصلہ سن کر خوش ہو گیا۔

''کب تک آپ کام نکال دو گے؟ مجھے اگر ٹھیوا کا ایڈریس دے دو گے تو میں آ جاؤں گا۔'' میں نے اس سے سوال کیا۔

''کام تو بے شک تم کل سے شروع کر دو لیکن جب تم کہو گے، میں تمہیں لے جاؤں گا۔ میری طرف سے بے شک تم آج ہی چلے چلو؟'' اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

''تو ٹھیک ہے! میں آج ہی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ یہاں کام ہی نہیں ہے تو پھر ادھر رہ کر کیا کرنا ہے۔'' میں اس کے ساتھ جانے پر تیار ہو گیا۔

''یار! اپنے گھر تو فون کر لیتے! مجھے یقین ہے تم نے ابھی تک اپنے گھر بھی بات نہیں کی ہے؟'' خلیل نے مجھے بازو سے پکڑتے ہوئے کہا۔

''جی بھائی! میں ابھی کال کرتا ہوں۔''

''موبائل مجھے دو! میرے پاس سم پڑی ہوئی ہے۔ کارڈ بھی وقاص لے آیا ہے۔'' انہوں نے وقاص کو کارڈ لانے بھیجا تھا۔ وقاص کارڈ لے کر آیا تو انہوں نے موبائل میں نئی سم ڈال کر کارڈ ریچارج کیا اور مجھے دے دیا۔

''تم ڈائریکٹ فون کر لو! ابھی کالنگ کارڈ ختم ہو گیا ہے۔ اسے کارڈ بھی وڈافون کا ہی لگتا ہے۔'' انہوں نے میری معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ میں نے ان سے اپنے گھر کا نمبر لے کر اپنے گھر فون کر کے اپنی خیریت کی اطلاع کر دی۔ ابو بات کو لمبا کرنے لگے لیکن میں نے کال کاٹ دی اور کوستا کے ساتھ گھر سے باہر آ گیا۔

''رضوان یار! اُدھر محنت کرنا اور کوشش کرنا وقاص اور شکیل کا کام نکل آئے۔ دونوں ہی گھر میں فارغ بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں نے خلیل سے کام نکالنے کا وعدہ کیا اور کوستا کے ساتھ کار میں بیٹھ گیا۔ تقریباً 1 گھنٹے سے بھی کم وقت میں ہم ٹھیوا پہنچ گئے۔

تھیوا(THIWA) ایتھنز سے 40 منٹ کے فاصلے پر ایک بہت بڑی میٹھے پانی کی جھیل کے قریب واقع ہے۔جھیل کے کنارے پر کوستا کی زمین تھی جبکہ تھیوا شہر جھیل سے تقریباً 5 کلومیٹر دور تھا۔اسی جھیل سے پورے ایتھنز کو پانی سپلائی ہوتا تھا۔تھیوا سمندر سے تھوڑا ہٹ کر تھا اور یہاں کی زمین بہت زرخیز تھی۔یہ شہر پیاز کی پیداوار کے لئے مشہور تھا۔ چونکہ یہاں سے ایتھنز شہر نزدیک تھا (جس کی سبزی منڈی سے آگے یورپ کو سبزیاں سپلائی ہوتی تھیں) اس لئے یہاں سبزی بھی بڑی مقدار میں اگائی جاتی تھی۔ یہاں سے روزانہ سبزی توڑی جاتی اور گاڑی کی مدد سے روزانہ ایتھنز پہنچائی جاتی تھی۔

کوستا کا مالک اندونی چیچوز(TSITSOS. Andony) پہلے سبزی کا ہی کام کرتا تھا لیکن بلغاریہ اور رومانیہ کے یورپ میں آجانے کی وجہ سے ان ملکوں کے مزدور واپس چلے گئے اور پاکستانی لڑکے بھی آگے جرمنی کی طرف جانے لگے تو اس کا کام ختم ہو گیا۔مزدور بہت مشکل سے اور نخرے والا ملتا تھا۔یہ سبزی توڑتا کم اور خراب زیادہ کرتا تھا۔اس لئے تھوڑا نقصان کروا کر اس نے سبزی بیچنا بند کر دیا اور اس کی جگہ گندم بیچنا شروع کر دی۔گندم کے لئے مزدور کی ضرورت نہیں ہوتی۔ان کا گھر تھیوا شہر کے اندر تھا جہاں کوستا اور اس کی گرل فرینڈ اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتے تھے۔

کوستا اندونی کی اکلوتی اولاد تھا اور گھر میں صرف چار افراد رہتے تھے۔کوستا کی گرل فرینڈ کا نام سبریند تھا۔ 20 سال کی بہت خوبصورت سی ترکی لڑکی تھی۔ اس کے بال سنہری اور آنکھیں سبز تھیں۔ سبریند (SABRENA) نے نئی نئی گریجوایشن کی تھی اور کوستا کی طرح پولیس لائن میں جانے کی تیاری کر رہی تھی۔دونوں ایک ہی شعبے میں رہنا چاہتے تھے۔کھانا چونکہ ہم ایتھنز سے ہی کھا کر آئے تھے اس لئے کوستا کے ماں باپ اور سبرینہ نے تو کھانا سٹارٹ کر دیا جبکہ میں اور کوستا ٹی وی دیکھنے لگے۔

رات کا اندھیرا پھیل گیا تھا۔کھانا کھانے کے بعد ہم سارے اکٹھے ہی ڈیرے پر آ گئے۔ان کا ڈیرہ تھیوا سے باہر ی طرف لیکی(LLIKI) جھیل کے کنارے موریکی(Mouriki) گاؤں کے نزدیک تھا۔ہمارا ڈیرہ گاؤں سے باہر دو بڑے بڑے پہاڑوں کے نیچے تھا۔جن کے درمیان سے ایک چھوٹا سا درہ (راستہ) تھا جو جھیل تک جاتا تھا۔جبکہ اصل راستہ گاؤں کی طرف سے تھا جہاں سے گاڑیاں وغیرہ جھیل تک جاتی تھیں۔واٹر سپلائی کا پلانٹ بھی گاؤں میں ہی نکالا تھا اور شاید اسی پلانٹ کی وجہ سے گاؤں بھی بن گیا تھا۔

زیادہ بڑا گاؤں نہیں تھا بلکہ صرف 50 کے قریب ہی گھر تھے۔ وہ سارے کے سارے ہی سبزی کے کام سے منسلک تھے۔

جھیل کی دوسری طرف پہاڑیوں کا ایک لامحدود سلسلہ تھا اور ادھر سے ہی بارشوں کا پانی جھیل میں اکٹھا ہوتا تھا۔ موریکی ایک وادی نما علاقہ تھا جس کے چاروں طرف پہاڑ تھے۔ تھیوا (THIVA) کو دونوں اطراف مشرقی اور مغربی جانب سے سمندر لگتے تھے اور دونوں طرف ہی بیس بیس کلومیٹر دور سمندر ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا سمندر ہے جس کی دوسری طرف ایوبیا (EUBOEA) کا جزیرہ ہے۔ یہ موریکی کی طرف تقریباً 10 کلومیٹر جبکہ یلقیدہ (YALKIDA) کی طرف سے محض دس بارہ میٹر کا سمندر ہے۔ یلقیدہ سے سمندر ایک نہر کی طرح لگتا ہے اور اسی طرف سے دو پل بنا کر اسے ایتھنز سے سڑک کے ذریعے ملایا گیا ہے۔

تھیوا کی دوسری طرف کا سمندر پاترہ (PATRA) کا سمندر ہے جہاں سے آگے اٹلی اور سپین آجاتا ہے۔ تھیوا کو نیچے جنوب کی طرف بھی سمندر ہی لگتا ہے۔ یہ ایتھنز کا سمندر ہے جو کہ تقریباً 100 کلومیٹر دور سپیریا کی بندرگاہ ہے۔ دنیا کی دوسری بڑی بندرگاہ شمالی جانب کا علاقہ زمینی ہے جہاں سے یونان کا رابطہ دوسرے زمینی ملکوں سے ہوتا ہے۔

کوستا اور اس کے والد اندونی کا بہت بڑا تھا۔ یہ تقریباً ایک ایکڑ پر پھیلا ہوا تھا جس میں دو بڑے بڑے شیڈ بنائے گئے تھے۔ ان شیڈوں کے دوسری طرف 3 کمرے اور ایک کچن تھا۔ جو یہاں ڈیرے پر کام کرنے والے لڑکوں کے لیے بنایا گیا تھا۔ لیکن کام ختم ہونے کی وجہ سے اب کوئی بھی لڑکا ادھر نہیں رہتا تھا۔ گھروں کے اندر بیڈ، کمبل، ٹی وی اور فریج سب کچھ موجود تھا۔ یہاں پہلے پاکستانی لڑکے ہی کام کرتے رہے تھے اس لیے کچن میں آٹا تک موجود تھا۔ ڈیرے کی تین اطراف کو لوہے کی جالی والی دیوار لگا کر اسے کھیتوں سے الگ کر دیا گیا تھا جبکہ چوتھی سائیڈ گاڑیوں کے گزرنے کے لیے خالی چھوڑ دی گئی تھی۔ ڈیرے کے ایک کونے پر جانوروں کے لیے تین چھوٹے چھوٹے باڑے بنائے گئے تھے۔ جس میں ایک جوڑا بکریوں کا اور ان کے دو چھوٹے چھوٹے بچے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ 8 مرغیاں بھی تھیں جو ڈیرے پر آزادانہ گھوم پھر رہی تھیں۔

''لو یار! یہ تمہارا گھر ہے۔ آج رات تم ہمارے ساتھ تھیوے میں ہی سو جانا! بستر اور کمبل سب کچھ موجود ہے۔ ابو کل تمہیں مارکیٹ بھی لے جائیں گے اور تم کھانے پینے کا جو بھی سامان چاہتے ہو وہ تمہیں لے دیں گے۔ ایک دو دن تک ابو کھانا دے جایا کریں گے اس کے بعد تم نے اپنا کھانا خود ہی بنانا ہے۔'' کوستا نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے! مجھے سمجھ آ گئی ہے۔ میں آج رات بھی ادھر ہی سو جاتا ہوں۔'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو وہ پہلے تو منع کرتے رہے لیکن پھر میرے اصرار پر مان گئے اور مجھے ڈیرے پر چھوڑ کر واپس تھیوا چلے گئے۔ کھانا میں نے کھا لیا تھا اور ٹی وی دیکھنے کا مجھے کبھی شوق ہی نہیں تھا۔ میں نے ایک بیڈ کو جھاڑا اور کمبل لیکر سو گیا۔

دوسرے دن صبح سات بجے کے قریب پہلے کوستا آیا۔ اس نے میرا حال چال پوچھا اور ایتھنز ڈیوٹی پر چلا گیا۔ میں اٹھ کر ڈیرہ دیکھنے لگا۔ بکریاں شروع سے ہی مجھے اچھی لگتی تھیں اس لیے میں ان کے باڑے میں گھس گیا اور ان کے باڑے کا بغور جائزہ لینے لگا۔ اس کے بعد ایک ایک کر کے سارے باڑوں کی صفائی کرنے لگا۔ میرا مالک 10 بجے کے قریب آیا۔ اس وقت تک میں نے تینوں باڑوں کی صفائی کر دی تھی، بکریوں کے لیے چارا اور تازہ پانی بھر کر رکھ دیا تھا اور اب کمروں کی صفائی کر رہا تھا۔ مالک آتے ہی خوش ہو گیا۔

''واہ! واقعی تم بہت کام کرنے والے لگتے ہو۔ رضوان نام ہے نا تمہارا؟'' میرے مالک نے میرا نام پوچھا تو میں مسکرانے لگا۔

''راضی نام ہے میرا فندیکو!'' یونانی زبان میں مالک کو فندیکو بولتے ہیں۔

یورپی معاشرے میں چھوٹے بڑے سب کو نام سے بلاتے ہیں۔ یہ ہماری طرح (پا جی، چاچا جی، خالہ جی) وغیرہ نہیں کہتے۔ صرف سگے رشتوں مثلاً ماں باپ یا انکل کو ہی رشتوں سے بلاتے ہیں اس کے علاوہ 10 سال کا بچہ بھی 80 سال کے بوڑھے کو نام سے بلاتا ہے۔ چونکہ ہم پاکستانیوں کو عادت پڑی ہوئی ہے کہ ہم اپنے سے بڑے کو نام لیکر نہیں بلاتے۔ اس لیے ہم مالک کا نام لینے کی بجائے اسے فندیکو (FANDIKO) کہتے ہیں۔ صرف پاکستانی یا انڈین ملازم ہی اپنے مالک کو فندیکو کہتے ہیں باقی دوسرے

ملکوں سے آئے ہوئے ملازم نام ہی لیتے ہیں۔

’’ہاں یہ ٹھیک ہے! رضوان نام بہت مشکل ہے، مجھے یاد رکھنے میں بہت پرابلم ہوتی ہے۔ راضی اچھا اور آسان نام ہے۔‘‘ یونانی ہمارے اصل نام نہیں پکار سکتے تھے اس لئے وہ ہمارے دوسرے نام مثلاً علی، احمد یا محمد ہی کہتے تھے۔ اگر علی نام کے دولڑکے ہوں تو وہ چھوٹا علی اور بڑا علی کہہ لیتے تھے۔

’’راضی! تم میرے ساتھ چلو میں تمہیں پانی کا سسٹم دکھا دیتا ہوں۔ پندرہ بیس دن تک پانی کا سارا سسٹم سیکھ لو!‘‘ انہوں نے مجھے ساتھ چلنے کے لیے کہا تو میں ان کے ساتھ موٹر پر آ گیا۔

یہ پانچ انچ قطر یا پائپ کی موٹر تھی۔ یونان پہاڑی علاقہ ہے اس لیے یہاں نہروں یا کھالوں کی مدد سے پانی نہیں دیا جاتا۔ زمین ہموار نہیں ہوتی اس لیے پانی ایک سرے سے دوسرے سرے کی طرف نہیں جاتا۔ اس لئے پانی کو پائپوں اور پھر چھوٹے چھوٹے فواروں کی مدد سے پہنچایا جاتا ہے۔ پانچ انچ کے مین پائپ سے ایک انچ کے چھوٹے چھوٹے پائپوں سے جوڑا جاتا ہے اور پھر اس چھوٹے پائپ کو ہر 10 میٹر کے فاصلے پر ایک فوارا لگایا جاتا ہے۔ یونان میں اسے بک (BIK) کہتے ہیں۔ ایک ایکڑ کے کھیت میں تقریباً 5 پائپ اور 100 سے اوپر فوارے (BIK) ہوتے ہیں۔ یہ آن آف کی سہولت رکھتے ہیں۔ آپ بک (BIK) باہر نکالو اور وہاں ڈاٹ (DOT) لگا کر سوراخ بند کر دو۔ مین پائپ سے چھوٹے پائپ کی طرف ٹونٹی لگتی ہے آپ ٹونٹی آف کر دو تو پورا چھوٹا پائپ بند ہو جائے گا۔

چھوٹے پائپ پلاسٹک کے جبکہ بڑے پانچ انچ والے پائپ لوہے کے دس دس میٹر لمبے ہوتے ہیں۔ جنہیں ایک دوسرے سے جوڑ کا ایک بڑا اور لمبا پائپ بنایا جاتا ہے اور ان ٹکڑوں کو ایک کھیت سے دوسرے کھیت کی طرف آسانی سے منتقل بھی کیا جا سکتا ہے۔ سب سے پہلے کھیت کی کھدائی ہوتی ہے اور سبزی بیجی جاتی ہے۔ اس کے بعد پائپ اور فوارے لگائے جاتے ہیں۔ سبزی ختم ہو جانے کے بعد پائپ واپس نکال لئے جاتے ہیں۔ خدا نے ان یورپین ممالک کو ہمارے ملکوں کی طرح سیدھی اور ہموار زمین نہیں دی ہے لیکن انہوں نے اس چیز کا رونا رونے کی بجائے ان پہاڑوں کو کاشت کے قابل بنا لیا ہے۔

میں ان کے ساتھ موٹر پر آیا اور پھر پانی کا سسٹم دیکھنے لگا۔ یہ میرے لیے بالکل نیا طریقہ تھا۔ میں اس طریقے کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میری دلچسپی دیکھ کر وہ بھی شوق سے بتانے لگے۔ میں ایک پائپ سے

دوسرے پائپ کو جوڑنے کا طریقہ بڑے پائپ سے چھوٹے پائپ کا جوڑ اور فوارے (BIK) کا کام کرنے کا طریقہ اور اس فوارے کو کھول کر اندر کے سسٹم کو بھی دیکھ رہا تھا کہ آخر یہ کس طرح کام کرتا ہے۔

یہ فوارا پانچ میٹر تک برابر پانی بھی پھینکتا تھا اور ساتھ ساتھ گھومتا بھی تھا۔ میں چار گھنٹے تک مسلسل پائپ لگاتا اور جوڑتا رہا۔ مجھے اس پانی کے سسٹم کو سیکھنا تھا۔ سبزی کا کام میں ویسے ہی جانتا تھا اور اگر پانی لگانے کا سسٹم بھی سیکھ لیتا تو آگے پورے یورپ میں کہیں بھی کام کر سکتا تھا۔ اس سسٹم کو سیکھنے کے بعد میں پانی کے زمین دوز کنکشن کی طرف آ گیا۔ میرے مالک کی یہاں تقریباً 150 ایکٹر سے زائد زمین تھی اس کے لیے زمین دوز 3 کنکشن بنائے گئے تھے۔ جن میں سے چھوٹا کنکشن ڈیرے کے لیے تھا جہاں ایک بہت بڑا حوض تھا جس میں سبزی دھوئی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ دو بڑی ٹینکیاں تھیں جس میں اپنے اور جانوروں کے پینے کے لیے پانی سٹور کیا جاتا تھا۔ تین مختلف سمتوں میں زمین کھود کر ان کے اندر مین پائپ بچھائے گئے تھے۔ یہ زیادہ پیچیدہ سسٹم نہیں تھا۔ میں ایک دن میں ہی سب سیکھ گیا تھا اور مالک کو لگا لگا کر دکھانے لگا۔

شام تقریباً 4 بجے کے قریب ہم واپس ڈیرے پر آ گئے۔ وہ میرے لیے کھانا لے کر آیا تھا۔ میں نے کھانا کھایا، کپڑے بدلے اور اس کے ساتھ مارکیٹ آ گیا۔ یہاں سے میں نے کچن کا سامان، گوشت اور سبزیاں خریدیں اور واپس گھر آ گیا۔ اس کے بعد وہ تو واپس گھر چلا گیا اور میں ایک بار پھر موٹر پر آ کر اسے چلا چلا کر دیکھنے لگا۔ رات کو میں نے کھانا بنایا اور کھا کر آرام سے سو گیا۔ دوسرے دن پھر مالک کے ساتھ کھیتوں پر آ گیا۔ اس نے ساری ہی گندم بیجی ہوئی تھی۔

''فندیکو! آپ گندم کی بجائے سبزی کیوں نہیں بیجتے؟ سبزی میں زیادہ منافع ہوتا ہے۔'' میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

''یار! سبزی کے لیے مزدور چاہئیں اور کام کرنے والا کوئی بھی مزدور نہیں ہوتا بلکہ سب کام چور ہوتے ہیں۔ میں نے نقصان اُٹھا کر اب سبزی کا کام چھوڑ دیا ہے۔

''آپ ایک بار پھر کر کے دیکھ لیتے؟ میرے دو کزن ایتھنز میں فارغ بیٹھے ہوئے ہیں، ان کا بھی کام نکل آتا۔۔۔ یا پھر آپ کسی ڈیرے سے کام ہی پوچھ دو! وہ بھی کہیں لگ جائیں گے۔'' میں نے مطلب کی بات پر آتے ہوئے کہا تو وہ مسکرانے لگا۔

''تم ایسا کرو ان کو یہاں بلالو! یہاں نزدیک نزدیک جتنے بھی ڈیرے ہیں ان سب کو سبزی توڑنے کیلئے لڑکوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ یہاں پر آکر رہیں، کھائیں پیئیں اور کام کرتے رہیں۔ یہاں تمہارے ساتھ آکر رہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ بجلی گورنمنٹ فری میں دیتی ہے، مکان کا کوئی کرایہ نہیں ہے اور کھانا البتہ تم اپنا خرید کر بنالیا کرو گے۔ ویسے بھی سبزی اور گندم تو فری کی مل جائے گی بس گوشت اور تیل ہی خریدنا پڑے گا۔ تمہاری ہمارے ساتھ 25 یورو کی بات ہوئی ہے لیکن تم 25 کی بجائے 27 یورو لے لیا کرو اور کھانا پینا اپنا بنالیا کرو۔'' اس نے میری ساری مشکل ہی حل کردی۔

پیچھے ایتھنز میں شکیل اور وقاص کے ساتھ دو اور لڑکے بھی فارغ بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے اسی وقت فون کیا اور وہ کوستے کے ساتھ شام کو ڈیرے پر آگئے۔ اب یہاں 5 لڑکے ہو گئے تھے۔ کوستے نے ہی ساتھ والے ڈیرے پر بات کی اور ہمیں دوسرے دن کام پر جانے کے لیے تیار رہنے کا کہا۔

''راضی یار! تم بھی ان کے ساتھ ہی چلے جانا ابھی تو یہاں تقریباً کام ہی نہیں ہوتا۔۔۔ ابو ایک دو دن میں ایک کھیت سبزی کا بیج لیں گے تو پھر یہاں بھی آہستہ آہستہ کام شروع ہو جائے گا۔'' کوستا نے مجھے بھی ان کے ساتھ ہی کام پر جانے کا کہا۔

دوسرے دن صبح صبح دوسرے ڈیرے والا ڈالا لیکر آگیا اور ہمیں لیکر اپنے ڈیرے پر آگیا۔ اس نے تیس تیس کریٹ ہمارے آگے رکھے اور ہمیں پالک کاٹنے کا کہا۔

''یہ 30 کریٹ ہیں۔ آپ انہیں ایک گھنٹے میں ختم کرو یا 10 گھنٹے میں، وہ آپ کی مرضی ہے۔ مجھے شام کو آپ پانچ لڑکوں سے 150 کریٹ چاہئیں۔'' اس نے ہمیں پالک توڑنے، صاف کرنے اور کریٹ میں رکھنے کا طریقہ بتایا اور ہم اپنا اپنا کریٹ لیکر بیٹھ گئے۔

مجھے پالک کاٹنے کا پتہ تھا اس لیے میں باری باری سب کے پاس جا کر انہیں پالک کاٹنے کا طریقہ بتاتا رہا اور ان کا ہاتھ سیدھا کرتا رہا۔ اگر ایک بار ان کا ہاتھ صحیح چل پڑتا تو پھر ہم آسانی سے کام کر سکتے تھے۔ مالک نے مجھے بھی پالک کاٹنے کا کہا لیکن میں نے اسے تھوڑا انتظار کرنے کا کہا۔ تقریباً ایک گھنٹے تک میں مسلسل ان کو بتاتا رہا اور جب ان کا ہاتھ بالکل ٹھیک ہو گیا تو پھر اس کے بعد میں بھی کریٹ لے کر بیٹھ گیا۔ میرا مالک بھی ادھر ہی آگیا تھا۔ شکیل بھائی اور وقاص کی تو پاکستان میں اپنی زمینیں تھیں اور وہ کھیتی باڑی کا ہی

کام کرتے رہے تھے۔ اس لیے وہ تو آسانی سے اور تیزی سے پالک کاٹنے لگے۔ باقی دولڑکے ابھی تھوڑے کمزور تھے لیکن تقریباً ٹھیک کام کر رہے تھے۔

''راضی! اب خود بھی ایک کریٹ کاٹ کر دکھا دو یا پھر ان کو ہی سکھاتے رہو گے؟'' میرے مالک نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔

''فندیکو! آپ بھی سیکھ لو پالک کیسے توڑتے ہیں؟'' میں کریٹ لیکر بیٹھ گیا اور آہستہ آہستہ پالک کاٹنے لگا۔

''اوہ یار! تم تو استاد بنے ہوئے تھے لیکن تمہاری رفتار تو ان سب سے ہلکی ہے۔''

''فندیکو! مقابلہ کرنا ہے تو آجاؤ! اوپن چیلنج ہے۔ کوئی بھی آجائے ایک ایک بڑی کوکا کولا لگا لیتے ہیں جو بھی ہار گیا وہ ایک کوکا کولا کر پلائے گا۔ ہے کوئی مقابلہ کرنے والا؟'' میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس بار دونوں مالک (میرا اپنا مالک اور دوسرا کھیت کا مالک) ایک ایک کریٹ پکڑ کر آ گئے۔

''چلو لگا لو اور یہ مذاق نہیں ہے! اگر تم ہار گئے تو تمہارے پلے سے کوکا کولا آئے گی اگر ہم ہار گئے تو دو دو کوکا کولا آئیں گی۔'' میرے مالک نے چھری کے دندانوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''مجھے منظور ہے! آپ کوکا کولا لانے کا بندوبست کریں۔'' ہم تینوں اکٹھے بیٹھے اور مقابلہ شروع ہوا تو میں نے پہلے ہی ہاتھ سے پندرہ سولہ کے قریب پودوں کو چھری سے کاٹا، صاف کیا اور کریٹ کے اندر رکھ دیا۔ صرف 3 منٹ کے اندر ہی میں پورا کریٹ بھر کر کھڑا ہو گیا۔ ان دونوں نے ابھی تک آدھا کریٹ بھی نہیں بھرا تھا۔ صرف میرے کھڑے ہونے کی دیر تھی کہ وقاص اور شکیل دونوں تالیاں اور بڑھکیں مارنے لگے۔

''فندیکو جی! آجاؤ اور دیکھ لو، کریٹ بھر گیا ہے۔'' وہ دونوں کھڑے ہو گئے اور حیرانگی سے کریٹ کی طرف دیکھنے لگے۔

''یار! یہ ناممکن ہے۔ اتنی جلدی کریٹ نہیں بھر سکتا۔'' وہ کریٹ کو اٹھا اُٹھا کر دیکھ رہے تھے لیکن وہ پورا بھرا ہوا تھا۔

''صفائی بھی چیک کرو! ایسے ہی تو نہیں بھر دیا گیا؟'' دوسرے مالک نے میرے والے مالک سے کہا تو وہ پالک کو باہر نکال کر دیکھنے لگا۔ ساری پالک صاف شدہ تھی۔

''یار! کسی نے کریٹ تو نہیں پکڑا دیا اس کو؟''

''نہیں یار! ہم ساتھ ہی تو بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ کوئی اور ہی معاملہ ہے۔ راضی! کوکا کولا تمہاری ہوگئی ہے، ایک اور کریٹ بھر کر دکھا دو! اس بار ہم دونوں تمہاری رفتار دیکھنا چاہتے ہیں۔'' میں پھر کریٹ لیکر بیٹھ گیا اور پھر اسی رفتار سے ایک جھٹکے میں ہی دوسرا کریٹ بھی بھر دیا۔

''اوہ یار! یہ کیا ہے؟ اتنی رفتار میں نے اپنی زندگی میں کسی کی نہیں دیکھی۔'' میرا مالک اسی وقت سر پکڑ کر کھیت میں ہی بیٹھ گیا۔

''فندیکو! میں 5 سال کی عمر سے یہ سبزی توڑ رہا ہوں۔ سبزی اور کھیتی باڑی کا یہ کام میرے خون میں ہے، مجھے اس کام سے محبت ہے اور یہی محبت مجھے کسی سے ہارنے نہیں دیتی۔'' میں ایک بار پھر نیچے بیٹھ کر پالک کاٹنے لگا۔ میں نے لگاتار اسی رفتار سے مزید تین اور کریٹ بھر دیئے اور چوتھے کریٹ کو پکڑنے کے لیے اٹھا تو میرے مالک نے میرا بازو پکڑ کر کھڑا کر دیا۔

''بس کرو یار! تم واقعی بہت زیادہ تیز ہو۔ اس سے زیادہ رفتار کسی کی ہو ہی نہیں سکتی ہے۔'' اس بار دوسرے کھیت والا مالک بولا تھا۔

''نام کیا ہے اس لڑکے کا؟'' دوسرے مالک نے میرے مالک سے پوچھا۔

''راضی، اصل نام تو بڑا مشکل سا ہے۔ میں تو اسے راضی ہی بلاتا ہوں۔'' میرے مالک نے اسے میرا نام بتاتے ہوئے کہا۔

''راضی صاحب! ہماری طرف سے کوکا کولا تو آپ کی پکی ہوگئی ہے، دو دو کی بجائے چار چار لیکر آئیں گے۔ کچھ ادھر پی لینا اور باقی گھر لے جانا، اس کے علاوہ میں دوپہر کو کھانے کے لیے بھی کچھ لیکر آجاؤں گا۔ اگر تم اندرونی (ANDONY) کے پاس کام نہ کر رہے ہوتے تو میں پکا تمہیں اپنے پاس کام پر رکھ لیتا۔'' اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''کافی پیتے ہو؟'' اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

پوری دنیا میں سب سے زیادہ کافی یونان میں ہی پی جاتی ہے۔آپ صبح پانچ بجے سے نو بجے کے درمیان باہر نکلیں تو آپ کو یونان میں ایک مزدور سے لیکر بزنس مین اور وزیروں تک کے ہاتھ میں کافی کا گلاس نظر آئے گا۔ یونانی لوگ صبح 5 بجے سے لیکر رات 12 بجے تک مسلسل کافی پیتے ہیں۔کافی کڑوی ہوتی ہے اس لیے پاکستانیوں کو کافی کے ذائقے سے ہم آہنگ ہونے میں ایک دو سال لگ جاتے ہیں اور پھر آہستہ آہستہ چائے سے کافی کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں۔ہم لوگ کافی میں بھی بہت زیادہ دودھ ڈال کر اسے بھی چائے بنانے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ کافی کا اصل ذائقہ ہی بغیر چینی اور بغیر دودھ کے ہے۔دودھ اور چینی کافی کی کڑواہٹ اور ذائقہ دونوں ختم کر دیتے ہیں۔

مجھے سگریٹ اور شراب سے شروع سے ہی نفرت تھی۔محبت میں ناکام ہونے والے عاشق جب ان دونوں چیزوں کا سہارہ لیتے ہیں تو اپنے خدا کو ناراض کرتے ہیں۔محبوب کی کسی دوسری جگہ شادی ہو جانے سے محبت ختم نہیں ہو جاتی بلکہ مزید بڑھ جاتی ہے۔اور جو محبت محبوب کے کسی اور کے ہو جانے سے ختم ہو جائے وہ محبت نہیں ہوتی۔کامل عشق تو محبوب کے دیدار کا بھی محتاج نہیں ہوتا چلن تو بہت دور کی بات ہے۔عشق وہی ہوتا ہے جو زندگی کی آخری سانس تک نچاتا ہے۔عشق میں جان دینی اور جان لینی تو بہت آسان ہے۔

اصل عشق کا امتحان تو آخری سانس تک جدوجہد ہے جو محبوب کو حاصل کرنے کے لئے کی جاتی ہے۔ پھر چاہے یہ جدوجہد 100 سال پر ہی کیوں نہ محیط ہو۔محبوب اس دنیا میں نہیں تو اگلی دنیا میں ضرور ملتا ہے لیکن عشق میں خودکشی کرنے والے بزدل اس دنیا میں بھی نامراد رہتے ہیں اور اگلی دنیا میں بھی ان کے ہاتھ کچھ نہیں آتا۔ جب ہم خدا اور اس کے رسول ﷺ کے لیے خودکشی نہیں کر سکتے تو خدا کے بنائے ہوئے ایک انسان کے لئے کیسے خودکشی کر سکتے ہیں؟ یقین کیجئے! خودکشی کرنے سے اگر محبوب مل جاتا تو آج خودکشی حرام نہ ہوتی اور آدھی دنیا مر چکی ہوتی۔محبت کا اصل مزا ہی اس کو حاصل کرنے کی جدوجہد ہے۔

مجھے کافی کی کڑواہٹ اچھی لگتی ہے۔اس کے پاس گاڑی میں پورٹ ایبل کافی تھی۔اس نے گلاس میں میرے لئے کافی بنائی اور مجھے پکڑا دی۔

''راضی! اس ڈیرے کے دروازے ہمیشہ تمہارے لئے کھلے ہیں، تم کبھی بھی ادھر آ سکتے ہو۔''

میں نے اس کے ہاتھ سے کافی کا گلاس پکڑ لیا۔ ایک گھونٹ کافی کا بھر کر اپنے حلق کو کڑوا کیا اور دوبارہ کام پر بیٹھ گیا۔ مزید آدھے گھنٹے تک وہ ہم کو کام کرتے ہوئے دیکھتے رہے۔ اس کے بعد گاؤں (موریکی) کی طرف چلے گئے۔

موریکی ہمارے ڈیرے سے صرف دو کلومیٹر دور تھا۔ گاڑی سے یہ سفر ٹوٹل 5 منٹ کا تھا لیکن پیدل آدھا گھنٹہ لگ جاتا تھا۔ یہاں کھیتی باڑی کرنے والے سبھی مالکوں کے پاس 4x4 کے ڈالے ہوتے ہیں اور وہ ان ڈالوں کو کھیتوں کے اندر بھی چلاتے رہتے ہیں۔ ہمارے مالک کے ڈیرے پر 4 ٹریکٹر کھڑے ہیں۔ چونکہ ہم میں سے کسی کو ڈرائیونگ نہیں آتی تھی اس لئے گاؤں سے سامان وغیرہ خریدنے کے لئے پیدل ہی جانا پڑتا تھا۔

گاڑیاں پورے یورپ میں انتہائی سستی ہیں۔ صرف پرانی سیکنڈ ہینڈ گاڑیاں ہی سستی ہیں۔ چونکہ یورپ کے اندر مزدوری بہت زیادہ ہوتی ہے اس لئے اگر کوئی چیز خراب ہو جاتی ہے تو اسے ٹھیک کروانے کی بجائے نئی ہی لے آتے ہیں۔ امیر لوگ چار پانچ سال گاڑیاں رکھتے ہیں اور پھر اسے بیچ کر نئی لے لیتے ہیں۔ یہاں 500 یورو سے لے کر 1000 یورو تک اچھی حالت کی گاڑی مل جاتی ہے۔ یعنی صرف ایک مہینے کی تنخواہ سے آپ گاڑی خرید سکتے ہو۔

ہمارے دونوں یونانی مالک دوپہر کو ایک بجے کے قریب آئے۔ ہم اپنا گھر سے لایا ہوا کھانا 12 بجے ہی کھا چکے تھے۔ ایک بجے کے قریب وہ بھی کھانا اور کولا کی بوتلیں لے کر آ گئے۔ ہم ٹوٹل 120 کے قریب کریٹ کاٹ چکے تھے۔ ابھی صرف 20 کریٹ اور رہتے تھے۔ وقاص اور شکیل کی رفتار بھی ٹھیک ہو گئی تھی۔ مزید آدھے گھنٹے تک ہم نے بقیہ بیس بھی کاٹ دیئے۔

''واہ یار! تم نے تو اپنا کام پہلے ہی مکمل کر لیا ہے۔ ابھی یہ جو تھوڑے سے کریٹ رہتے ہیں یہ بھی ختم کر لو اس کے بعد بے شک گھر جا کر ہی کھانا کھا لینا! آرام سے نہا دھو کر کھانا کھانا۔۔'' انہوں نے ہمیں اٹھتے ہوئے دیکھا تو منع کر دیا۔

بات تو ٹھیک تھی، کھانا تو ایک ہم کھا چکے تھے اور اب دوبارہ کھانے کو دل نہیں کر رہا تھا۔ اس لئے ہم نے پہلے کام ختم کرنا ہی مناسب سمجھا اور جلدی جلدی اپنا کام ختم کرنے لگے۔ کھیت والے مالک نے

سارے کھانے کے پیکٹ ہمارے فندیکو کو دیئے اور ڈیرے سے ٹریکٹر ٹرالی لے آیا۔ اس کے ٹرالی لانے تک ہم نے سارے کریٹ مکمل کر لیے تھے۔ جیسے ہی ٹرالی آئی ہم نے اس کو ٹرالی میں لوڈ کیا اور اس نے ہمیں ایک دن کے پیسے دیئے اور ٹرالی لے کر اپنے ڈیرے کی طرف چل پڑا۔

اس نے اپنے ڈیرے پر مستقل دولڑکے تنخواہ پر رکھے ہوئے تھے۔ پالک دھونے کا کام وہی کرتے تھے۔ وہ لڑکے پالک دھو کر دوبارہ خوبصورتی سے کریٹ میں لگاتے اور گاڑی میں لگا کر ائیر کنڈیشنر آن کر دیتے۔ دوسرے دن صبح صبح ان کا مالک گاڑی ایتھنز کی سبزی منڈی میں لے جاتا تھا۔ ہمارا کام صرف پالک کاٹنا ہی تھا۔ ہمارا مالک اپنی گاڑی پر آیا تھا۔ اس نے ہم سب کو اپنی گاڑی میں بٹھایا اور واپس ڈیرے پر لے آیا۔

''راضی! تم میرے ساتھ موٹر پر چلو، ایک کھیت کو پانی لگانے کے بعد تم واپس آ کر نہا لینا۔'' مالک نے سب لڑکوں کو نیچے اتارا اور مجھے لے کر موٹر پر آ گیا۔ میں نے جلدی جلدی مطلوبہ کھیت کے والو (Walve) کھولے اور موٹر چلا دی۔

یہ سفید پیاز کا کھیت تھا۔ سفید پیاز سلاد کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ تقریباً پانچ ایکٹر کا پلاٹ تھا، میں کھیت کے اندر جا کر جو فوارے بند ہو گئے تھے انہیں ٹھیک کرنے لگا۔ بعض اوقات پانی کے اندر کوئی کنکر وغیرہ آ جاتی ہے، کسی اور وجہ سے فوارا بند ہو جاتا ہے یا پھر فوارہ غلط سمت میں گھومنے لگتا ہے تو اسے ٹھیک کیا جاتا ہے۔ میں جو جو فوارے بند ہو گئے تھے انہیں کھول کر ٹھیک کرتا اور دوبارا لگا دیتا۔ میرے پاس ایک باریک تار ہوتی تھی میں فوارے کو اوپر سے کھولتا اور باریک تار سے اس کی صفائی کرتا اور پھونک مار کر دوبارا لگا دیتا۔ فوارا دوبارہ چل پڑتا تھا۔ اگر کوئی فوارا بالکل ہی خراب ہو جاتا تو اس کی جگہ دوسرا لگا دیتا۔ آدھے گھنٹے تک میں نے سارے کھیت کا ایک چکر لگا کر سب فواروں کو چیک کر لیا تھا۔

''یار! برساتی تو پہن لیا کرو، تمہارے سارے کپڑے بھیگ گئے ہیں۔۔۔کسی دن بیمار پڑھ جاؤ گے۔'' فواروں کے پانی کی وجہ سے میرے سارے کپڑے گیلے ہو گئے تھے۔

''فندیکو! اتنی جلدی بیمار ہونے والی چیز نہیں ہوں، آپ بے فکر رہو۔'' مجھے فواروں کا پانی بارش کی طرح لگتا تھا اور اس میں بھیگنا اچھا لگتا تھا۔

''چلو اب پیچھے بیٹھ جاؤ! میں تمہیں ڈیرے پر چھوڑ آتا ہوں۔'' اس نے ڈالے کی پچھلی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو میں پیچھے جا کر بیٹھ گیا۔

''تم جانوروں کا چارہ وغیرہ دیکھ لینا اور ان کے پاس پانی بھی تازہ بھر دینا۔۔۔میں شام کو آؤں گا۔ ایک کھیت پالک کا میں بھی بیچ لیتا ہوں، اب آہستہ آہستہ کام شروع کرتے ہیں۔'' اس نے مجھے ڈیرے پر اتارتے ہوئے کہا۔

''جی فندیکو! آپ فکر مت کرو۔آپ کام شروع کرو گے تو ہم بھی چار پیسے کما سکیں گے۔'' میں نے مالک سے کہا اور شرٹ اتار کر تار پر لٹکائی اور بکریوں کے باڑے کی طرف چل پڑا۔ مالک نے ڈالے کو ریورس کیا اور اپنے گھر تھیوا (THIWA) چلا گیا۔

میں نے بکریوں کو چارا ڈالا اور ان کے لئے تازہ پانی بھر دیا۔دس منٹ میں ہی میں سب کاموں سے فارغ ہو گیا تو کمرے میں آ کر کپڑے تبدیل کرنے لگا۔ یہاں ٹی وی اور سی ڈی پہلے ہی موجود تھی۔ وقاص ایتھنز سے فلمیں ساتھ لے کر آیا تھا۔ان لوگوں نے نہا کر کپڑے بدل لیے تھے اور سی ڈی پر نرگس کا ایک مجرہ لگا کر دیکھ رہے تھے (اس زمانے میں نرگس ٹاپ پر تھی)۔

''راضی یار! جلدی آ جاؤ، بہت بھوک لگی ہوئی ہے۔'' وقاص نے مجھے کپڑے بدلتے ہوئے دیکھا تو جلدی جلدی بولنے لگا۔

وہ مجھ سے عمر میں 10 سال چھوٹا تھا لیکن مجھے نام سے ہی بلاتا تھا۔مکان کے اندر باقی سبھی لڑکوں کو وہ پا جی (بھائی جان) کہہ کر بلاتا تھا لیکن مجھے کبھی بھی اس نے بڑے بھائی کی طرح ٹریٹ نہیں کیا تھا بلکہ وہ مجھے ایک دوست ہی سمجھتا تھا۔اور میں بھی اس بات کا برا نہیں مناتا تھا۔ مجھے اس کا پُر اعتماد لہجہ اچھا لگتا تھا۔

''راضی یار! جلدی کرو نا! قسم سے بہت بھوک لگی ہے۔'' مجھے ایک بار پھر اس کی آواز سنائی دی تو میں جلدی جلدی کپڑے تبدیل کر کے آ گیا۔

''یار! آپ لوگ میرا انتظار کیوں کر رہے تھے؟ آپ کھانا کھا لیتے تو میں بعد میں بھی کھا سکتا تھا۔'' وہ سارے اپنے سامنے کھانا رکھے میرا انتظار کر رہے تھے۔

''کوئی بات نہیں یار! اکٹھے کھانے میں زیادہ مزا آتا ہے۔'' وقاص نے میرا ہاتھ پکڑا تو میں اس کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے لگا۔

شام کو چھ بجے کے قریب مالک آیا تو میں نے اس کے ساتھ مل کر اسے ٹریکٹر کے ساتھ ہل جڑوا کر دی۔ اس ہل کے صرف تین بلیڈ تھے اور تقریباً ڈیڑھ فٹ لمبے تھے۔ 4x4 ویل کا ٹریکٹر جرمنی کی ایک معروف ترین کمپنی کا تھا اور اس کی قیمت 50 ہزار یورو بغیر ٹیکس کے تھی۔ گورنمنٹ کسانوں کو رعائیت دیتی ہے اور اسی رعائیت پر اس نے یہ ٹریکٹر قسطوں پر خریدا تھا۔ ٹیکس سمیت اس کی قیمت 70 ہزار یورو کے قریب تھی۔ یہ پاکستانی 90 لاکھ روپیہ بنتا ہے۔

آپ لوگ شاید یقین نہ کریں لیکن یہ ٹریکٹر ایک چھوٹی کرین کے برابر تھا۔ مکمل طور پر ائیر کنڈیشنڈ اور ہائیڈرلک سسٹم سے لیس ٹریکٹر۔۔۔ اس کے ڈیش بورڈ پر اتنے بٹن تھے کہ وہ مجھے کسی جہاز کا کاک پٹ لگتا تھا۔ اس ٹریکٹر میں اتنی طاقت تھی کہ وہ ہل کے ڈیڑھ فٹ کے بلیڈ کو با آسانی لے جا سکتا تھا۔ پاکستان میں آدھے فٹ سے زیادہ ہلیں ٹریکٹر نہیں کھینچ سکتے لیکن یہاں ٹریکٹر پہاڑوں پر ڈیڑھ فٹ کی ہلیں با آسانی کھینچ سکتے تھے۔ سبزی کو کھیت سے نکالنے، لانے اور لے جانے کے لئے چھوٹے ٹریکٹر استعمال ہوتے ہیں جو کم ڈیزل پر چلتے ہیں۔

''ٹھیک ہے راضی! اب تم چلے جاؤ، اب میں خود ہی ہل وغیرہ پھیر کر گھر چلا جاؤں گا۔ تم کل صبح کام پر مت آنا! میں کل صبح صبح آ کر بیج ڈال دوں گا اور پھر شام کو تمہارے ساتھ مل کر کھیت میں پائپ ڈال دوں گا، تم پائپ ڈالنے کا کام بھی سیکھ لو گے۔'' اس نے مجھے واپس جانے کا کہا تو میں واپس ڈیرے پر آ گیا۔

شکیل بھائی سی ڈی پر ایک پرانی سلطان راہی کی فلم لگا کر دیکھ رہے تھے اور باقی سارے لڑکے اس کی طرف دیکھ کر غصے سے تپ رہے تھے۔ شکیل بھائی کو پرانی سلطان راہی کی لڑائی والی فلمیں دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ سلطان راہی کو بھی راہی صاحب کہتے تھے اور اگر کوئی مذاق کرے تو آگے سے لڑنے پر بھی تیار ہو جاتے تھے۔ باقی سارے لڑکے نوجوان تھے اور انہیں نئی انڈین فلمیں یا انگلش فلمیں دیکھنی اچھی لگتی تھیں۔

سمارٹ فون کا زمانہ ابھی نہیں آیا تھا۔ ہاں! سمارٹ فون آ تو گیا تھا لیکن اس کی قیمت بہت زیادہ تھی۔

ابھی تک کسی بھی لڑکے نے سمارٹ فون نہیں لیا تھا۔ ٹی وی، سی ڈی ایک ہی تھا۔ شکیل بھائی فلم لگاتے تھے تو پھر مجبوری میں سب کو دیکھنی پڑھتی تھی۔

''یار شکیل بھائی! پھر پرانی فلمیں لے کر آ گئے ہیں؟ قسم سے صرف پانچ چھ فلمیں ہیں، وہی بار بار دیکھتے رہتے ہیں۔'' وقاص مجھے دیکھ کر باہر آ گیا اور میرے ساتھ بکریوں کے باڑے کی طرف چلنے لگا۔

میں ایک بار پھر بکریوں کو چارہ ڈالنے لگا تھا۔ اس کے بعد ایک بار رات کو ڈال دیتا تو پھر صبح تک وہی کھاتی رہتیں۔ میں ایک بار ہی اکٹھا چارہ نہیں ڈالتا تھا۔ اس سے وہ کھاتی کم اور خراب زیادہ کرتی تھیں۔ تھوڑا تھوڑا کر کے اور دن میں سات آٹھ بار ڈالتا تھا۔ بکریاں دو تین دن میں ہی مجھ سے بہت مانوس ہو گئی تھیں۔

''یار! قسم سے کچھ کرو ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔ یہ جو ابھی فلم لگی ہوئی ہے اسے میں کوئی دس بار دیکھ چکا ہوں۔ یار! یہ بور ہی نہیں ہوتا ایک ہی فلم بار بار دیکھنے سے۔'' میں وقاص کی حالت دیکھ کر ہنسنے لگا۔

''چلو کوئی بات نہیں ہے، وہ کونسا روزانہ دیکھتا ہے۔ دو تین دن کے بعد اگر وہ اپنی کوئی فلم لگا لیتا ہے تو پھر تم بھی برداشت کر لیا کرو۔ ابھی اس کی فلم ختم ہو جائے گی تو پھر تم اپنی لگا لینا۔''

شکیل بھائی روزانہ فلم نہیں لگاتے تھے۔ سارا دن انڈین یا نرگس کا مجرا لگا رہتا تھا اور وہ خاموشی سے دیکھتے تھے۔ جب کبھی دوسرے تیسرے دن ان کا دل پنجابی فلم دیکھنے کو کرجاتا تو پھر باقی لڑکے غصہ دکھاتے رہتے تھے۔ شکیل بھائی غصے کے بہت تیز تھے۔ بالکل سلطان راہی صاحب کی طرح آگے سے بات نہیں کرتے تھے۔ صرف دل ہی دل میں یا ایک دوسرے سے ہی باتیں کرتے تھے۔ ان کو کوئی بھی کچھ نہیں کہتا تھا۔

''چلو اگر جھیل کی طرف ایک چکر لگانا ہے تو چلتے ہیں؟ آدھے گھنٹے تک واپس آ جائیں گے۔'' میں نے بکریوں کو چارا ڈال دیا تو وقاص کو جھیل کی طرف جانے کا بولنے لگا۔

گرمیوں کے دن تھے۔ یونان میں گرمیوں میں سورج 9 بجے کے قریب غروب ہوتا تھا۔ یورپ میں سروی اور گرمی میں دن رات کا بہت فرق پڑھ جاتا ہے۔ سردیوں میں دن آٹھ گھنٹے کا جبکہ گرمیوں میں 16 گھنٹے کا ہو جاتا ہے۔

''آ جاؤ! چلتے ہیں۔ ویسے بھی فلم 3 گھنٹے کی ہے، اتنی جلدی ختم نہیں ہوگی۔ جھیل کا ایک چکر لگا آتے ہیں۔'' میں نے وقاص کا ہاتھ پکڑا اور جھیل کی طرف چل پڑا۔

جھیل پہاڑی کی دوسری طرف صرف 10 منٹ کے فاصلے پر تھی۔ دو پہاڑیوں کے درمیان ایک چھوٹے سے درے میں کچی سڑک بنی ہوئی تھی جو سیدھی جھیل کے اندر چلی جاتی تھی۔ سردیوں میں جھیل کا پانی نیچے ہو جاتا تھا اور گرمیوں میں بہت اوپر آ جاتا تھا۔ سڑک پتھر کی بنی ہوئی تھی اس لیے اسے پانی سے کوئی فرق نہیں پڑھتا تھا۔

''یار! اپنے مالک سے مچھلی پکڑنے والے کانٹے کا پتہ کرنا! کام سے تو 4 بجے چھٹی ہو جاتی ہے، بندہ ادھر آ کر مچھلیاں ہی پکڑ لیتا ہے۔'' ہم دونوں جیل کے کنارے بڑے ہوئے ایک بڑے پتھر پر بیٹھ گئے تھے۔

''یار! مچھلیاں تو بہت ہوں گی اس کے اندر؟'' اس نے ایک طرف کچھ لوگوں کو مچھلیاں پکڑتے ہوتے دیکھا تو مجھ سے پوچھنے لگا۔

''ہاں یار! میں مالک سے پوچھوں گا۔ اگر کانٹے دے دیئے تو ٹھیک ہے ورنہ ایک دو یورو کے گاؤں سے مل جائیں گے اور سبھی استعمال کریں گے۔ پیسے میں کاپی (کھاتے والی کاپی) میں لکھوا دوں گا۔ سبھی استعمال کریں گے۔'' میں نے جھیل میں ایک پتھر پھینکنے ہوئے کہا۔

''چلو یار! ان لوگوں کی طرف چلتے ہیں، انہوں نے کتنی مچھلیاں پکڑیں ہیں۔'' میں اور وقاص چند میٹر کے فاصلے پر موجود ایک فیملی کی طرف چل پڑے جو مچھلیاں پکڑنے میں مصروف تھی۔

یہ میاں بیوی اور ان کی سات آٹھ سالہ چھوٹی سی بچی تھی۔ ہم نے ان کو سلام کیا اور ادھر ہی کھڑے ہو کر انہیں مچھلیاں پکڑتے ہوتے دیکھتے رہتے۔ یہاں صرف چار یا پانچ انچ کی چھوٹی مچھلی تھی لیکن بہت زیادہ تھی۔ ان کے پاس دو کانٹے تھے اور ہر دس منٹ کے اندر وہ ایک مچھلی پکڑنے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔

''یار! یہاں تو کافی مچھلی ہے۔'' وقاص نے ان کی بالٹی میں دیکھتے ہوئے کہا۔ جہاں دس کے قریب مچھلیاں پانی میں گھوم رہی تھیں۔

"واقعی یار! مچھلی تو بہت زیادہ ہے۔ ابھی تو کانٹے لازمی لانے پڑیں گے۔" میں بھی بالٹی کے اندر مچھلیاں دیکھ کر حیران رہ گیا۔

اصل میں یہ جھیل بہت بڑی تھی۔ زیادہ تر لوگ گاؤں کی طرف سے ہی شوقیہ مچھلی پکڑتے ہیں۔ اس طرف کوئی بھی نہیں آتا تھا۔ کوئی ایک آدھ فیملی ہی اس طرف آتی تھی۔ ویسے بھی بازار سے سستی مچھلی مل جاتی ہے اس لیے لوگ صرف شوقیہ مچھلی پکڑتے ہیں۔ بازار میں پالک، شملہ مرچ اور مچھلی ایک ہی ریٹ یعنی دو یورو فی کلو تھی۔ جب کہ مرغی ڈیڑھ یورو فی کلو سستی ہے۔ یہاں بڑا گوشت سب سے مہنگا ہے جو تقریباً 10 یورو فی کلو کے حساب سے ملتا ہے اور میں نے اپنے دس سال میں ایک بار بھی بڑا گوشت لے کر نہیں کھایا ہے۔ البتہ مالکوں کی طرف سے یا کسی دعوت پر کھایا ہو تو وہ علیحدہ بات ہے۔ چھوٹا گوشت (بکرے کا گوشت) سستا ہے۔ اب شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا اس لئے میں اور وقاص واپس آ گئے۔

دوسرے دن باقی لڑکے تو صبح دوسرے ڈیرے پر پالک کاٹنے چلے گئے جبکہ میں نے اٹھ کر بکریوں کو چارڈالا، ان کے باڑے کی تھوڑی سی صفائی کی اور مالک کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔ میرا مالک دس بجے کے قریب آیا۔ وہ پہلے پالک کا بیج لینے چلا گیا تھا۔ شہر کے اندر کھیتی باڑی والی دکانیں 9 بجے کے بعد کھلتی تھیں۔ اس نے بیج خریدا اور پھر ڈیرے پر آیا تھا۔

"چلو بھئی راضی! جلدی کرو، پہلے ہی بہت دیر ہو گئی ہے۔" اس نے ٹریکٹر نکالا اور میں اسے ڈرل مشین ڈالنے لگا۔ مشین ڈالنے کے بعد اس نے مجھے اپنے ساتھ ٹریکٹر پر بٹھایا اور کھیت کی طرف روانہ ہو گیا۔

یہاں پہنچ کر میں نے پالک کے بیج کے پیکٹ کھول کر انہیں مشین میں ڈالا تو مالک انہیں کھیت میں لے گیا۔ ڈرل مشین کے پیچھے ہی سہاگہ بندھا ہوا تھا۔ آدھے گھنٹے میں ہی مالک نے پورے کھیت میں پالک بو دی تو پھر ٹریکٹر کو ایک سائیڈ پر کھڑا کر کے ہم کھیت میں پانی کے لیے پائیپ ڈالنے لگے۔ یہ کام مشکل تھا۔ پلاسٹک کے پائیپ کو کھیت کے اندر پکڑ کر گھسیٹ کر لے جانا بہت مشکل کام تھا۔ یہ پائیپ رول شدہ ہوتے تھے جن کو ایک گھومنے والی چرخی پر رکھا جاتا اور پھر میں اس کے ایک کھلے سرے کو اپنے کندھے کے اوپر سے گزار کر مضبوطی سے پکڑتا اور پھر کھیت کے دوسرے سرے کی طرف چلنا شروع کر دیتا۔

یہ ٹوٹل 50 میٹر کا پائیپ ہوتا تھا۔ پہلے 20 میٹر تو آسانی سے چلے جاتے اس کے بعد مشکل ہو جاتی

تھی۔تیس پینتیس میٹر کے بعد پیچھے مالک بھی باقی پائیپ کو پکڑ کر زور لگاتا اور میں اگلے سرے سے زور لگاتا۔ ہمارا کھیت 100 میٹر لمبا تھا اس لئے ہم نے درمیان میں لوہے کے بڑے 5 انچ والے پائپ ڈالے تھے اور اس کے دونوں سائیڈوں پر چھوٹے پلاسٹک کے پائیپ ڈالے تھے۔ پلاسٹک کے پائیپ ڈالنے کے بعد فوارے (بک) لگانے کی باری تھی۔

یہ باریک 3 فٹ کا پنسل کی طرح کا پائیپ ہوتا ہے جس کے سرے پر فوارا ہوتا ہے۔ پائیپ کو کھیت میں سیدھا کھڑا کرنے کے لئے اس کے ساتھ لوہے کا چار فٹ کا سریا ہوتا ہے۔اس باریک پائیپ کو سریے کے ساتھ تاروں کی مدد سے باندھا ہوتا ہے۔سریے کو زمین میں سیدھا گاڑھتے اور اس کے سرے پر فوارہ (BIK) لگا دیتے۔ میں بکوں (BIKS) کا بنڈل کندھے پر رکھتا اور اسے کھیت کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سوراخ (جہاں بک لگانی ہوتی ہے) دیکھ کر لگاتا جاتا۔میرے پیچھے پیچھے مالک ان بکوں کو پلاسٹک کے پائیپ سے جوڑتا جاتا۔ہمیں ان بکوں کو لگاتے لگاتے چھ بج گئے تھے۔لڑکے کام سے واپس آ گئے تھے لیکن ہمارا کام ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔

''لو بھئی! کام ختم ہو گیا ہے۔تم ایک بار موٹر چلا کر ان بکوں کو دیکھ لینا، اگر کوئی خراب ہو تو ٹھیک کر دینا، پھر رات کو بارہ بجے پانی لگانا، صبح چھ بجے تک چلتی رہنے دینا اور پھر بند کر کے اس دوسرے کھیت کو لگا دینا۔'' مالک نے ایک دوسرے کھیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''جی فندیکو! میں کر لوں گا۔'' میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''میں ادھر ہی ساتھ والے ڈیرے کی طرف جا رہا ہوں، اس کے پاس پالک کے چار پانچ کھیت ہیں۔اس سے ایک کھیت خرید لیتا ہوں اور خود کام شروع کرتے ہیں۔تم کل حوضی صاف کر کے اس میں بھی تازہ پانی بھر لینا۔'' اس نے مجھے کل کے لیے کام سمجھایا اور ٹریکٹر لے کر ڈیرے کی طرف چلا گیا۔

میں نے موٹر چلائی اور خراب بکوں کو ٹھیک کرنے لگا۔ سات بجے کے قریب میں نے اپنا سارا کام مکمل کر لیا اور ڈیرے پر آ گیا۔ابھی صرف رات کو موٹر ہی آن کرنی تھی۔ دوسرے دن مالک ایک جگہ سے پالک کا کھیت خرید لایا تو پھر ہمارا اپنا کام شروع ہو گیا۔ہم اپنے مالک کی گاڑی تیار کر کے دینے لگے تو وہ خود منڈی جانے لگا۔ میں دن کو لڑکوں کے ساتھ سبزی توڑتا اور شام کو پانی لگانا اور ڈیرے پر دوسرا کام۔۔۔میرا کام

بہت بڑھ گیا تھا اس لئے مالک نے میری تنخواہ بڑھا کر پہلے 900 یورو اور پھر پوری 1000 یورو کر دی۔

یونان کے سخت ترین معاشی بحران کے دوران میں پاکستانی ایک لاکھ روپے سے زیادہ تنخواہ لے رہا تھا۔ ڈیرے پر کام آہستہ آہستہ چل نکلا اور ہماری تعداد بھی 5 سے بڑھ کر دس ہو گئی۔ کام زیادہ بڑھا تو مالک نے دیہاڑی کی بجائے ایک یورو فی کریٹ کر دیا۔ کام کم کرو یا زیادہ مالک کو اس چیز سے نجات مل گئی اور وہ سر پر کھڑا ہو کر کام کروانے کی بجائے اپنا دوسرا کام کرتا رہتا۔ اس کو منڈی میں جتنے کریٹ لے جانے ہوتے۔۔۔ وہ رات کو ہر سبزی کے علیحدہ علیحدہ کریٹ لکھوا دیتا اور ہم اسی کے مطابق دوسرے دن گاڑی تیار کر دیتے۔ وہ ہفتے کے بعد کریٹوں کے حساب سے پیسے دے دیتا تھا۔ وہ کسی بھی کھیت کی گوڈی کرنے کے لئے بھی ٹھیکا لگاتا تھا۔ ہم اپنی مطلوبہ رقم لیتے اور پھر ایک دن میں گوڈی ختم کرنی ہے یا دس دن میں، یہ ہماری مرضی پر منحصر ہوتا تھا۔

یہاں رہتے ہوئے میں اپنا مقصد نہیں بھولا تھا۔ مجھے امریکہ جانا تھا اور اس کے لئے میں مختلف دوستوں سے رابطہ کرتا رہتا تھا، لیکن مجھے کہیں سے بھی کوئی مثبت رد جواب نہیں ملا تھا۔ یونان سے کوئی بھی ایجنٹ میکسیکو، امریکہ یا کینیڈا کی گیم نہیں کرتا تھا۔

''یار! تم فرانس چلے جاؤ؟ ادھر میرے کزن رہتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ وہاں سردار (سکھ یاتری) فرانس سے کینیڈا کی گیم کرتے ہیں۔ شِپ کی گیم ہوتی ہے۔ ایک مہینے میں آپ کینیڈا پہنچ جاؤ گے تو وہاں سے آسانی سے امریکہ جا سکتے ہو۔'' وقاص نے جھیل کے ایک پتھر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

گھر میں سب لوگوں کو میرے امریکہ جانے کے جنون کا پتہ تھا۔ یہاں تک کہ ہمارے مالک کو بھی پتہ چل گیا تھا کہ میں امریکہ جانے کی کوشش کرتا رہتا ہوں اور وہ میرے جنون پر ہنستا رہتا تھا۔

''یار! میرا بھی یہی خیال ہے کہ مجھے جرمنی یا فرانس چلے جانا چاہیئے۔ وہاں سے کینیڈا کی گیم لگ جاتی ہے۔ کینیڈا کی نہ ہو تو میکسیکو کی تو آسانی سے لگ جاتی ہے۔ یہاں یونان سے بہت مشکل ہے۔ ابھی تو میرے پاس پیسہ بھی اچھا خاصہ ہے۔'' میں نے دور جھیل کے دوسرے کنارے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ایمان کی محبت ابھی تک تازہ تھی۔ چھ سال گزر گئے تھے لیکن ابھی بھی اس کا چہرہ میری آنکھوں میں سمایا

رہتا تھا۔تنہائی کے ایک ایک لمحے میں اس کی یادیں مجھے زندہ رکھتی تھیں۔ان چھ سالوں میں کوئی ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا تھا جس دن میں نے ایمان کو یاد نہ کیا ہو۔یورپ کی ان چکا چوند روشنیوں نے ایک پل کے لئے بھی میری آنکھوں سے ایمان کو اوجھل نہیں ہونے دیا تھا۔

یونان بہت خوبصورت ملک ہے۔ یہاں کا نسوانی حسن پوری دنیا میں مشہور ہے۔ترکی نے سینکڑوں سال اس ملک پر حکومت کی ہے۔مشرق اور مغرب کا حسین امتزاج۔۔۔ یہاں کی ایک نارمل لڑکی بھی ایشوریہ رائے سے زیادہ حسین ہے۔ یہاں کی بے پناہ حسینائیں بھی مجھے ایمان کی محبت نہیں بھلا سکی تھیں۔ میں نے کبھی کسی کو نظر بھر کر دیکھا بھی نہیں تھا۔

''صحیح بات ہے یار! دیکھ لو، یہ گرمیوں کا سیزن لگا کر چلے جانا۔میرا بھی ارادہ بن رہا ہے۔ یہاں کے حالات خراب ہو رہے ہیں۔فرانس بڑا ملک ہے اور میرے کزن بھی ادھر ہی ہوتے ہیں۔ میں اب فرانس جا کر ہی کام کروں گا۔'' وقاص نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے اسے بچپن سے نوجوانی کی حدود میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔اس کے چہرے پر ابھی بھی بچپنا جیسے ٹھہر سا گیا تھا۔غربت بہت کچھ کروانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ورنہ کس ماں کا دل کرتا ہے کہ اپنے 14 سالہ بیٹے کو خود سے جدا کرنے کو؟ وہ 14 سال کی عمر میں پاکستان سے یونان آیا تھا۔اس کا والد پاکستان میں توڑی کا کام کرتا تھا۔ وہ کسانوں سے توڑی خریدتے تھے اور پھر گدھا گاڑی پر رکھ کر مختلف دیہات میں تھیلوں کے حساب سے بیچتے تھے۔ان کے گاہک گھر میں ایک یا دو بھینس پالنے والے ہوتے تھے۔وہ لوگ ایک بھینس کا دودھ بیچ کر ہی پورے گھر کا خرچہ چلا لیتے تھے۔

یہ کام خاص طور پر اپر پنجاب (سیالکوٹ، گوجرانوالہ اور گجرات منڈی) میں ہوتا ہے۔ جہاں کے گاؤں بھی چھوٹے چھوٹے شہر بن گئے ہیں۔ ہمارے جنوبی پنجاب میں جہاں چھوٹے چھوٹے گاؤں ہوتے ہیں اور جو شہر سے پچاس ساٹھ کلومیٹر دور ہوتے ہیں وہاں یہ کام نہیں ہوتا۔ بہاولپور میں میرا گاؤں انڈیا کے بارڈر کے نزدیک چولستان میں ہے۔ وہاں اگر میں روزانہ بھینسوں سے 50 لیٹر دودھ حاصل کرتا ہوں تو مجھے اس دودھ کو بیچنے کے لئے کوئی مارکیٹ نہیں ملے گی۔ دو چار لیٹر دودھ تو بک جاتا ہے لیکن اس سے زیادہ دودھ بیچنے کے لئے آپ کو گاہک ہی نہیں ملتا۔ یہ شہر سے دوری کی وجہ سے ہے۔ہم بہاولپور شہر سے تقریباً 80 کلومیٹر دور

ہیں۔

وقاص بہت محنتی لڑکا تھا۔اسے اپنے گھر کے حالات کا پتہ تھا اس لئے کم عمر ہونے کے باوجود اس نے پیسے کمانے کے لئے سب کچھ کیا۔مزدوری نہیں ملتی تھی تو وہ سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر سی ڈی (CD) فلمیں بیچتا تھا۔وہ ایتھنز شہر کی مختلف کالونیوں میں جا کر چھوٹی چھوٹی چیزیں مثلاً گھڑیاں، بلٹ، بچوں کے غبارے اور کچن میں استعمال ہونے والے چمچ اور چھریاں بیچتا تھا۔ چھ سال کی لگاتار محنت سے وہ اپنے چھوٹے بھائی کو یونان منگوانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔اب ڈیرے پر یہ دونوں بھائی اکٹھے کام کرتے تھے۔

صدام حسین عرف موٹو وقاص سے تین سال چھوٹا تھا۔موٹو نام سے یہ مت سمجھیں کہ وہ جسمانی طور پر موٹا تھا۔نہیں! وہ عقل سے موٹا بلکہ پیدل تھا۔ بالکل بیلوں کی طرح زور لگاتا تھا لیکن تعلیم کے میدان میں صفر تھا اور حس سے زیادہ سادہ اور معصوم تھا۔ وقاص کا بھائی آ گیا تھا اس لئے ابھی وہ فرانس جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ دونوں بھائی کما رہے تھے اور گھر کی غربت ختم ہو گئی تھی۔انہوں نے پاکستان میں گدھے کو فروخت کر کے ایک چھوٹا ڈالا لے لیا تھا۔ان کا والد اب ڈالے پر توڑی (گندم کا بھوسہ) فروخت کرتا تھا۔

میرے گھر میں بھی اب ٹریکٹر اور موٹر سائیکل آ گیا تھا۔ مجھ سے بڑے فاروق بھائی سعودی عرب چلے گئے ۔جبکہ بڑے بھائی طارق نے ڈیرے کا پورا کام سنبھال لیا تھا۔ خدا نے ان کے ہاتھ میں برکت بھی بہت دی ہوئی تھی۔ ہمارے گھر میں خوشحالی آ گئی تھی ۔صرف میری کمی گھر میں محسوس ہوتی تھی اور والدہ مجھے یاد کرتی رہتی تھیں۔ جبکہ ابو پانچ وقت کی نماز پڑھتے تھے اور ہر دعا میں خدا سے میری اور ایمان کی سلامتی اور ملن کی دعائیں ہی کرتے رہتے تھے۔ کتنی عجیب بات ہے۔۔۔ میرے اور وقاص دونوں کے گھروں میں گاڑیاں آ گئی تھیں لیکن دونوں کو ہی گاڑی چلانا نہیں آتی تھی۔صرف شکیل بھائی موٹر سائیکل چلانا جانتے تھے جبکہ ہم دونوں کو سائیکل کے علاوہ کچھ بھی نہیں آتا تھا۔

’’چلو یار! گھر چلتے ہیں۔‘‘ ہم دونوں رات کا کھانا کھا کر باہر نکلے تھے اور چلتے چلتے کافی دور آ گئے تھے۔

’’ہاں یار واقعی! اب گھر چلتے ہیں۔ بھائی شکیل نے پھر کوئی پنجابی فلم نہ لگا دی ہو۔‘‘ ہم دونوں ایسے ہی گپ شپ لگاتے ہوئے گھر واپس آئے۔

میں اب سیریس ہوکر آگے جانے کی سوچ رہا تھا۔ مجھے یونان میں بہت زیادہ عرصہ ہوگیا تھا۔ یہاں سے امریکہ جانا تقریباً ناممکن نظر آرہا تھا۔ بہت زیادہ گرمی ہوگئی تھی۔ پالک کی بجائے اب چھوٹا سبز پیاز اور توریاں لگائی جارہی تھیں۔ چھوٹا سبز باریک پیاز پاستے (PASTA) کے اندر استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ فرائی انڈے اور سلاد کے ساتھ بھی استعمال ہوتا ہے۔

دوسرے دن شام کو میں توری کے ایک کھیت میں پانی لگانے لگا۔ ابھی شام کے چھ بجے تھے اور مجھے دس بجے تک ادھر پانی لگانا تھا۔ اس کے بعد میں دوسرے کھیت میں پانی لگا دیتا۔ گرمی بہت زیادہ تھی، میں کھیت کے اندر بکوں کو ٹھیک کرنے کے لئے گھسا تو پانی سے میرے پورے کپڑے گیلے ہوگئے۔ توری کے پودے ابھی صرف ایک ایک فٹ کے ہی ہوئے تھے۔ میں نے شرٹ اتاری اور اسے کندھے پر رکھ لیا۔ پندرہ بیس منٹ تک میں نے ساری بکس دیکھ لیں تو آہستہ آہستہ واپس ڈیرے کی طرف جانے لگا۔ سامنے آپوتیکی (بڑا شیڈ جہاں ٹریکٹر اور دوسری مشینری کھڑی ہوتی ہے) کے سامنے میرے مالک کا بیٹا کوستا، سرینا اور ایک خوبصورت سی لڑکی کھڑی تھی۔

''ہاں راضی صاحب! کیسے ہو؟'' کوستے نے مجھے دیکھا تو دور سے ہی ہاتھ ہلا کر میری خیریت دریافت کرنے لگا۔

''آج تو پولیس کا چھاپہ پڑ گیا ہے۔۔۔سوری سر! میرے پاس کاغذات تو نہیں ہیں۔'' کوستا پولیس میں تھا۔ میں نے اسے دیکھتے ہی دونوں ہاتھ کھڑے کر دیئے۔

''مجھے معلوم ہے کہ تمہارے پاس کاغذات ہیں لیکن باقی لڑکوں کے متعلق کیا خیال ہے؟'' اس نے ڈیرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اندر دس میں سے صرف 6 لڑکوں کے پاس کاغذات تھے جبکہ باقی 4 لڑکوں کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔

''یار! آپ پولیس والے واقعی بہت تیز ہوتے ہیں۔'' میں ان کے پاس آکر رک گیا۔

''راضی! آپ سے ملوانے کے لیے مہمان لیکر آئے تھے ہم۔'' سبرینہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ سبرینہ کوستا کی گرل فرینڈ تھی۔

''جی جی! ایس آس(YAS As)'' میں نے یونانی میں اسے سلام کرتے ہوئے کہا۔

''یہ ایسگارڈ (ASGARD) ہے۔ ایسگارڈ شلزے (ASGARD SCHULZE)'' سبرینہ نے میرا تعارف ساتھ کھڑی ہوئی لڑکی سے کروایا تو اس لڑکی نے اپنا نازک سا ہاتھ میری طرف بڑھایا۔

''ہائے ایسگارڈ! مجھے آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔'' میں نے اس کا نازک ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

ایسگارڈ بہت خوبصورت لڑکی تھی۔ 25 سال کے قریب عمر تھی۔ انتہائی متناسب، ورزشی جسم اور لمبائی کی طرف جاتا ہوا چہرا۔۔۔ جس کے اوپر خالص یورپین آنکھیں، وہ یونانی حسن کا شاہکار نظر آ رہی تھی۔

''یار! یہ یونانی نہیں ہے۔ اندازہ لگا سکتے ہو کس ملک کی شہری ہے یہ؟'' سبرینہ نے میرے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

میری سب سے پہلی دوستی کوستا سے ہوئی تھی لیکن اس کی گرل فرینڈ سبرینہ سے میری زیادہ دوستی ہو گئی تھی۔ وہ ہر دوسرے تیسرے دن لازمی ڈیرے کا چکر لگاتی تھی۔ پتہ نہیں کیوں مجھے سبرینہ میں اپنی چھوٹی بہن ارم کی جھلک نظر آتی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ بغیر شادی کے کوستے کے ساتھ رہتی تھی لیکن یورپی معاشرے میں یہ نارمل بات ہے۔ یہاں 95 فیصد جوڑے بغیر شادی کے ہی رہتے ہیں۔ دو تین سال میں اگر ذہن مل جائیں تو شادی کر لیتے ہیں ورنہ الگ ہو جاتے ہیں۔ میں سبرینہ کو اپنی بہن ہی سمجھتا تھا اور وہ بھی مجھے اپنا بھائی مانتی تھی۔

''کیوں جی؟ کوئی اندازہ تو لگاؤ یار!'' سبرینہ نے ایک بار پھر میرا کندھا پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا تو میں ایسگارڈ کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں شرارت سے مچل رہی تھیں۔

''شاید جرمنی یا سپین سے ہو؟'' بڑی بڑی آنکھوں نے نفی کا اشارہ کیا تو میں جلدی جلدی مختلف ملکوں کے نام بولنے لگا۔

''ڈنمارک، ناروے، انگلینڈ؟''

''میں یو ایس اے (USA) سے ہوں۔ یونائیٹڈ سٹیٹ آف امریکہ۔'' اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔

''کیا۔۔۔؟ آپ کہاں سے ہو؟'' میں براہ راست اس سے پوچھنے لگا۔

''میں امریکہ سے ہوں۔ جانتے ہونا امریکہ کو؟'' اس نے شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا۔ میں پلکیں جھپکائے بغیر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ میں اپنی جگہ پر ساکت ہو گیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار کسی امریکی کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں ہو رہا تھا۔ وہ خوبصورت سی لڑکی میرے خوابوں کی سرزمین سے تعلق رکھتی تھی۔

''راضی بھائی! ٹھیک تو ہونا؟ سانس لو کہیں گر ہی نہ جانا۔'' سبرینہ نے مجھے پکڑ کر ہلایا تو میں ہوش میں آ گیا۔

''آپ۔۔۔آپ واقعی۔۔۔امریکہ سے ہو؟'' میں نے اٹک اٹک کر بولتے ہوئے کہا۔ میری آنکھیں ابھی تک اس کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ پتہ نہیں کیوں مجھے وہ جنت سے آئی ہوئی کسی حور کی مانند لگ رہی تھی۔

''راضی! جنت میں حوریں بہت ہوتی ہیں۔'' مجھے ایمان کی کہی ہوئی بات یاد آ گئی۔ ایمان کی یاد آئی تو اچانک ہی میری آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے۔

''ارے یار! تم اچانک رونے کیوں لگ گئے ہو؟'' سبرینہ نے یوں مجھے روتے ہوئے دیکھا تو جلدی سے مجھے گلے لگا لیا۔ پانی میں ہونے کی وجہ سے میرے کپڑے بھیگ گئے تھے۔ میں نے گیلی شرٹ ہی واپس پہن لی تھی۔ میرے گلے لگنے کی وجہ سے سبرینہ کے بھی کپڑے گیلے ہونے لگے۔ میں جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔

''سوری سبرینہ!'' میں نے سبرینہ کی گیلی شرٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''کوئی بات نہیں ہے! تمہیں یقین تو آ گیا ہے کہ یہ امریکہ سے آئی ہے یا پھر اپنا پاسپورٹ دکھائے؟ میری کزن ہے اور میں سپیشل تم سے ملانے کے لئے لائی ہوں تاکہ تم ایک بار کسی امریکی کو بھی دیکھ لو۔ قسمت

تمہیں امریکہ بھی لے جائے گی۔'' سبرینہ نے اپنی شرٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''کیا اس کے پاس امریکی پاسپورٹ ہے؟'' میری نظریں ابھی تک بھٹک بھٹک کر اس کی طرف جا رہی تھیں۔

''ہاں ہاں! کیوں نہیں۔۔۔میں اپنے ساتھ ہی لے کر آئی ہوں۔'' ایسگارڈ نے اپنے پرس کی زپ کھولتے ہوئے کہا۔میری نظریں اس کے ہاتھوں پر جم گئیں۔

''یہ لو، دیکھ لو! اصلی امریکی پاسپورٹ ہے۔'' اس نے پرس سے نیلے رنگ کا پاسپورٹ نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔میرے ہاتھ گیلے تھے۔میں نے جلدی سے اپنے ہاتھوں کو سبرینہ کی شرٹ سے صاف کیا۔

''اوئے گندے! میری ساری شرٹ کا ستیاناس کر دیا ہے۔'' سبرینہ نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔اس کی سامنے والی سائیڈ مجھ سے گلے لگنے کی وجہ سے گیلی ہوگئی تھی جبکہ بیک سائیڈ سے میں نے ہاتھ پونچھ لئے تھے۔

''کوئی بات نہیں! بہنیں اسی کام کے لئے ہی تو ہوتی ہیں۔'' میں نے آہستہ سے کہا اور ہاتھ آگے بڑھا کر ایسگارڈ سے پاسپورٹ لے لیا۔گہرے نیلے رنگ کا چھوٹا سا پاسپورٹ جس کے اندر پوری دنیا سما جاتی تھی۔میرے ہاتھ اس پاسپورٹ کے رعب سے کانپنے لگے تو میں نے جلدی سے اسے واپس ایسگارڈ کے ہاتھ میں دے دیا۔

''کیوں یار! کیا ہوا؟ آپ نے تو اسے کھول کر بھی نہیں دیکھا ہے۔'' ایسگارڈ نے میرے ہاتھ سے پاسپورٹ لیتے ہوئے کہا۔

''آرام سے دیکھو یار! ہمیں کوئی جلدی نہیں۔تمہارے گھر آئے ہیں تو کھانا تو کھلا کر ہی بھیجو گے نا؟'' اس بار کوستے نے درمیان میں بولتے ہوئے کہا۔

''ہاں ہاں دیکھو! آرام سے دیکھو،ہمیں کوئی جلدی نہیں ہے۔'' ایسگارڈ نے دوبارہ میری طرف پاسپورٹ بڑھاتے ہوئے کہا۔

یونانی کھانے اُبلے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ پیاز کو تڑکا نہیں لگاتے ہیں۔صرف ایک منٹ تیل میں رکھتے ہیں اور پھر پانی ڈال دیتے ہیں۔سبزی اور گوشت سب ابلا ہوا ہی استعمال ہوتا ہے۔ پاکستانی اور انڈین کھانے اپنے مصالحوں اور سپائس کی وجہ سے پوری دنیا میں مشہور ہیں۔جو آدمی بھی ایک بار ہمارا کھانا کھالیتا ہے وہ پھر بار بار مانگتا رہتا ہے۔ہاں!البتہ مرچ کم ہو۔یہ لوگ لال مرچ استعمال نہیں کرتے ہیں۔ اگر پہلی بار ہی تیز مرچ والا کھانا کھالیا تو پھر دوبارہ کبھی زندگی میں پاکستانی کھانا نہیں کھائے گا۔

شکیل بھائی پروفیشنل باورچی (cook) تھے۔انہوں نے پاکستان اور یونان دونوں جگہوں پر ریسٹورنٹ میں باورچی کا کام کیا تھا۔ان کے ہاتھ میں بہت ذائقہ تھا۔کوستا یا سبرینہ دونوں جب بھی ادھر کا رخ کرتے تھے تو شکیل بھائی کے ہاتھ سے بنا ہوا کھانا ضرور کھا کر جاتے تھے۔

میں نے پاسپورٹ ایسگارڈ سے لے لیا اور انہیں لے کر گھر آ گیا۔شکیل بھائی پھر پنجابی فلم دیکھ رہے تھے۔وہ مہمانوں کو دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔کوستا اپنے ساتھ گوشت لے کر آیا تھا۔اس نے گوشت کا پیکٹ شکیل بھائی کی طرف بڑھایا تو شکیل بھائی اسے لے کر کچن میں گھس گئے۔کوستا یا سبرینہ ہمیشہ جاتے ہوئے شکیل کو 10 یورو دے کر جاتے تھے۔شکیل منع بھی کرتا تھا لیکن وہ زبردستی دے کر جاتے تھے۔ہم غریب لوگ صرف پیسے کے لئے ہی پردیس کاٹ رہے ہوتے ہیں۔شکیل بھائی 10 یورو لے کر ہی خوش ہو جاتے تھے اور ان کا انتظار کرتے رہتے تھے۔سبرینہ کے والد کے تھیوا (THIWA) شہر کے اندر دو پٹرول پمپ تھے جبکہ ہمارے مالک کی بھی کم از کم 100 ایکٹر زمین تھی۔یہ امیر لوگ تھے۔انہیں دس بیس یورو سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔جبکہ ہمارے لئے 10 یورو 1000 پاکستانی روپے تھے جو پاکستان میں تین دن کی مزدوری کے برابر تھے۔

گرمیوں کے دن تھے اور سارے لڑکے ایسے ہی ہلکے پھلکے کپڑوں میں بیٹھے فلم دیکھ رہے تھے۔وہ مہمانوں کو دیکھ کر جلدی سے باہر نکلے اور صابن سے منہ ہاتھ دھو کر صاف کپڑے پہننے لگے۔کوستا اور سبرینہ تو ڈیرے پر اکثر آتے رہتے تھے۔سبرینہ بہت خوش اخلاق اور ملنسار طبیعت کی مالک تھی اس لئے اس کی سبھی لڑکے عزت کرتے تھے۔لڑکے سبرینہ کے ساتھ آئی اس کی کزن ایسگارڈ کو دیکھ کر پاگل ہو رہے تھے۔اتنی خوبصورت لڑکی جب گھر آئے تو اسے امپریس تو کرنا چاہئے نا!

''یار! یہ سارے ہمیں دیکھ کر باہر کیوں بھاگ گئے؟'' سبرینہ نے لپک کر صدام کو پکڑتے ہوئے کہا۔ وقاص کا بھائی صدام سولہ سترہ سال کا ابھی معصوم سا لڑکا تھا۔ سبرینہ کی اس کے ساتھ بڑی دوستی تھی۔ سبرینہ اسے تنگ بھی بہت کرتی تھی۔ ابھی بھی وہ صرف ٹراؤزر پہنے فلم دیکھ رہا تھا۔ سبرینہ کو دیکھ کر باہر کی طرف بھاگا لیکن پکڑا گیا اور اب اس کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ پتلے سے صدام میں جان بہت تھی لیکن سبرینہ بھی پولیس اکیڈمی میں جانے کے لئے ٹریننگ کر رہی تھی اور عمر میں بھی اس سے تین چار سال بڑی تھی۔ وہ صدام سے زیادہ طاقت ور تھی اور اسی لئے وہ اسے تنگ بھی بہت کرتی تھی۔

''باجی پلیز! چھوڑ دو۔'' اس نے صرف ایک منٹ ہی زور لگایا اور پھر منتیں کرنے لگا۔

''چھوڑ دیتی ہوں۔۔۔ پہلے یہ بتاؤ کہ باہر کیوں بھاگ رہے ہو؟'' سبرینہ نے اسے چٹکی کاٹتے ہوئے کہا۔

''وہ۔۔۔ باجی! میں نے شرٹ پہنی ہے۔'' وہ چٹکی سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''کیوں؟ پہلے تو بڑے سلمان خان بنے ہوئے تھے، اب کیوں شرما رہے ہو؟'' سبرینہ نے سلمان خان اور شاہ رخ خان کی کافی ساری فلمیں دیکھی ہوئی تھیں۔

''راضی بھائی! آپ مدد کرو نا؟'' اس نے میری طرف مدد طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تو میں بے اختیار مسکرا دیا۔ سبرینہ نے اسے چھوڑ دیا تو وہ بھاگ کر باہر چلا گیا۔

یہ ٹی وی روم تھا۔ اس کمرے کو ہم نے صرف TV کے لئے رکھا ہوا تھا جبکہ باقی دونوں کمروں میں پانچ پانچ لڑکے رہتے تھے۔ جس نے فلم دیکھنی ہوتی وہ ادھر آ کر دیکھتا اور جب نیند آتی تو اپنے کمرے میں جا کر سو جاتا۔ CD پوری رات چلتی رہتی تھی۔ کسی کو اس سے کوئی پرابلم نہیں ہوتی تھی۔ تھوڑی دیر تک لڑکے تیار ہو کر آنا شروع ہو گئے۔ میں نے بھی کپڑے تبدیل کر لیے تھے۔

پاسپورٹ ابھی تک میرے ہاتھ میں ہی تھا اور میں اسے کسی عقیدت مند کی طرح دیکھ رہا تھا۔ میں نے اپنی پوری زندگی اس ایک ملک کے لئے وقف کر کے رکھ دی تھی۔ پتہ نہیں کتنی بار میں نے موت کو انہی آنکھوں کے سامنے دیکھا تھا۔ اپنے پیاروں کو اپنے ہاتھوں میں دم توڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ میری جوانی کے

سات سال اس راستے کی تلاش میں گزر گئے تھے لیکن منزل کا ابھی بھی کوئی پتہ نہیں تھا۔

میں نے سامنے بیٹھی ہوئی ایسگارڈ کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ میری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔ شاید میرے اندر کے جذبات کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی یا شاید میری بے بسی کا اندازہ لگا رہی تھی۔ میں نے ایک پل کے لئے اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور خاموشی سے اسے پاسپورٹ پکڑا دیا۔

''راضی! زمانے کے زیادہ ہی ستائے ہوئے لگ رہے ہو؟'' اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو میں ایک پل کے لیے مسکرا دیا۔

''ہاں یار! تم نے اپنی کبھی کوئی کہانی نہیں سنائی۔ تمہارا ماضی، ماں باپ، بہن بھائی یا تمہاری کوئی محبوبہ ۔۔۔جس سے تم نے محبت کی ہو؟'' سبرینہ نے جلدی سے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں سبرینہ! میں غریب آدمی ہوں اور غریب آدمی کی کوئی کہانی یا کوئی محبت نہیں ہوتی۔'' میں جلدی سے اٹھا اور باہر آ گیا۔

میرا حوصلہ ٹوٹ رہا تھا۔ میں ان لوگوں کے سامنے بے بس نظر نہیں آنا چاہتا تھا۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا حوضی (سبزی دھونے والا پانی کا حوض) کی دیوار پر آ کر بیٹھ گیا۔ میں دور فلک پر اڑتے ہوئے پرندوں کو دیکھنے لگا۔

''راضی! کوئی بہت گہری چوٹ کھا کر آئے ہو پاکستان سے۔۔۔تمہاری آنکھوں سے آگ نکلتی ہے جو سامنے بیٹھے ہوئے ہر شخص کو جلانے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔ بہت گہری آنکھیں ہیں تمہاری۔'' ایسگارڈ نے پیچھے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں نہیں! ایسی کوئی بات نہیں ہے، بس کبھی کبھی گھر والے یاد آ جاتے ہیں۔'' میں نے جلدی سے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ میں اس کے سامنے اپنے آپ کو کمزور ثابت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ میرا معاملہ تھا، یہ میری محبت تھی اور میں محبت کا لیبل ماتھے پر سجائے کسی کی ہمدردی نہیں لینا چاہتا تھا۔

''ہاں واقعی! کبھی کبھی گھر والے بڑی شدت سے یاد آتے ہیں۔ آپ کو کتنا عرصہ ہوا ہے پاکستان سے یہاں آئے ہوئے؟'' اس نے میرے برابر حوضی کی دیوار پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''جی۔۔۔ مجھے سات سال ہو گئے ہیں۔'' میں اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔ میری آنکھوں میں ابھی تک نمی تھی اور میں اس نمی کو اس سے چھپانا چاہتا تھا۔

''اوہ! سات سال بہت زیادہ عرصہ ہوتا ہے۔ میں تو ایک مہینہ بھی اپنے ماں باپ سے دور نہیں رہ سکتی۔ آپ ماں باپ، دوست احباب سب کچھ چھوڑ کر آ گئے ہو؟'' اس نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ماں باپ، دوست احباب، مجھے تو کسی کی بھی یاد نہیں آتی تھی۔ میرا دل بہت سخت تھا اور یہ دل ایمان کے سوا اور کسی کو یاد ہی نہیں کرنے دیتا تھا۔ ایمان کی محبت مجھے یہ چیز بھولنے پر مجبور کر دیتی تھی لیکن اس کی اپنی یادیں بھی تو بہت زخم دیتی تھیں، دل کو کاٹتی تھیں۔

''راضی! آپ نے واقعی کبھی کسی سے محبت نہیں کی ہے؟'' اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں! غربت نے اتنا ٹائم ہی نہیں دیا جو میں محبت کے لئے بھی تھوڑا وقت نکال سکتا۔'' میں نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

''ہر شخص کی زندگی میں کبھی نہ کبھی محبت کا موڑ آ ہی جاتا ہے، تمہیں بھی کسی دن کسی سے محبت ہو جائے گی۔'' اس نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

میں نے اس کے خوبصورت چہرے کی طرف دیکھا اور دیکھتا ہی چلا گیا۔ شاید خدا میری زندگی میں کچھ اور آزمائش ڈالنے لگا تھا یا شاید میری محبت کی ابھی بھی آزمائش ہو رہی تھی۔ جنت سے آئی ہوئی اس حور نے آہستگی سے میری زندگی میں قدم رکھنے شروع کر دیئے تھے۔

''آپ امریکہ میں کس ریاست میں ہوتی ہیں اور کیا کام کرتی ہیں؟'' میں اس سے تفصیل پوچھنے لگا تو وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور اپنے بارے میں بتانے لگی۔

ایسگارڈ شولزے(ASGARF SCHULZE)امریکہ کی چوتھی بڑی ریاست مونٹانہ (MONTANA) سے تھی۔ یہ امریکہ کی شمال مغربی ریاست ہے۔ جس کا 877 کلومیٹر کا بارڈر کینیڈا سے لگتا ہے۔ 380،800 مربع کلومیٹر رقبے کے ساتھ یہ جرمنی اور ناروے سے بڑی ریاست ہے۔ مونٹانہ

ریاست کی معیشت کا کچھ حصہ زراعت پر بھی مشتمل ہے۔زراعت سے آپ پاکستان کی روایتی کاشت کاری مت سمجھیں۔۔۔ یہ پہاڑی علاقہ ہے اور انتہائی خوبصورت ترین ریاست ہے۔ایسگارڈ مونٹانہ کی رہنے والی تھی۔مونٹانہ سے نیو یارک 3500 کلومیٹر دور ہے۔کار کو مونٹانہ سے نیو یارک پہنچنے میں 31 گھنٹے لگتے ہیں۔ایسگارڈ ڈاکٹر تھی۔اس نے میڈیکل کی تعلیم مکمل کر لی تھی اور مونٹانا ہی کے ایک سرکاری ہسپتال میں سروس کر رہی تھی۔ایسگارڈ کے والد مونٹانہ کے روایتی زمیندار تھے۔ان کی دو ہزار ایکٹر سے زیادہ زمین تھی جہاں گندم اور مکئی کی کاشت کرتے تھے۔

دو ہزار ایکٹر زمین سے شاید آپ لوگ پریشان ہو رہے ہوں۔۔۔امریکہ ایسا ہی ملک ہے۔وہاں آبادی کم اور زمینیں زیادہ ہیں۔تیس لاکھ اسی ہزار مربع کلومیٹر رقبے والی اس ریاست کی آبادی صرف ایک کروڑ ہے۔یعنی رقبے کے لحاظ سے پاکستان سے تقریباً آدھی اس ریاست کی آبادی لاہور شہر سے بھی کم ہے۔

ایسگارڈ ان کی اکلوتی اولاد تھی۔اس کی ماں یونانی نژاد اور امریکی تھی۔وہ سبرینہ کی فیملی کی دور کی رشتہ دار تھی۔ایسگارڈ کو اپنی ماں کی وجہ سے تھوڑی بہت یونانی زبان آتی تھی۔چونکہ مجھے انگلش بھی اچھی خاصی آتی تھی اس لئے میں یونانی کی بجائے اس سے انگلش میں ہی بات کر رہا تھا۔

''چلو اٹھ جاؤ اور آجاؤ! کھانا تیار ہو گیا ہے۔پچھلے ایک گھنٹے سے تمہاری باتیں ہی ختم نہیں ہو رہی ہیں۔'' سبرینہ نے ہمیں حوضی پر بیٹھے ہوئے دیکھا تو ہمیں بلانے کے لئے آ گئی۔کھانا تیار ہو گیا تھا۔

''چلو یار! اب یہ چڑیل آ گئی ہے، یہ اٹھا کر ہی دم لے گی۔'' ایسگارڈ نے مسکراتے ہوئے کہا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

''واقعی! آپ ٹھیک کہتی ہو۔یہ کسی چڑیل سے کم نہیں ہے اور اب تو پولیس میں بھی بھرتی ہو رہی ہے۔ہم جیسے غریب مہاجرین کو روک روک کر ان کے کاغذات چیک کیا کرے گی۔'' میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

''سب سے پہلے آپ کے ہی کاغذات چیک کروں گی اور دو تین گھنٹے تھانے میں بھی رکھوں گی۔زیادہ

نہیں،صرف دو تین گھنٹے۔۔۔اور کھانا بھی کھلا کر بھیجوں گی۔'' سبرینہ نے میرے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

ہم تینوں کمرے میں آ گئے۔شکیل بھائی نے سالن تیار کر دیا تھا۔ہم سب نے اکٹھے ہو کر کھانا کھایا۔ کھانے کے دوران ہلکی پھلکی نوک جھوک ہوتی رہی۔سبرینہ صدام کے ساتھ بیٹھی تھی اور اسے تنگ کر رہی تھی۔وہ اس کی پلیٹ سے بوٹیاں اٹھا اٹھا کر کھا رہی تھی اور صدام اسے پنجابی میں برا بھلا کہہ رہا تھا۔جسے سن کر سبرینہ اور خوش ہوتی اور زیادہ تنگ کرتی۔صدام جب زچ ہو کر اٹھنے لگا تو سبرینہ نے اپنی پلیٹ بھی اس کے آگے رکھ دی۔اس نے جلدی جلدی بوٹیاں اٹھا کر اپنی پلیٹ میں رکھیں اور دوسری طرف منہ کر کے کھانے لگا۔خالی پلیٹ سبرینہ کے آگے پڑی ہوئی تھی اور وہ عجیب نظروں سے ہم سب کی طرف دیکھ رہی تھی۔میں نے شکیل بھائی کو اشارہ کیا تو وہ مزید سالن سبرینہ کی پلیٹ میں ڈالنے لگا۔کھانا کھا کر ہم سب باہر آ گئے۔رات کا اندھیرا پھیل گیا تھا۔

''راضی!تم سے مل کر بہت مزہ آیا۔بہت عجیب لڑکے ہو۔۔۔میری تو ساری تفصیل تم نے معلوم کر لی لیکن اپنے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں بتایا؟لیکن پھر بھی تم سے مل کر خوشی ہوئی۔پتہ نہیں کونسی انجانی کشش ہے تمہارے اندر جو لوگوں کو اپنی طرف کھینچنے لگتی ہے۔'' ایسگارڈ نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''بھائی ہے میرا،کشش کیوں نہیں ہو گی؟'' سبرینہ مجھ سے گلے ملی اور گاڑی میں بیٹھ گئی۔

''اچھا یار!یہ دونوں تو کل اپنے اپنے کاموں پر چلے جائیں گے،میں کل پھر آ جاؤں گی انکل کے ساتھ۔'' ایسگارڈ نے دونوں بازو کھولے تو میں آہستگی سے اس کے گلے لگ گیا۔اس کے جسم سے ہلکی ہلکی خوشبو آ رہی تھی۔انتہائی نرم سا احساس۔۔۔میں جلدی سے الگ ہو گیا۔وہ گاڑی میں بیٹھی اور گھر چلی گئی اور میں واپس کمرے میں آ گیا۔

''کیوں راضی بھائی!کیا کیا باتیں کرتے رہے ہو گوری میم کے ساتھ؟'' وقاص نے مجھے چھیڑتے ہوئے کہا۔میں نے ٹی وی کا ریموٹ پکڑا اور آواز اونچی کر دی۔میں ان کی باتوں سے بچنا چاہتا تھا اس لئے کمرے کے ایک کونے میں جا کر بیٹھ گیا۔وقاص پانچ سات منٹ تک مختلف باتیں کرتا رہا لیکن جب میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ خاموشی سے ٹی وی دیکھنے لگا۔

دوسرے دن صبح صبح پانچ بجے کے قریب اٹھ کر ہم توریاں توڑنے لگے۔ پیاز، شلجم یا ٹماٹر تو ہم رات کو ہی توڑ کر گاڑی میں رکھ دیتے تھے۔ توریاں ہمیشہ تازی ہی توڑی جاتی تھیں۔ ہم صبح 5 بجے اٹھ کر توڑنا شروع کرتے تو نو دس بجے تک گاڑی تیار ہو جاتی تھی۔ مالک نو بجے کے قریب آیا تو تب تک ہم نے گاڑی تیار کر دی تھی۔ اس کے ساتھ ایسگارڈ بھی تھی۔ مالک کی گاڑی روانہ کرنے کے بعد ہم آدھا گھنٹہ آرام کرتے تھے، چائے وغیرہ لیتے تھے اور پھر دوسرے دن کی گاڑی کے لئے پیاز یا ٹماٹر وغیرہ توڑنے لگتے تھے۔

''راضی! تم ایسگارڈ کے ساتھ رہنا آج۔۔۔ باقی کام سے چھٹی، صرف ان توریوں کو پانی لگا دینا اور اسے جھیل وغیرہ بھی دکھا لانا! میں دو بجے تک واپس آ جاؤں گا۔'' مالک نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔ وہ گاڑی لے کر منڈی چلے گئے تو ہم کمرے کی طرف جانے لگے۔

''آ جاؤ ایسگارڈ! چائے وغیرہ پی لو، پھر جھیل کی طرف چلتے ہیں۔''

''آئیٹم سونگ (Item Song) پکوڑے بھی بنا لینا! پانچ منٹ لگیں گے۔۔۔ گوری بچی ہے، خوش ہو جائے گی۔'' میں نے ایسگارڈ کو گھر کی طرف اشارہ کیا اور مدثر کو بولنے لگا۔

مدثر ساہوالہ سے متصلہ گاؤں مان پور کا رہنے والا تھا۔ اس کی مان پور میں پکوڑے اور سموسے کی دکان تھی۔ وہ کھیتوں میں کام تو بہت اچھا کرتا تھا لیکن سبزی دھونے میں اس کی جان نکلتی تھی۔ شام کو ایک ایک کریٹ کر کے دھونے میں ایک گھنٹہ لگ جاتا تھا۔ وہ اس سے جان چھڑانے کے لئے کوئی نہ کوئی ایٹم کرتا رہتا تھا۔ ہم اسے ایک گھنٹہ پہلے چھٹی دے دیتے تھے تو وہ کھانے کے ساتھ ساتھ کوئی نہ کوئی ایٹم (سموسے پکوڑے یا جلیبی) بناتا رہتا تھا۔ اسی وجہ سے اس کا نام ایٹم سونگ پڑھ گیا تھا۔

''جی جی ٹھیک ہے! میں بنا دیتا ہوں۔ پکوڑوں کے لئے تو پانچ منٹ ہی لگتے ہیں۔'' اس نے جلدی سے کہا اور کچن میں گھس گیا۔

''راضی صاحب! کچھ اپنے بارے میں بتاؤ نا یار! ماں باپ، بہن بھائی، کچھ تو بتاؤ نا یار؟'' ہم دونوں ایک بار پھر حوضی کی دیوار پر آ کر بیٹھ گئے تھے۔

''میرے تین بھائی اور ایک بہن ہے۔ ایک بھائی سعودی عرب میں ہوتا ہے۔ چھوٹی بہن کی شادی

ہوگئی ہے جبکہ باقی بھائی ابھی کنوارے ہیں۔ پاکستان میں تھوڑی سی زمین ہے اور بس۔۔۔امریکہ جانے کا جنون ہے اور اسی کے لئے ہی محنت کر رہا ہوں۔کیا میں ایک بار پھر تمہارا پاسپورٹ دیکھ سکتا ہوں؟'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو اس نے مسکراتے ہوئے پاسپورٹ نکالا اور مجھے پکڑا دیا۔

میں ایک بار پھر پاسپورٹ کو دیکھ رہا تھا۔نیلا رنگ سمندر کی طرح۔۔۔جس طرح سمندر کا کوئی کنارہ نہیں ہوتا اسی طرح اس پاسپورٹ کا بھی کوئی کنارہ کوئی حد نہیں تھی۔

''ایسگارڈ! آپ بہت قسمت والے ہو جو امریکہ جیسے ملک میں پیدا ہوئے ہو۔ پتہ ہے کتنے لوگ اس ملک کی مٹی کو صرف ہاتھ لگانے کی کوشش میں مر جاتے ہیں؟'' میں نے دور آسمان میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''تمہارے اس ملک کی چاہت لوگوں کی زندگیاں نگل جاتی ہے لیکن پھر بھی ان کی چاہت کم نہیں ہوتی۔تم بہت خوش قسمت ہو ایسگارڈ! تمہیں سب کچھ ہی بغیر مانگے مل گیا ہے۔'' میں ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

''راضی! کبھی کوئی لڑکی نہیں آئی تمہاری زندگی میں؟ کبھی کسی سے پیار کیا ہو؟ کوئی گرل فرینڈ؟'' اس نے میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

''نہیں ایسگارڈ! غریب لوگ محبت نہیں کرتے ہیں اور پاکستان میں گرل فرینڈ نہیں ہوتی۔اسلامی ملک ہے وہاں شادی سے پہلے ساتھ رہنا گناہ اور جرم سمجھا جاتا ہے۔'' میری آواز ہلکی سے لڑکھڑا رہی تھی۔

''آپ امریکہ کیوں جانا چاہتے ہو؟ سات سال ہوگئے ہیں واپس پاکستان چلے جاؤ؟'' میرا ہاتھ ابھی تک اس کے ہاتھوں میں تھا جسے وہ آہستگی سے سہلا رہی تھی۔نرم ہاتھوں کا لمس عجیب سا نشہ دے رہا تھا۔

''ایک شخص ہے پاکستان میں۔۔۔اس کا خواب تھا امریکہ۔میں اس شخص کے خواب کو پورا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

''جنت میں حوریں بہت ہوتی ہیں۔۔۔'' مجھے ایک بار پھر ایمان کی باتیں یاد آنے لگیں۔

''راضی! تمہاری آنکھیں بہت گہری ہیں، بڑا درد ہے ان آنکھوں میں۔اگر میری کسی مدد کی ضرورت

ہوتو مجھے بتانا! مجھے تمہاری مدد کر کے خوشی ہوگی۔'' اس نے بیگ سے پچاس، پچاس یورو کا ایک بنڈل نکال کر میری طرف بڑھایا۔ یہ 5 ہزار یورو تھے۔ پاکستانی 6 لاکھ روپے کے برابر۔

''ڈاکٹر ایسگارڈ شولزے! آپ نے راضی کو سمجھنے میں غلطی کر دی ہے۔ مدد اور بھیک میں بہت فرق ہوتا ہے۔ آ جاؤ! چائے تیار ہوگئی ہوگی۔'' میں حوضی سے نیچے اترا اور اکیلا ہی کمرے کی طرف جانے لگا۔

''سوری راضی! مجھے سبرینہ نے منع بھی کیا تھا لیکن پھر بھی میں تمہاری مدد کرنا چاہتی تھی۔ سوری یار! مجھ سے غلطی ہوگئی، مجھے معاف کر دو۔'' ایسگارڈ نے جلدی سے نوٹ واپس پرس میں ڈالے اور مجھے ہاتھ سے پکڑ کر روک لیا۔

''سوری یار! واقعی مجھے یہ سب کچھ نہیں کرنا چاہئیے تھا۔'' اس نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگایا تو میں بے اختیار مسکرانے لگا۔

''کوئی بات نہیں! آپ بڑے دل والی ہو جو معافی مانگ رہی ہو، ورنہ تم امریکیوں کو تو سات خون بھی معاف ہیں۔'' میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور کمرے میں آ گیا۔

چائے اور پکوڑے دونوں تیار ہو گئے تھے۔ ایٹم سونگ (مدثر) نے پکوڑوں میں زیادہ مرچ نہیں ڈالی تھی بلکہ صرف مصالحے وغیرہ ڈال کر اسے سپائسی بنایا تھا۔ ہم سب نے مزے لے کر پکوڑے کھائے۔ پکوڑے بہت مزیدار بنے ہوئے تھے۔ ایسگارڈ آئٹم سونگ کی کاریگری کی تعریف کئے بغیر نہ رہ سکی۔ ایک گوری امریکن لڑکی نے اس کی تعریف کی تھی، وہ اتنے میں ہی خوش ہو گیا۔ چائے کے ساتھ پکوڑے کھانے کے بعد لڑکے توٹماٹر توڑنے چلے گئے جبکہ میں ایسگارڈ کے ساتھ موٹر پر آ گیا۔

مالک صبح اپنے ڈالے کی بجائے کار لے کر آیا تھا۔ موٹر ڈیرے سے دس منٹ کے فاصلے پر تھی۔ ایسگارڈ نے پیدل جانے کی بجائے کار پر جانا مناسب سمجھا تو میں اس کے ساتھ کار میں آ گیا۔ موٹر چلانے کے بعد میں نے خراب نکوں کو ٹھیک کیا اور دس پندرہ منٹ تک سب کچھ اوکے کر کے واپس ڈیرے کی طرف جانے لگا۔ میرے کپڑے پانی کی وجہ سے گیلے ہو گئے تھے اس لئے میں نے گاڑی میں بیٹھنے کی بجائے پیدل ہی جانے لگا۔ ڈیرے پر پہنچ کر میں نے جلدی سے کپڑے تبدیل کئے اور ایسگارڈ کے ساتھ کار میں

بیٹھ گیا۔

''یار! تمہیں گاڑی چلانا آتی ہے۔'' اس نے گاڑی شارٹ کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں! مجھے سائیکل کے علاوہ کچھ بھی نہیں آتا۔'' میں نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا واقعی! تمہیں گاڑی چلانا نہیں آتی؟'' اس نے حیرانگی سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

'' جی! اس میں اتنی حیرانگی والی کوئی بات نہیں ہے۔ پاکستان میں زیادہ گاڑیاں نہیں ہوتی ہیں۔ پیٹرول بہت مہنگا ہے۔ میں کیا، یہاں 10 لڑکوں میں کسی کو بھی گاڑی چلانا نہیں آتی ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ میری طرف دیکھنے لگی۔

''ہاں! ابھی تم حیران ہوسکتی ہو۔'' میں نے اس کے سر پر ہلکا سا ہاتھ مارا تو وہ مسکرانے لگی۔

''راضی! گاڑی چلانا سیکھو گے؟'' اس نے اچانک گاڑی روکتے ہوئے کہا۔

یہ کچی سڑک تھی جو ہمارے کھیتوں کے درمیان میں سے جاتی تھی اور یہاں ہمارے علاوہ کوئی بھی گاڑی نہیں آتی تھی۔ سڑک اور کھیتوں کے درمیان کوئی بند وغیرہ نہیں تھا۔ مالک کریٹ اٹھانے کے لئے ڈالا یا ٹریکٹر ٹرالی اندر ہی لے جاتا تھا۔

''کیوں؟ کار چلانا سیکھو گے؟'' اس نے ایک بار پھر مجھ سے پوچھا تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''چلو ٹھیک ہے، ادھر آؤ میری طرف!'' اس نے اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا تو میں کار سے باہر نکل کر دوسرے طرف آ گیا۔

''اچھا، یہ پیروں کے پاس تین پیڈل لگے ہوئے ہیں۔'' وہ بھی کار کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی اور اس نے مجھے نیچے پیروں کی طرف تین پیڈل دکھائے۔

''پہلا ریس کے لئے، دوسرا بریک اور تیسرا کلچ ہے۔ ریس اور بریک کا تو تمہیں پتہ ہے نا؟ کلچ گاڑی کے انجن کو نیوٹرل کر کے اور گیئر لگانے کے کام آتا ہے۔'' اس نے تیسرے پیڈل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اچھا۔۔۔ یہ گیئر ہے۔'' اس نے ایک ہینڈل کی طرف اشارہ کیا۔

''اس کار میں چھ گیئر ہیں۔۔۔ پانچ آگے اور ایک پیچھے کے لئے۔ سب سے پہلے کلچ دباتے ہیں اور پھر گیئر لگاتے ہیں۔ کلچ دبانے کے بغیر گیئر لگانے یا نکالنے کی کوشش کرو گے تو جھٹکا لگے گا اور کلچ پلیٹ ٹوٹ جائے گی۔'' اس نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''اچھا، اب دیکھو! میں گاڑی چلانے لگی ہوں۔ پہلے چابی سے گاڑی سٹارٹ کرنی ہے! کلچ دبا کر پہلا گیئر لگانا ہے۔ ایک پیر ریس پر اور دوسرا پیر کلچ پر۔۔۔ آہستہ آہستہ کلچ چھوڑنا ہے اور ریس دینی ہے، گاڑی چل پڑے گی۔'' اس نے کار کا دروازہ کھولا ہوا تھا اور آہستہ آہستہ مجھے بتاتے ہوئے گاڑی چلانے لگی۔ میں کار کے دروازے کو پکڑ کر آہستہ آہستہ ساتھ چل رہا تھا۔

''جتنے آرام سے کلچ چھوڑو گے اتنی آرام سے گاڑی چلے گی، ورنہ جھٹک سے بند ہو جائے گی۔ ابھی تم ادھر بیٹھو! میں تمہیں گیئر لگانا سکھاتی ہوں۔'' اس نے کار بند کی اور باہر آ گئی۔

میں اس کی جگہ پر اندر جا کر بیٹھ گیا۔ اس نے میرے پاؤں سیدھے کر کے بریک اور کلچ پر رکھوائے۔ وہ نیچے زمین پر بیٹھ گئی تھی اور میرا پاؤں پکڑ کر بریک اور ریس پر بار بار بدل کر رکھ رہی تھی۔ شروع شروع میں میں ان دونوں میں کوئی فرق محسوس نہیں کرتا تھا۔ اس سے پاؤں ہٹا کر دوبارہ ریس پر رکھ دیتا تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ مجھے پاؤں تبدیل کرنے میں مہارت ہو گئی تو وہ اٹھ کر دوسری سائیڈ پر جا کر بیٹھ گئی۔

''چلو اب کلچ دباؤ! میں گیئر لگانا سکھاتی ہوں۔'' اس نے کلچ دبایا اور گیئر پر ہاتھ رکھ لیا۔ اس نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا اور اسے مضبوطی سے پکڑ لیا۔

''راضی صاحب! کچھ غلط تو نہیں سوچ رہے ہو؟'' میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگی۔ مجھے واقعی اس کا ایسے اپنے ہاتھ پر ہاتھ رکھنا عجیب لگا تھا۔

''مجھے تم اچھے تو بہت لگتے ہو، تم سے دوستی کرنے کو دل بھی بہت کرتا ہے لیکن مجھے تھوڑا وقت چاہیئے۔ لڑکیاں اتنی جلدی کسی سے متاثر نہیں ہوتی ہیں۔ بے فکر رہو! میں صرف تمہیں سکھا رہی ہوں۔'' اس کی آنکھوں میں شرارت مچل رہی تھی۔ میں اس کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا۔

''اچھا، کلچ دبایا ہوا ہے نا؟'' اس نے بات بدلتے ہوئے کہا تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اچھا، یہ پہلا گیئر ہے۔'' اس نے میرے ہاتھ کو حرکت دے کر پہلا گیئر لگایا۔ میرا ہاتھ اس کے ہاتھ کے نیچے تھا۔ اب مجھے اس کا ہاتھ پکڑنے کی سمجھ آئی۔

''یہ دوسرا ہے اور یہ تیسرا۔۔۔'' وہ گیر بدل بدل کر مجھے سمجھاتی رہی۔

آہستہ آہستہ میں اسے بھی سمجھ گیا تو اس نے ہاتھ ہٹا لیا اور میں بغیر اس کی مدد کے مختلف گیئر لگانے لگا۔ تقریباً 40 منٹ کی مسلسل محنت کے بعد میں کار کے سارے سسٹم کو مکمل طور پر سمجھ اور سیکھ گیا تھا۔ اب پریکٹیکل کا ٹائم تھا۔ میں نے چابی کی مدد سے گاڑی سٹارٹ کی تو میرا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ ایسگارڈ نے ہاتھ بڑھا کر گاڑی کو آف کر دیا۔

''راضی! دیکھو، ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ پہلے گیئر میں گاڑی جہاز نہیں بن جاتی ہے۔ آپ فل ریس بھی دے دو گے تو تب بھی ایک سائیکل سے زیادہ رفتار نہیں ہوگی۔ یہ کوئی مین روڈ نہیں ہے۔ گاڑی زیادہ سے زیادہ کسی کھیت میں چلی جائے گی۔ میں ہینڈ بریک کھینچوں گی تو ایک جھٹکے میں گاڑی بند ہو جائے گی اور بس اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہوگا۔'' اس نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا تو میں نے دوبارہ گاڑی سٹارٹ کر لی۔

اس بار میں کانپ نہیں رہا تھا۔ پہلی دو کوششوں میں گاڑی جھٹکے سے بند ہو گئی کیونکہ میں کلچ جلدی چھوڑ دیتا تھا۔ تیسری کوشش میں گاڑی چلنے لگی اور میں آہستہ آہستہ گاڑی چلانے لگا۔ سٹیئرنگ کا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا ہے۔ زیادہ پرابلم صرف کلچ اور گیئر کی ہی ہوتی ہے۔

''چلو اب بند کر کے دوبارہ سٹارٹ کرو!'' دو منٹ تک مسلسل گاڑی چلانے کے بعد ایسگارڈ نے مجھے گاڑی بند کرنے اور پھر سٹارٹ کرنے کا کہا۔

میں نے گاڑی کو بریک لگائی اور بند کر کے دوبارہ چلا لی۔ اس بار پہلی ہی کوشش میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے پانچ چھ بار مجھ سے گاڑی بند کروا کر دوبارہ سٹارٹ کروائی اور پھر گیئر بدلوانے لگی۔ اس بار صرف آدھے گھنٹے میں ہی میں گاڑی کو روانی کے ساتھ چلانے لگا۔ اس نے مجھے گاڑی بیک کرنا اور سڑک کے ایک

کنارے پر گاڑی چلانا سیکھایا اور پھر ڈیرے پر آ کر مجھے گاڑی روکنے کا کہا۔ میں نے کار روکی تو وہ کار کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

''چلو راضی صاحب! ایک چکر اب تم اکیلے موٹر کا لگا کر آؤ۔'' موٹر ڈیرے سے صرف 5 کھیت دور تھی۔ میں نے اکیلے ہی کار کو ریسورس کیا اور موٹر کا ایک چکر لگا کر واپس آ گیا۔ وہ آیو تیکی (شیڈ) کے سامنے کھڑی تھی۔ میں نے کار اس کے سامنے جا کر روکی اور بند کر کے باہر آ گیا۔

''ارے ارے! باہر کیوں آ گئے ہو؟ تھوڑی مزید پریکٹس کرو۔ شام کو انکل کے آنے سے پہلے پہلے تم اچھی طرح کار چلانا سیکھ لوگے۔'' اس نے مجھے واپس کار میں بیٹھنے کا کہا اور خود بھی میرے ساتھ بیٹھ گئی۔ دوپہر دو بجے تک میں کچے راستوں پر کار دوڑاتا رہا۔ اس دوران میں نے چار گاڑیوں کو راستہ بھی دیا۔ مالک کے آنے کا ٹائم ہو گیا تھا۔

''چلو گاؤں کی طرف ایک چکر لگا کر آتے ہیں۔'' اس نے مجھے پکی سڑک پر جانے کے لئے کہا۔

ڈیرے سے گاؤں موریکی (Mouriki) کی طرف جانے والی سڑک پر زیادہ رش تو نہیں ہوتا تھا لیکن پھر بھی پکی سڑک تھی اور سڑک پر گاڑیاں اور ٹریکٹر چلتے رہتے تھے۔

''کوئی بات نہیں ہے راضی! آخر کبھی نہ کبھی تو سڑک پر آنا ہے نا؟ تو اب کیوں نہیں۔ چلو! کچھ نہیں ہو گا۔ ڈرنا مت اور آرام سے چلانا، میں تمہارے ساتھ ہوں۔'' میں نے کار کا رخ سڑک کی طرف کیا اور پکی سڑک پر آ گیا۔

میں آہستہ آہستہ کار کو گاؤں کی طرف ڈرائیو کرنے لگا۔ میں سڑک کے بالکل کنارے پر کار چلا رہا تھا۔ گاڑیاں ایک ایک کر کے مجھے کراس کر رہی تھیں۔ دس منٹ کا تو سفر تھا، میں گاؤں پہنچ گیا۔ اس نے مجھے گاؤں کے اکلوتے پٹرول پمپ پر کار کھڑی کرنے کو کہا تو میں کار کو پٹرول پمپ پر لے گیا۔ میں نے کار کو آف کیا تو وہ کار میں پٹرول بھروانے لگی۔ سارا دن کار کو کھیتوں کی کچی سڑکوں پر چلاتے ہوئے ہم نے پٹرول ختم کر دیا تھا۔ اس نے ٹنکی فل کروائی اور اندر سے پٹرول کے پیسے دیتے ہوئے کچھ کھانے کے لئے بھی لے آئی۔

''لو راضی کھاؤ! آج سے تم ڈرائیور بن گئے ہو۔'' اس نے ایک برگر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ میں نے کار کو بیک کر کے واپس سڑک کے ایک کنارے پر کھڑی کر دی تھی۔

''ایسگارڈ! آپ بہت اچھی ہو، آپ بہت اچھی ڈاکٹر بنو گی۔ پیٹرول کے کتنے پیسے آپ نے ادا کیے ہیں؟ وہ میں آپ کو دوں گا۔'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یار! بڑے بدتمیز ہو۔۔۔آپ تو دوستی کا مطلب ہی نہیں سمجھتے ہو۔'' اس نے اچھا خاصہ غصہ کھاتے ہوئے کہا۔

''نہیں! میرا وہ مطلب تو نہیں تھا۔ اصل میں وہ۔۔۔آپ سارا دن میرے ساتھ تھیں۔'' مجھ سے اب کوئی بات بن نہیں رہی تھی۔ میں نے واقعی پیسے بول کر اسے ناراض کر دیا تھا۔

''راضی صاحب! دوستی کی بھی کچھ ویلیو ہوتی ہے۔ ہر چیز کو پیسوں سے مت تولا کرو۔ دو ہزار ایکڑ زمین کی اکلوتی وارث ہوں۔ یہ جو تمہارے مالک کے ڈیرے پر چھوٹی چھوٹی مشینری اور ٹریکٹر کھڑے ہیں نا۔۔۔یہ سب بیچ کر بھی ہماری ایک سال کی آمدن سے زیادہ پیسہ نہیں اکٹھا کر سکتے۔ تم نے پیسوں کی بات کر کے میری توہین کی ہے۔''

''سوری یار! مجھے واقعی پیسوں کی بات نہیں کرنی چاہیئے تھی۔'' اس بار میں نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا تو اسے کل والی بات یاد آ گئی۔ کل اس نے بھی ایسے ہی کانوں کو ہاتھ لگا کر معافی مانگی تھی۔

''چلو! حساب برابر ہو گیا۔'' اس نے آگے بڑھ کر مجھے گلے سے لگا لیا۔ انتہائی نرم سا احساس اور ہلکی ہلکی میٹھی خوشبو ایک بار پھر مجھے مدہوش کرنے لگی۔

''راضی! جنت میں حوریں بہت ہوتی ہیں۔'' میں جلدی سے اس سے الگ ہوا اور ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

''کیوں۔۔۔کیا ہوا یار؟ پیچھے کیوں ہٹ رہے ہو؟'' وہ ایک بار پھر آگے بڑھی اور دوبارا میرے گلے لگ گئی۔

انتہائی نرم و ملائم اور خوبصورت سا جسم مجھ سے لپٹا ہوا تھا۔ امریکی حور مجھ سے لپٹی ہوئی تھی اور اس کے جسم کا انگ انگ مجھے اپنی خوبصورتی کا احساس دلا رہا تھا۔ میں ایک بار پھر اس کے جسم کی خوشبو سے مدہوش ہو رہا تھا۔ جنت سے آئی ہوئی وہ حور مجھے اپنے سحر میں لے رہی تھی۔ اس کا سحر مجھے جلانے لگا تو میں نے ہلکا سا دھکا دے کر اسے خود سے الگ کر دیا۔

''راضی! کیا بات ہے؟ تم مجھے پسند نہیں کرتے ہو؟'' ہلکا سا دھکا لگنے کی وجہ سے وہ کنفیوز ہو گئی تھی۔

''راضی یار! میں تمہیں پسند کرنے لگی ہوں۔۔۔تم سے دوستی کرنا چاہتی ہوں۔'' اس نے ہاتھ بڑھا کر میری گالوں کو چھونا چاہا تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''ایسگارڈ! تم بہت اچھی ہو، بہت خوبصورت ہو لیکن میں شادی شدہ ہوں۔ میری شادی ہو چکی ہے۔ پاکستان میں میری ایک بیوی ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

میں ایمان سے جتنی محبت کرتا تھا اس کے آگے ساری دنیا کی خوبصورتی بے معنی تھی۔ مجھے جنت سے آئی ہوئی حوریں نہیں صرف دنیا میں رہنے والی ایمان چاہیئے تھی۔ میں نے اپنا شادی شدہ ہونے کا جھوٹ اسی لئے بولا تھا تاکہ وہ راستے سے ہٹ جائے۔ ایسگارڈ بہت خوبصورت تھی لیکن میں اس کے لئے نہیں تھا، بلکہ میں کسی کے لئے بھی نہیں تھا۔

''کیا تم شادی شدہ ہو؟ کل جب میں نے تم سے پوچھا تھا تو تب کیوں نہیں بتایا تھا؟'' اس نے غصے سے بولتے ہوئے کہا۔

''ویسے ہی۔۔۔میں نے مناسب نہیں سمجھا تھا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا اور واپس کار میں آ کر بیٹھ گیا۔ وہ کافی دیر تک کار کے باہر کھڑی رہی اور پھر اندر آ کر بیٹھ گئی۔

''سوری یار! میں تھوڑا بہک گئی تھی۔ تم پاکستانی لوگ واقعی بہت جلدی شادیاں کر لیتے ہو۔ بچے بھی ہیں تمہارے؟'' اس نے کار سٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ اس بار وہ کار چلا رہی تھی اور میں دوسری سائیڈ پر بیٹھ گیا تھا۔

''نہیں! ابھی کوئی اولاد نہیں ہے ہماری۔'' میں نے کار کے شیشے سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

لڑکے کام سے واپس آ گئے تھے۔ مالک بھی سبزی منڈی سے واپس آ گیا تھا اور ہمارا ہی انتظار کر رہا تھا۔اس نے واپس گھر جانا تھا اور کار ہمارے پاس تھی۔ایسگارڈ نے کار اس کے پاس جا کر روکی، میں کار سے نیچے اترا تو مالک بیٹھ گیا۔اس نے مجھے دو کھیتوں میں باری باری پانی لگانے کا کہا اور ایسگارڈ کے ساتھ تھیوا چلا گیا۔میں آہستہ آہستہ کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔

لڑکے کھانا کھا کر اب سی ڈی پر گانے سن رہے تھے۔میں نے کچن میں جا کر اپنے لئے ایک پلیٹ میں سالن نکالا اور روٹی کے چھوٹے چھوٹے نوالوں کے ساتھ کھانے لگا۔

''کیوں یار! آج سارا دن بچی کے ساتھ کدھر کدھر سیریں کر رہا تھا؟'' وقاص نے پیچھے سے مجھے پکارتے ہوئے کہا۔

''نہیں یار! کہیں بھی نہیں گیا تھا، ادھر ہی گھوم رہے تھے۔ پتہ ہے نا امریکی ہے؟ اسے کھیت دیکھنے کا بہت شوق تھا۔'' میں نے بہانہ گھڑتے ہوئے کہا۔

''اچھا! سبرینہ نے تو بتایا تھا اس کا والد امریکہ میں یہی زمیندارے کا ہی کام کرتا ہے تو پھر اس ڈاکٹر کو کھیتوں سے کیسے دلچسپی ہوگئی۔'' اس نے میرے کندھے پر زور سے تھپڑ مارتے ہوئے کہا۔

''راضی صاحب! بات کو گھما کیوں رہے ہو؟ معاملہ کچھ اور ہے۔ بچی پھنسنے کی کوشش کر رہی ہے۔'' اس نے آنکھ مارتے ہوئے کہا تو مجھے غصہ آ گیا۔

''کاشی یار! بکواس مت کیا کرو۔ وہ ڈاکٹر ہے بچی نہیں ہے،عورت کی عزت کرنا سیکھو۔تمہارے اور میرے لیول سے بہت اوپر ہے۔ ہمارے پچھلی سات نسلوں میں بھی کوئی ڈاکٹر نہیں ہوگا۔ ہماری اوقات تو اس سے ہاتھ ملانے کی بھی نہیں ہے اور تم پھنسنے کی بات کر رہے ہو۔'' میں نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''یار! میں نے تو ایسے ہی بات کی ہے۔تم تو غصہ ہی دکھانے لگے ہو۔'' وہ ناراض ہو کر واپس چلا گیا تو میں ایک بار پھر کھانا کھانے میں مصروف ہو گیا۔

کھانا کھانے کے بعد میں بکریوں کی طرف چلا گیا۔ان کا چارہ وغیرہ دیکھ کر میں نے تھوڑی سی صفائی کی اور پھر نہانے کے لئے چلا گیا۔ میں واش روم کا فوارہ کھول کر ٹھنڈے پانی سے نہا رہا تھا۔آج میں نے

گاڑی چلانا سیکھ لیا تھا۔ ایسگارڈ بہت اچھی تھی ۔ یورپ میں پیار محبت کچھ نہیں ہوتا، یہاں لوگ اگر پسند آجاتے ہیں تو ایک ساتھ رہنا شروع ہوجاتے ہیں۔ ماں باپ کا کوئی ڈر نہیں ہوتا۔ 18 سال کے بعد اولاد اپنے فیصلوں کی خود مالک ہوتی ہے اور وہ ماں باپ کا گھر چھوڑ کر اپنے بوائے فرینڈ یا گرل فرینڈ کے ساتھ رہنا شروع ہوجاتے ہیں۔ اگر چار پانچ سال تک تعلق چل جائے تو پھر شادی کر لیتے ہیں۔

مجھے نہیں معلوم ایسگارڈ ہمدردی دکھا رہی تھی یا دوستی لگانا چاہتی تھی۔ ویسے بھی وہ زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے کی چھٹی پر یہاں آئی ہوئی تھی۔ اس کے بعد وہ واپس امریکہ چلی جاتی۔ میں ایمان کے علاوہ اور کسی کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ میں نے نہا کر کپڑے تبدیل کئے اور باہر آ گیا۔ ایسگارڈ پھر واپس آ گئی تھی۔ اس نے مالک کو گھر چھوڑا اور سبرینہ کو لے کر آ گئی تھی۔ کوستا ابھی تک جیل سے واپس نہیں آیا تھا۔ اس کی ڈیوٹی 4 بجے ختم ہوتی تھی اور وہ پانچ بجے کے قریب واپس گھر پہنچتا تھا۔ سبرینہ اور ایسگارڈ وقاص اور شکیل کو لے کر حوضی کے کنارے کھڑی تھیں۔ وہ ان سے باتیں کر رہی تھیں۔ میں بھی چلتا ہوا ان کے قریب پہنچ گیا۔

''کالی میرا سبرینہ! کیسی ہو؟'' میں نے یونانی میں اسے سلام کرتے ہوئے کہا۔

کالی میرا (KALI MERA) راضی! اور مجھ سے بات کرنے کی کوشش مت کرو۔ میں تم سے ناراض ہوں۔ میں نے تم کو اپنا بھائی بولا تھا اور تم نے میری مہمان کی بے عزتی کی ہے۔'' سبرینہ نے مجھ سے منہ پھیر لیا۔

''یار سبرینہ! تمہاری مہمان ہماری مہمان ہے۔ اگر اس کو میری کوئی بات بری لگی ہے تو میں معذرت کر لیتا ہوں؟'' میں نے ایسگارڈ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ سبرینہ بھی ایسگارڈ کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ بلکہ شکیل بھائی اور وقاص بھی اس کی طرف ہی دیکھ رہے تھے۔ اتنی ساری آنکھوں کو اپنے اوپر مسلط ہوتے دیکھا تو وہ نروس ہوگئی۔

''آپ کی شادی کب ہوئی تھی؟'' ایسگارڈ نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''2006ء میں۔۔۔جب میں پاکستان میں تھا۔'' میں نے اس سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

''موبائل ہے تمہارے پاس؟'' سبرینہ نے میری طرف ہاتھ بڑھایا تو میں نے موبائل نکال کر اسے

پکڑا دیا۔ موبائل کی پوری کال ہسٹری میں ایک بھی کال پاکستان کے لئے نہیں تھی۔ میں پاکستان کبھی بھی کال نہیں کرتا تھا۔ بلکہ اگر پاکستان سے کوئی کال آ بھی جائے تو تب بھی میں اٹینڈ ہی نہیں کرتا تھا۔

''ادھر آؤ اور مجھے دکھاؤ کہ کونسی بیوی ہے تمہاری اور کتنے فون کرتے ہو اس کو؟'' سبرینہ نے میری آنکھوں کے سامنے موبائل لہراتے ہوئے کہا۔

''یہ شکیل اور وقاص، ان دونوں کی ہر تیسرے دن تمہارے گھر بات ہوتی ہے۔ تمہاری اور تمہارے گھر والوں کی پوری ہسٹری کا انہیں پتہ ہے۔ کوئی شادی نہیں ہوئی ہے تمہاری! ایک لڑکی سے محبت کرتے تھے جو تمہیں چھوڑ کر کراچی بھاگ گئی ہے اور تم بھی گھر سے بھاگ کر آئے ہو امریکہ جانے کے لئے۔۔۔ یہی کچھ ہے یا کچھ اور بھی ہے تمہارے پاس جھوٹ سنانے کے لئے؟'' سبرینہ نے قدرے اونچی آواز میں کہا۔

میرے والد ہر دوسرے تیسرے دن ڈیرے پر فون کرتے رہتے تھے۔ وہ باقی لڑکوں سے میری خیریت دریافت کرتے رہتے تھے۔ ان دونوں کو میرے ماضی کا پتہ تھا۔ سبرینہ اور ایسگارڈ نے سب سے پہلے انہی سے میرے بارے میں پوچھا تھا اور ان دونوں نے سب کچھ بتا دیا تھا۔

''کیوں راضی! جھوٹ کیوں بولا تھا مجھ سے؟ سیدھا میرے منہ پر بول دیتے۔ آج صبح جتنی عزت تمہاری میرے دل میں تھی وہ سب ختم ہوگئی ہے۔ انسان میں اتنی طاقت ہونی چاہیے کہ وہ ہر بات اگلے کے منہ پر کر سکے۔'' ایسگارڈ نے مجھے بازو سے پکڑتے ہوئے کہا۔ میں خاموشی سے کھڑا رہا۔ میرے پاس اپنی صفائی دینے کے لئے الفاظ موجود نہیں تھے۔

''راضی بھائی! یورپ میں محبتیں نہیں ہوتیں، ہم لوگ کسی سے محبت نہیں کرتے ہیں لیکن عزت ضرور کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے احساسات کی قدر بھی کرتے ہیں۔'' اس نے ایسگارڈ کا ہاتھ پکڑا اور اسے لے کر چلی گئی۔ میں ان دونوں کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

میں ان کو روکنا نہیں چاہتا تھا۔ ایسگارڈ چار پانچ دن کے لیے ہی آئی ہوئی تھی۔ وہ چلی جاتی تو پھر میں سبرینہ کو منا لیتا۔ میں ایسگارڈ کو کسی بھی قسم کا مثبت ردعمل نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ جتنا مجھ سے دور رہتی اتنا ہی اس

کے اور میرے لیے اچھا تھا۔

''یار کیا بات ہے؟ وہ تم سے ناراض کیوں ہو رہی ہیں؟'' ان کے جانے کے بعد شکیل بھائی مجھ سے پوچھنے لگے۔

''کوئی بات نہیں شکیل بھائی! بس کچھ غلط فہمی ہو گئی تھی۔ آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گی۔'' میں نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''یار! کہیں ڈاکٹر کو چھیڑنے کی کوشش تو نہیں کر دی تھی؟ پاکستانی ہیں بچی دیکھ کر کہاں رہا جاتا ہے ہم سے؟'' وقاص نے شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا تو میں اسے پکڑنے لگا لیکن وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ میں اس کے پیچھے بھاگنے کی بجائے کمرے کی طرف جانے لگا۔

''آجاؤ آنا تو کمرے میں ہی ہے نا! تم دن بدن خراب ہی ہوتے جا رہے ہو۔'' میں نے اسے للکارتے ہوئے کہا۔

''اچھا! دیکھ لو ہم دو بھائی ہیں، مار کھا جاؤ گے ہم سے پنگا لے کر؟'' اس نے اپنے بھائی صدام کی دھمکی دیتے ہوئے کہا۔

''صدام بھی میرے ساتھ ہے۔ ہم دونوں مل کر ماریں گے تم کو!'' میں مسکراتے ہوئے کمرے میں چلا گیا۔

حالات کے ستم سہتے سہتے اب میں اتنا مضبوط ہو گیا تھا کہ مجھے یہ چھوٹے موٹے مسائل اب تنگ نہیں کرتے تھے۔ میں کمرے میں آ کر بیٹھ گیا۔ سی ڈی پر نشتر گل کے غمگین گانے لگے ہوئے تھے۔ میں نے دیوار کے ساتھ ٹیک لگائی اور آنکھیں بند کر لیں۔ ذہن کو سکون مل رہا تھا اور میں آہستہ آہستہ سونے لگا۔ میری آنکھ پھر شام کو سات بجے کے قریب ہی جا کر کھلی۔ ایسگارڈ ایک بار پھر کوستا اور سبرینہ کے ساتھ آ گئی تھی۔ کوستا کو چھٹی ہو گئی تھی اور وہ سب ایک بار پھر کمرے میں آ کر بیٹھ گئے۔ شکیل بھائی کچن میں چلے گئے تھے اور ایسگارڈ وقاص کے ساتھ بیٹھ گئی۔ وقاص اسے چند مشہور پنجابی لطیفوں کو یونانی میں ٹرانسلیٹ کر کے سنا رہا تھا۔

میں نے ان سب سے ہاتھ ملایا اور باہر آ کر ٹونٹی سے منہ دھونے لگا۔ منہ دھونے کے بعد کچن میں چلا گیا جہاں شکیل بھائی کے ساتھ ایٹم سونگ (مدثر) بھی لگا ہوا تھا۔ اس کا پروگرام آج جلیبیاں نکالنے کا تھا۔ میں بھی کچن میں شکیل بھائی کی مدد کرنے لگا۔ میرا کمرے میں جانے کو دل نہیں کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی صدام مجھے بلانے کے لئے آ گیا تو میں نہ چاہتے ہوئے بھی اندر چلا گیا۔

''کیا بات ہے راضی صاحب! آج تو سارا گھر ہی ایک دوسرے سے ناراض ناراض لگ رہا ہے؟'' کوستے نے مجھے اپنے پاس بٹھاتے ہوئے کہا۔

''نہیں یار! تھوڑی سی مس انڈرسٹینڈنگ ہوگئی ہے۔ میں نے سوری بھی کیا ہے ان دونوں سے۔۔۔ اب آپ بھی سفارش کرو گے تو یہ راضی ہو جائیں گی۔'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''او یار! راضی ہونے کے لیے ہی تو یہاں پر آئے ہیں۔ تم سے کوئی بھی زیادہ دیر تک ناراض نہیں رہ سکتا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ میں خاموشی سے ان لوگوں کی طرف دیکھنے لگا۔

''راضی بھائی!'' سبرینہ نے میرے پاس آ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''میں ٹھیک ہوں۔'' میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا اور پیار سے اسے سہلانے لگا۔

ایسگارڈا ابھی تک وقاص سے باتیں کر رہی تھی۔ اس نے مجھے مکمل طور پر نظرانداز کر دیا تھا۔ میں بھی آہستہ آہستہ سبرینہ سے باتیں کرنے لگا۔ میں اس سے اس کی پولیس اکیڈمی کی باتیں کرنے لگا اور وہ مجھے اپنی اکیڈمی میں گزرنے والے دلچسپ واقعات سنانے لگی۔ کھانا تیار ہو گیا تو ہم سب نے مل کر کھانا کھایا اور اس کے بعد جلیبیاں کھانے لگے۔ رات تک اچھی خاصی پارٹی کرنے کے بعد وہ اپنے گھر چلے گئے۔ ہم نے صبح 5 بجے توریاں توڑنے کے لئے اٹھنا تھا اس لئے جلدی جلدی اپنے کمروں میں جا کر سونے لگے۔

اگلا دن جمعرات کا تھا۔ ایتھنز کی سبزی منڈی جمعہ اور ہفتہ دو دن بند رہتی تھی۔ جمعرات کو ہم صرف 10 بجے تک کام کرتے تھے۔ گاڑی کے چلے جانے کے بعد ہمیں چھٹی ہوتی تھی اور دوسرے دن جمعہ کو بھی چھٹی ہوتی تھی۔ ہفتے کو ہم پیاز اور ٹماٹر وغیرہ توڑتے اور اتوار کو پھر صبح صبح توریاں توڑ کر گاڑی تیار کر دیتے تھے۔ توریاں توڑ کر چونکہ چھٹی ہو جانی تھی اس لیے ہم جلدی جلدی کام ختم کرنے لگے۔ نو بجے کے

قریب مالک آیا تو تب تک ہماری توری توڑنے والی صرف دو لائنیں رہ گئیں تھیں۔ہم جلدی جلدی ہاتھ مارنے لگے۔ایسگارڈ پھر آ گئی تھی۔

''راضی!'' مالک نے مجھے آواز دی تو میں نے توریاں توڑنے والی بالٹی وقاص کو پکڑائی اور مالک کی بات سننے کے لئے کھیت کے کنارے کی طرف جانے لگا۔

''جی فندیکو! کیا حکم ہے۔'' میں نے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''راضی! تم نے کل ایسگارڈ سے ڈرائیونگ سیکھی ہے؟'' مالک مجھ سے پوچھنے لگا۔

''جی! کل یہ مجھے سکھاتی رہی ہیں۔'' میں نے ایسگارڈ کی طرف دیکھنے سے گریز کیا۔

''اچھا! واقعی؟ ابھی چلا کر دکھاؤ گے؟'' اس نے کار کی چابی میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ میں نے ان کے ہاتھ سے چابی لی اور گاڑی کے اندر بیٹھ کر سٹارٹ کیا۔ ایسگارڈ دوسری طرف کھڑی تھی۔ وہ دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔

''راضی صاحب! امریکہ والے ہیں، اتنی جلدی جان نہیں چھوڑتے ہیں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے میری طرف ہاتھ بڑھایا تو میں اس سے ہاتھ ملانے لگا۔گاڑی میں پہلے ہی سٹارٹ کر چکا تھا۔میں نے اس کو گیئر میں ڈالا اور اسے ڈیرے کی طرف موڑنے لگا۔ میں نے ایسگارڈ کو لے کر ایک چکر ڈیرے کا لگایا اور پھر واپس آ کر کار بند کر کے باہر نکل آیا۔

''واہ! کیا بات ہے یار۔۔۔تم نے تو واقعی کمال کر دیا ہے۔ابھی ٹریکٹر چلانا بھی سیکھو تو پھر تمہیں بھی آسانی ہو جائے گی۔میرے لئے تم پانی وغیرہ لگانے کے لئے ٹریکٹر پر ہی جایا کرو اور سبزی کے کریٹ بھی کھیت سے اٹھا لایا کرو گے۔''

اس سے پہلے چونکہ ہم میں سے کسی کو بھی ٹریکٹر چلانا نہیں آتا تھا اس لئے ہم سبزی وغیرہ توڑ کر ادھر کھیتوں میں ہی کریٹ رکھ دیتے تھے۔مالک شام کو آتا تھا تو دو لڑکوں کو ساتھ کر وہاں سے کریٹ ٹریکٹر پر لوڈ کر کے لے آتا تھا اور ادھر ہم ان کو دھونے کے بعد سبزی ایئر کنڈیشنڈ گاڑی میں لگا دیتے تھے۔ مالک کو دن میں کئی چکر لگانے پڑتے تھے۔اگر میں ٹریکٹر سیکھ لیتا تو پھر اسے ڈیرے پر آنے کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ وہ

صرف صبح سبزی لینے کے لئے آتا۔ پانی وغیرہ میں فون پر ہی پوچھ کر لگا سکتا تھا۔ اسے صرف فصل بیچنے اور سیر کرنے کے لئے ہی آنا پڑتا۔

''زبردست ہو گیا۔۔۔ یار! کل چھٹی ہے لیکن میں آ جاؤں گا۔ تمہیں ٹریکٹر چلانا بھی سکھا دوں گا۔ میری بھی بار بار ڈیرے پر آنے سے جان چھوٹ جائے گی۔ بوڑھا ہو گیا ہوں یار! اب مجھ سے زیادہ محنت نہیں ہوتی ہے۔'' مالک مجھے کار چلاتے ہوئے دیکھ کر خوش ہو گیا۔

''انکل! ٹریکٹر تو میں بھی اسے سکھا سکتی ہوں۔ اگر آپ کہتے ہو تو شام تک یہ بہترین ڈرائیور بن چکا ہو گا۔'' ایسگارڈ نے جلدی سے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

''تمہیں ٹریکٹر چلانا آتا ہے؟'' مالک نے حیرانگی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ میں بھی اس کی بات سن کر حیران ہو گیا تھا۔ کار تو یورپ میں عام بات ہے۔ یہاں مرد اور عورت دونوں موٹر سائیکل اور کار چلاتے ہیں۔ یہ بالکل نارمل بات تھی لیکن ایک عورت کا ٹریکٹر چلانا یہ نئی بات تھی اور ویسے بھی وہ ڈاکٹر تھی۔

''جی انکل! ہم بھی خاندانی زمیندار ہیں۔ میرا سارا بچپن کھیتوں میں ہی بھاگتے دوڑتے گزرا ہے۔ مجھے ساری مشینری چلانا آتی ہے۔'' ایسگارڈ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''چلو یہ بھی اچھا ہے۔ تم نے کل اسے کار چلانا سکھائی تھی تو آج ٹریکٹر چلانا بھی سکھا دو!'' میرے مالک نے ایسگارڈ کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا اور پھر کھیت سے سبزی اکٹھی کرنے لگا۔

آدھے گھنٹے تک ہم نے کھیت سے سبزی اٹھا کر ٹرالی میں رکھی تو مالک نے اسے کھیت سے باہر نکالا اور ہم اسے ٹرک میں لوڈ کرنے لگے۔ یورپ میں ٹرک کی بجائے آٹھ وہیلر گاڑی ہوتی ہے۔ سبزی کے لئے زیادہ تر یہی گاڑی استعمال ہوتی ہے۔ شہر کے اندر یا بڑی سڑک پر ٹریکٹر ٹرالی کا داخلہ منع ہے۔ شہر یا بڑی سڑک پر خالی ٹریکٹر تو آپ چلا سکتے ہو لیکن لوڈ ڈ ٹرالی کے ساتھ نہیں چلا سکتے۔ سبزی یا کوئی بھی سامان ٹرانسفر کرنے کے لئے بڑی بند گاڑیوں کو ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ کھلی گاڑی کو بھی ترپال لگا کر بند کیا جاتا ہے۔ یہ چھوٹے ڈالے ہوتے ہیں جن میں پچاس ساٹھ کریٹ آتے ہیں۔ یہاں بھی اگر ایک انچ بھی کریٹ ڈالے کی باڈی سے باہر ہو تو پولیس والے وہیں ڈالے کو روک کر چالان کر دیتے ہیں۔ یورپ اپنے انہی قوانین

سے ہی ترقی کر رہا ہے۔ ہم نے مالک کو گاڑی لوڈ کر کے دی دے تو وہ ایسگارڈ کو ٹریکٹر کی بنیادی باتیں سمجھا کر چلے گئے۔

''کالی میرا ایسگارڈ!'' وقاص جلدی سے ایسگارڈ کے پاس چلا گیا۔

کل شام کو ایسگارڈ اس کے ساتھ ہی گپ شپ لگاتی رہی تھی۔ اس بار بھی وہ یہی سمجھا تھا کہ شاید ایسگارڈ ابھی بھی اس کے ساتھ رہے گی۔ وہ لڑکی تھی اور اس کی پاس امریکن پاسپورٹ بھی تھا۔ کچھ لوگ تو ویسے ہی لڑکی دیکھ کر پاگل ہو جاتے ہیں اور وہ تو پھر امریکن لڑکی تھی۔ میں پیچھے ہٹ گیا تو وقاص ٹرائی کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ ایسگارڈ نے نارمل سا جواب دیا اور میری طرف آ گئی۔

''راضی صاحب! اب ہیرو بننا چھوڑ دو۔ لڑکی تمہارے پاس ہی بار بار چل کر آ رہی ہے۔ دوستی لگاؤ اور مزے کرو۔ اس پردیس میں اس سے بڑھ کر اور کیا چیز ہو گی؟'' وقاص نے ایسگارڈ کو میری طرف آتا ہوا دیکھا تو کہنے لگا۔

یہ حقیقت ہے پردیس میں عورت ہی سب سے بڑی چیز ہوتی ہے۔ پیسے کے معاملے میں پردیس بہت فیاض ہے۔ یہاں پیسے کی کوئی کمی نہیں ہوتی۔ یہاں اس ڈیرے پر ہی ہم سب لڑکے 90 ہزار سے اوپر پیسے کما رہے تھے۔ جبکہ پاکستان میں ایک مزدور کی زیادہ سے زیادہ تنخواہ 10 ہزار روپے سے زیادہ نہیں ہوتی۔ پاکستان میں بڑے بڑے افسروں کی تنخواہ بھی 90 ہزار نہیں ہوتی اور ہم یہاں زمیندارے کے کام سے ہی 90 ہزار کما رہے تھے۔ پیسہ ہم پردیسیوں کے پاس بہت ہوتا ہے لیکن عورت نہیں ہوتی۔ یونانی عورتیں ہم پاکستانیوں کو پسند نہیں کرتیں۔ زیادہ تر پاکستانی کاغذات بنوانے کے لئے یہاں کی عورتوں سے شادیاں کرتے ہیں۔ آٹھ دس سال ان کے ساتھ رہتے ہیں اور پھر چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں۔

یونانی آزاد معاشرہ ہے۔ یہاں عورت اور مرد دونوں آزاد اور برابر ہیں جبکہ ہم پاکستانی شادی کرنے کے بعد ان یونانی عورتوں کو بھی اپنے پاکستانی رنگ میں رنگنے کوشش کرتے ہیں۔ ہم شادی کے دوسرے ہی دن انہیں گھر بیٹھنے پر زور دینا شروع کر دیتے ہیں اور اسی وجہ سے شادیاں ناکام ہو جاتی ہیں۔ اور ایک ناکام شادی اگلی کئی عورتوں کی نفرت کا باعث بن جاتی ہے۔ آج کے یونان میں کوئی بھی لڑکی کسی پاکستانی سے دوستی یا شادی کے لئے تیار نہیں ہوتی۔ ہم لوگ یونان کے اندر بہت زیادہ بدنام ہو چکے ہیں۔ باقی یورپ کے

حالات مختلف ہیں۔وہاں کے حالات میں بعد میں لکھوں گا۔

''چلیں راضی! آج پھر تم میرے ہاتھ آ گئے ہو۔'' ایسگارڈ نے میرے نزدیک آ کر کہا تو میں مسکرانے لگا۔

''پہلے ناشتہ کر لیتے ہیں اور پھر کپڑے تبدیل کر کے سارا دن یہی کام کرنا ہے۔'' میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور ہم سب گھر کی طرف چلنے لگے۔

ناشتہ وغیرہ کر کے اس بار ہم ٹریکٹر پر آ گئے۔ٹریکٹر اور کار میں تقریباً کوئی فرق نہیں ہوتا ہے۔صرف پانچ منٹ میں ہی میں نے اس کے سسٹم کو سیکھا اور آرام سے سٹارٹ کر کے چلانے لگا۔ یہ کار کے مقابلے میں نسبتاً آسان تھا۔گیئر میں ڈالنے کے بعد یہ ریس کے بغیر ہی چلنا شروع کر دیتا تھا۔ٹریکٹر کو چلانے کے بعد میں نے چار پانچ چکر کھیتوں کے لگائے۔اس بار میں ٹریکٹر کو لے کر کھیتوں میں بھی چلا گیا۔اس کے بعد ایک چکر گاؤں کا بھی لگا آیا۔دوپہر کے کھانے کے بعد ایسگارڈ نے مجھے ٹریکٹر کے پیچھے ٹرالی ڈال کر دی اور پھر میں ٹریکٹر کو ٹرالی کے ساتھ چلانے لگا۔ٹرالی کے ساتھ ٹریکٹر کچھ مشکل تھا لیکن شام تک میں مکمل سیکھ گیا۔شام کو مالک ایسگارڈ کو لینے آیا تو اس نے جانے سے انکار کر دیا۔اگلے دن چونکہ جمعہ تھا اور پھر ویک اینڈ شروع ہو جاتا۔اس لئے کوستا اور سبرینہ ایتھنز چلے گئے تھے۔وہ تین دن ادھر ہی ویک اینڈ گزار کر آتے۔انہوں نے ایسگارڈ کو بھی ساتھ چلنے کا کہا تھا لیکن ایسگارڈ یہ ویک اینڈ ہمارے ساتھ گزارنا چاہتی تھی۔

''اچھا، اگر تم نے ابھی گھر نہیں جانا ہے تو ایسا کرو کہ مجھے گھر چھوڑ آؤ اور کار لے آؤ۔اس کے بعد جب تمہارا جی چاہے تم پھر آ جانا۔مجھے دوبارہ ڈیرے پر نہیں آنا پڑے گا۔'' مالک نے ایسگارڈ کو کہا تو میں اور ایسگارڈ مالک کو گھر چھوڑنے کے لئے تیار ہو گئے۔

''راضی کار چلاؤ گے تم؟'' مالک نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''فندیکو! شہر کی طرف جا رہے ہیں، اگر راستے میں چالان ہو گیا تو میرا کوئی قصور نہیں ہے۔میرے پاس لائسنس نہیں ہے۔'' میں نے ان کو خبردار کرتے ہوئے کہا۔

''کوئی بات نہیں یار! میں جرمانہ ادا کر دوں گا۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تمہیں کتنی گاڑی چلانا آ گئی ہے۔صرف آج کی ہی تو بات ہے،اس کے بعد تو تم نے ادھر ڈیرے کے آس پاس ہی ٹریکٹر چلانا ہے اور اس کے لئے کسی لائسنس کی ضرورت نہیں ہوتی۔'' مالک نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا تو میں نے گاڑی سٹارٹ کی اور تھیوے شہر کی طرف جانے لگا۔

ہم نے مالک کو اس کے گھر چھوڑا اور کار لے کر واپس آ گئے۔راستے میں ایک دکان سے ایسگارڈ نے مٹھائی خریدی اور ہم واپس ڈیرے پر آ گئے اور ایک بار پھر ٹریکٹر ٹرالی کی ٹرائی لینے لگے۔رات تک میں مکمل سیکھ گیا تھا۔

''ایسگارڈ!تمہیں دیر ہو رہی ہے،اب تم چلی جاؤ! کافی رات ہو گئی ہے۔'' میں نے ایسگارڈ کو کہا۔

ہم سب رات کا کھانا کھا کر سی ڈی پر گانے سن رہے تھے۔مالک کا دو بار فون آ چکا تھا اور دونوں بار اس نے باہر جا کر اٹینڈ کیا تھا۔پتہ نہیں اس نے مالک کو کیا بولا تھا لیکن مجھے فکر ہو رہی تھی۔رات کے گیارہ بج گئے تھے اور وہ ابھی تک ہمارے پاس ہی بیٹھی ہوئی تھی۔

''یار! میں رات کو ادھر ہی سو جاتی ہوں۔ویسے بھی آدھی رات تو گزر چکی ہے۔پانچ چھ گھنٹے میں صبح ہو جائے گی۔'' اس کا ارادہ ڈیرے سے جانے کا نہیں تھا۔

''یار! ڈیرے پر یہاں ہمارے پاس کوئی بھی انتظام نہیں ہے۔بستر گندے ہیں،صبح تک تم بیمار ہو جاؤ گی۔'' میں نے بہانہ بناتے ہوئے کہا۔

''کوئی بات نہیں یار! آپ بھی تو ادھر ہی سوتے ہو۔۔۔میں بھی سو جاؤں گی۔تم فکر مت کرو!'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یار! گھر میں مہمان آ جائے تو اسے بھگاتے نہیں ہیں۔'' اس کی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔

''ٹھیک ہے! جیسے تمہاری مرضی، مجھے نیند آ رہی ہے میں سونے جا رہا ہوں۔تم ادھر ہی سو جانا، میں چادر اور بستر تمہیں دے جاتا ہوں۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا اور کمرے سے باہر آ گیا۔میں نے دوسرے کمرے سے ایک دھلی ہوئی چادر اور تکیہ لیا اور دوبارہ ان کے پاس آ گیا۔

''یہ لو ایسگارڈ! تم ادھر ہی اس بیڈ پر سو جانا، صبح 7 بجے کے قریب میں آ کر جگا دوں گا۔'' میں اس کے لئے بیڈ پر چادر بچھانے لگا۔

وقاص اور شکیل بھائی! آپ مزید آدھے گھنٹے تک فلم دیکھو اور اس کے بعد سبھی نکل جانا۔ وہ آرام سے سو سکے گی۔ اگر کسی نے کوئی فلم وغیرہ دیکھنی ہے تو وہ کل بھی دیکھ سکتا ہے۔'' میں باقی سبھی لڑکوں کو سمجھانے لگا۔

ایسگارڈ پر لائین مارنے کے چکر میں یہ سارے ادھر ہی پڑے رہتے اور اس بے چاری کو تکلیف ہوتی۔ عورت جتنی بھی روشن خیال کیوں نہ ہو غیر مردوں کے ساتھ اکٹھے سونے میں اسے جھجھک ضرور ہوتی ہے۔ میں خاموشی سے اپنے کمرے میں آیا اور بیڈ پر لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ آدھے گھنٹے سے پہلے ہی مجھے نیند آ گئی تھی اور میں دنیا و مافیہا سے بے نیاز سو رہا تھا۔ امریکہ جتنا مشکل ملک ہے اتنے ہی مشکل اس کے لوگ بھی ہیں۔ ایسگارڈ اتنی آسانی سے ہار ماننے والی نہیں تھی۔

''راضی۔۔۔ راضی۔۔۔ اٹھو! مجھے کمرے میں اکیلے سوتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔'' مجھے ابھی لیٹے ہوئے ایک گھنٹہ بھی نہیں ہوا تھا اور وہ میرے سر پر کھڑی مجھے جھنجھوڑ کر اٹھانے لگی۔

''یار! سونے کی کوشش کرو۔۔۔ اتنی بڑی ہو گئی ہو اور ابھی تک ڈر لگتا ہے تمہیں؟'' میں نے غصے سے اس کی طرف گھورتے ہوئے کہا۔

''تم آ جاؤ نا میرے کمرے میں۔۔۔ مجھے واقعی بہت ڈر لگ رہا ہے یار!'' اس نے ایک بار پھر مجھے جھنجھوڑنا شروع کر دیا۔

''یار ایسگارڈ! کوشش کرو سونے کی۔۔۔ یا پھر ایسا کرو کہ صدام کو لے جاؤ، وہ تمہارے کمرے میں سو جائے گا۔'' میں نے اس سے جان چھڑاتے ہوئے کہا۔ صدام ابھی بچہ تھا۔ اس کی عمر ابھی صرف 16 سال کے قریب تھی۔ وہ ایسگارڈ کے ساتھ آرام سے سو سکتا تھا۔

''نہیں! میں نے تم کو ہی لے کر جانا ہے۔ مجھے تم سے باتیں بھی کرنی ہیں۔ اسے نہ تو انگلش آتی ہے اور نہ ہی یونانی، اس کے ساتھ میں کیا باتیں کروں گی؟'' اس نے ضد کرتے ہوئے کہا۔

''یار پلیز! میری مجبوری کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ ایسا کرو پھر وقاص کو لے جاؤ! اسے یونانی زبان بھی آتی

ہے اور تمہاری دوستی بھی اس کے ساتھ اچھی خاصی ہے۔'' میرا اس کے ساتھ جانے کا بالکل ارادہ نہیں تھا۔ اگر وہ وقاص کو ساتھ لے جاتی تو میری جان چھوٹ جاتی۔ اس لئے میں نے اسے وقاص کا مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

''میں نے تم سے مشورہ نہیں مانگا ہے۔ سیدھی طرح مجھ سے بات کرو کہ میرے ساتھ جانا ہے یا نہیں جانا ہے؟'' اس نے قدرے اونچی آواز میں بات کرتے ہوئے کہا۔ میرے ساتھ کمرے میں سوئے ہوئے دوسرے لڑکے بھی اٹھ گئے تھے۔

''ایسگارڈ! میں نہیں جاؤں گا۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا اور دوسرے طرف کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔

''تو ٹھیک ہے! میں بھی تمہارے ساتھ ادھر ہی سو جاتی ہوں۔'' وہ میرے ساتھ ہی بستر پر لیٹ گئی۔

''راضی بھائی! دوسرے کمرے میں چلے جاؤ۔'' وقاص کی طنزیہ آواز مجھے سنائی دی۔

ایسگارڈ میرے ساتھ ایک ہی بیڈ پر لیٹ گئی تھی۔ میں دوسری طرف کروٹ بدل کر لیٹا ہوا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ میرے اوپر سے گزارا اور مجھ سے لپٹ گئی۔ مجھے ایک جھٹکا لگا اور میں جلدی سے بیڈ سے اتر گیا۔ کمرے میں چاند کی ہلکی ہلکی روشنی اندر آرہی تھی۔ میں خاموشی سے باہر نکلا اور حوضی کے کنارے پر جا کر بیٹھ گیا۔ یہاں چاند کی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ 12 بجے سے اوپر ٹائم ہو گیا تھا اور ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ یورپ میں گرمیوں میں موسم زیادہ گرم نہیں ہوتا اور رات کو ٹھنڈک ہو جاتی ہے۔ میں خاموشی سے حوضی کے ساکن پانی کو دیکھنے لگا۔

''راضی صاحب! اتنی دوریاں مت رکھو ہم سے۔۔۔ کہیں اس لڑکی کا دل ہی نہ ٹوٹ جائے۔'' وہ میرے پیچھے آ کر کھڑی ہو گئی۔

''تم تھوڑا تھوڑا میرے دل میں اترنے لگے ہو، کوئی تو بات ہے تمہاری شخصیت میں۔۔۔ بڑی تیزی سے اثر کرتے ہو۔'' وہ میرے پاس بیٹھ گئی۔

''ایسگارڈ! تم بہت اچھی ہو، بہت خوبصورت ہو۔'' میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تو اس نے

اپنا سر میرے کندھے پر رکھ دیا۔

''ایسگارڈ! تم بہت خوبصورت، بہت امیر اور نہایت تعلیم یافتہ ڈاکٹر ہو یار! جبکہ میں تمہارے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ تمہارا میرا کوئی جوڑ نہیں ہے۔ تم کچھ دنوں کے لیے یہاں آئی ہو۔ چار دن دوستی لگاؤ گی اور پھر چلی جاؤ گی۔ میری آدھی زندگی نکل گئی ہے امریکہ کا راستہ تلاش کرتے ہوئے، تمہارے چار دن کی دوستی مجھے میرے راستے سے بھٹکا نہیں سکتی۔ ہم یہاں دس لڑکے ہیں۔ تم کسی سے بھی دوستی کر لو لیکن میں نہیں کر سکتا۔ مجھے ان راستوں پر چلنا ہی نہیں ہے۔'' میری آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے۔ اس نے میرے کندھے سے سر اٹھا لیا۔

''راضی صاحب! عورت کی عزت کرنا بھی سیکھو لو۔ دوستی کرنا یا نہ کرنا یہ تو تمہارے اختیار میں ہے لیکن مجھے دوسرے لڑکوں کے پاس جانے کا کہہ کر میری توہین تو نہ کرو! اگر ایک عورت تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتی ہے تو اسے بدچلنی کا الزام تو مت دو یار! تمہارے محبوب نے بھی تم کو یہی مشورہ دیا ہوگا نا؟ تو پھر تم کیوں نہیں دوسری لڑکیوں کے پاس چلے جاتے؟ عزت دینا سیکھو راضی صاحب! محبت کرنا بھی آ جائے گا۔'' وہ خاموشی سے اٹھی اور اندر اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئی۔

میں نے واقعی اس عورت کا دل دکھا دیا تھا۔ اگر وہ مجھ میں دلچسپی رکھتی تھی تو اس کا مطلب یہ تو نہیں تھا کہ وہ غلط قسم کی عورت ہے۔ جس کو میں دوسرے لڑکوں کے پاس جانے کا مشورہ دے رہا تھا۔ میں حوضی کی دیوار سے اٹھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے کمرے میں آ گیا۔ کمرے میں زیرو واٹ کے بلب کی ہلکی ہلکی لال روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ دیوار کی طرف منہ کیئے لیٹی ہوئی تھی۔ لڑکیوں کے دل بہت نازک ہوتے ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر ٹوٹ جاتے ہیں۔ میں نے اس کی شرافت پر انگلی اٹھائی تھی اور وہ میرے لفظوں کو برداشت نہیں کر پائی تھی۔ میں اس کے پاس بیڈ پر جا کر بیٹھ گیا۔

''سوری ایسگارڈ! مجھ سے غلطی ہو گئی تھی، میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔'' میں نے اس کا چہرہ اپنی طرف کرتے ہوئے کہا۔ زیرو کے لال بلب کی روشنی میں اس کا سفید چہرہ چمک رہا تھا۔

''سوری یار! میں واقعی اپنے الفاظ سے شرمندہ ہوں۔'' میں آہستگی سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔

’’جگہ خالی ہے بیڈ پر راضی صاحب! بھروسہ ہے تو لیٹ جاؤ!‘‘ اس نے بیڈ کی خالی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو میں خاموشی سے اس کے ساتھ لیٹ گیا۔ اس نے پہلو بدلہ اور میرے سینے پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔

’’راضی! خدا نے عورت چیز ہی ایسی بنائی ہے کہ بڑے بڑے پادریوں کا ایمان خراب کر دیتی ہے۔ تم کسی اور ہی مٹی کے بنے ہوئے لگتے ہو!‘‘ وہ میرے سینے پر سر رکھے مجھ سے لپٹی ہوئی تھی۔

اس کے جسم کی بھینی بھینی خوشبو اس بار مجھے مدہوش کرنے میں ناکام ہو رہی تھی۔ میرا ایمان بہت مضبوط تھا۔ اسے ایک عورت کا حسن خراب نہیں کر سکتا تھا۔ میں اس کی باتیں سنتا سنتا آہستہ آہستہ نیند کی وادیوں میں جانے لگا اور پھر سو گیا۔ صبح 6 بجے کے قریب میری آنکھ کھلی۔ وہ ابھی تک میرے سینے پر سر رکھے لیٹی ہوئی تھی۔ میں پوری رات سیدھا ہی سوتا رہا تھا اور وہ بھی ساری رات ایک ہی کروٹ سوتی رہی۔ وہ پوری رات مجھ سے لپٹی رہی تھی۔ شاید میرا ایمان چیک کر رہی تھی۔ ایمان کی محبت نے میرا کردار بہت مضبوط بنا دیا تھا۔

آج چھٹی تھی اور لڑکوں نے آج کام پر ہی نہیں جانا تھا لیکن صرف تجسس کی خاطر وہ سارے 5 بجے ہی اٹھ گئے تھے۔ وہ باری باری سارے ہی ہمارے کمرے میں جھانک کر چلے گئے تھے۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اس لئے باہر سے بھی ہم دونوں اکٹھے سوتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ وہ ایسگارڈ کو میرے ساتھ سوتے ہوئے دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ میں نے آہستگی سے اس کا سر اٹھا کر دوسری طرف تکیے کے اوپر رکھا اور بیڈ سے نیچے اتر آیا۔ وہ ہلکا سا کسمائی تھی لیکن پھر نارمل ہو کر سونے لگی۔ میں کمرے سے باہر آ گیا۔ شکیل بھائی کچن میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ میں نے ٹونٹی سے منہ ہاتھ دھویا اور برش کر کے اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔

’’یار! نہا تو لیتے؟ تم ناشتہ کرنے کے لئے ایسے ہی آ کر بیٹھ گئے ہو؟‘‘ شکیل بھائی نے مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

’’ہاں یار! کم از کم نہا تو لو، اب ایسے ہی گندے آ کر بیٹھ گئے ہو؟‘‘ وقاص بھی کچن کے اندر آ گیا اور وہ مجھ سے دور ہٹ کر بیٹھ گیا۔

''فوکسی! (میں وقاص کو کبھی کبھی فوکسی Foksi کہہ کر بھی بلاتا تھا) جو کچھ تم لوگ سوچ رہے ہو وہ سب غلط ہے۔ رضوان اتنا بھی گرا ہوا نہیں ہے جو کوئی بھی لڑکی اپنے چند جلوے دکھا کر اسے اپنا اسیر بنا لے۔ یہ ایک رات کیا ساری زندگی بھی ایسے ہی میرے ساتھ سوتی رہے پھر بھی میرا دل نہیں جیت سکتی۔ اگر سمجھ آ گئی ہو تو چائے ڈال کر دے دو!'' میں نے چھابے سے پراٹھا نکالتے ہوئے وقاص سے چائے ڈالنے کا کہا۔

پراٹھے ان لوگوں نے صبح صبح ہی بنا لئے تھے اور سب نے تقریباً ناشتہ کر لیا تھا۔ صرف میں اور ایسگارڈ ہی رہتے تھے۔ وقاص نے چائے ڈال کر دی تو میں چائے کے ساتھ پراٹھا کھانے لگا۔ وقاص کا دل مزید بات کرنے کو کر رہا تھا لیکن میرے تیور دیکھ کر وہ خاموش ہو گیا۔ ناشتہ کر کے میں نے ٹریکٹر سٹارٹ کیا اور موٹر پر آ گیا۔ میں نے آلوؤں کے ایک کھیت کو پانی دینا تھا اس لئے میں نے پائپوں کا رخ آلوؤں والے کھیت کی طرف کیا، والو کھولے اور موٹر چلا دی۔

موٹر سے مراد آپ لوگ کوئی چھوٹی موٹر نہ لیں جو گھروں میں پانی کے لئے لگی ہوتی ہے۔ یہ پورا ٹیوب ویل تھا، پانچ پانچ قطر کا۔ موٹرا سے مقامی یونانی زبان میں کہتے تھے اور اسی وجہ سے میں بھی موٹر ہی لکھتا رہا ہوں۔ اصل لفظ موتر ہے۔ یونانی زبان میں ''ٹ'' نہیں ہوتی اور یہ ''ٹ'' کو ''ت'' بولتے ہیں۔ ہم پاکستانی صحیح لفظ موٹر بولتے ہیں۔

موٹر چلانے کے بعد میں نے خراب اور بند ہونے والی نکوں کو ٹھیک کیا، واپس ڈیرے پر آیا اور بکریوں کا چارا دیکھنے لگا۔ یونان میں مویشیوں کو سبز چارا نہیں دیا جاتا ہے بلکہ خشک چارا دیا جاتا ہے۔ پاکستانی روایتی طریقہ سے صبح اٹھ کر چارا کاٹنا اور پھر ٹوکے سے کُتر کر جانوروں کو کھلانا، یہ طریقہ یہاں استعمال نہیں ہوتا۔ اس کے لئے ایک کل وقتی ملازم اور مالک بھی چاہیے جو چارا بیجتا اور کاٹتا رہے۔ ایک ملازم زیادہ سے زیادہ دس گائے ہی پال سکتا ہے جبکہ یورپ میں یہ کام سینکڑوں کے حساب سے ہوتا ہے۔

یہاں گرمیوں میں چارا کاشت کیا جاتا ہے۔ صرف 40 دن میں یہ تیار ہو جاتا ہے تو اسے کاٹ کر پہلے خشک کیا جاتا ہے اور پھر اس کی گانٹھیں بنا کر محفوظ کر لیا جاتا ہے اور سارا سال یہی چارا استعمال کیا جاتا ہے۔ چارا کاٹنا، گانٹھیں بنانا اور گاڑی پر لوڈ کرنا۔۔۔ یہ سارا کام مشینوں سے ہی ہوتا ہے۔ اس کام میں ایک بھی ملازم کی ضرورت نہیں پڑتی۔ صبح اور شام ایک ایک گانٹھ جانوروں کے آگے کھول کر ڈال دی۔ پانی خودکار

طریقے سے ڈائریکٹ والو کھولو تو آ جاتا ہے۔ یہ کوئی بھی مشکل کام نہیں ہے اور اس کے لئے کسی بھی علیحدہ ملازم کی ضرورت نہیں پڑتی۔ جبکہ اس کے برعکس پاکستان میں ہم صرف ایک بھینس ہی رکھ کر پورا گھر اس کا چارا اور دوسری ضروریات پوری کرنے پر لگ جاتا ہے۔

سورج کافی اوپر آ گیا تھا۔ میں نے واپس آ کر کپڑے پکڑے اور باتھ روم میں گھس گیا۔ نہا کر کپڑے تبدیل کر کے میں باہر آیا تو تب تک ایسگارڈ بھی اٹھ گئی تھی اور باہر کھڑی میرا ہی انتظار کر رہی تھی۔ میں باہر نکلا تو وہ اندر چلی گئی۔ میں نے شکیل بھائی کا تولیہ باتھ روم میں پکڑا دیا۔ وہ نسبتاً صاف اور اچھی حالت میں تھا جبکہ باقی تو سبھی ایسے ہی تھے۔ وہ نہا کر نکلی تو تب تک مدثر ان کے لئے آلو والے پراٹھے تیار کر چکا تھا۔ میں نے جلدی سے چٹنی بنائی اور ایک بار پھر ایسگارڈ کے ساتھ مل کر ناشتہ کرنے لگا۔ ناشتہ کرنے کے بعد ہم سب جھیل پر چلے گئے۔ چھٹی والے دن ہمارا زیادہ تر وقت مچھلی پکڑنے میں ہی گزرتا تھا۔ چار پانچ گھنٹوں میں ہم اچھی خاصی مچھلیاں پکڑنے میں کامیاب ہو جاتے تھے اور رات کو مچھلی کا ہی کھانا بنایا جاتا تھا۔

آج ہم سب لڑکے ٹریکٹر پر آئے تھے۔ آدھے لڑکوں کو ایسگارڈ نے کار میں بٹھا لیا اور باقیوں کو میں ٹریکٹر پر لے آیا۔ یہاں سارا دن ہم جھیل میں نہاتے، مچھلیاں پکڑتے اور دوپہر کو واپس چلے جاتے تھے۔ میں نے شکیل بھائی اور ایسگارڈ کو لیا اور ایک سائیڈ پر کانٹے لگانے لگا جبکہ باقی لڑکوں نے جلدی جلدی نیکریں پہنی اور جھیل میں کود گئے۔

یہ پتھریلا علاقہ تھا اور جھیل کا پانی انتہائی شفاف تھا۔ ہمیں جھیل میں مچھلیاں تیرتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ یہ جھیل گیارہ کلومیٹر لمبی اور تقریباً 5 کلومیٹر چوڑی تھی۔ جھیل کی چوڑائی یکساں نہیں تھی۔ یہ ایک طرف تو 6 کلومیٹر چوڑی تھی اور کہیں کہیں یہ تنگ ہو جاتی تھی اور اس کی چوڑائی صرف 500 میٹر رہ جاتی تھی۔ ایک آدمی آرام سے تیر کر دوسری طرف جا سکتا تھا۔ ہمارے ڈیرے کے نزدیک یہ جھیل 5 کلومیٹر چوڑی تھی اور اس کی 500 میٹر والی تنگ کھائی ہم سے 6 کلومیٹر دور تھی۔

”اوئے یار! شرم کرو، ایک عورت ہمارے ساتھ ہے اور تم سب نیکروں میں اس کے سامنے نہا رہے ہو؟“ میں نے ان کو شرم دلاتے ہوئے کہا۔

”بھائی جی! یہ یورپ ہے اور یہاں کپڑوں سمیت نہانے والوں کو برا سمجھا جاتا ہے۔“ وقاص نے

زور سے چیختے ہوئے کہا۔

یونان میں ہر طرف سمندر ہی سمندر لگتا ہے اور یہ یورپ کا نسبتاً گرم علاقہ ہے۔ گرمیوں میں یونان کے سبھی ساحل سیاحوں اور مقامی لوگوں سے بھر جاتے ہیں۔ یہاں فل کپڑے تو دور کی بات پتلون میں بھی نہانے والے کو برا سمجھا جاتا تھا۔

''یہ کیا کہہ رہا ہے؟'' وقاص نے چونکہ پنجابی میں مجھ سے کہا تھا اس لئے اسے اس کی سمجھ نہیں آئی تو وہ مجھ سے پوچھنے لگی۔

''کچھ نہیں! بس ویسے ہی بکواس کر رہا ہے۔'' میں نے اسے ٹالتے ہوئے کہا۔

''اچھا۔۔۔میرا بھی نہانے کو دل کر رہا ہے۔ میں گاؤں جا رہی ہوں، تم آجاؤ میرے ساتھ!'' اس نے کانٹے شکیل بھائی کو پکڑائے اور میرا ہاتھ پکڑ کر گاڑی کی طرف لے گئی۔

گاؤں ہم سے صرف 10 منٹ کے فاصلے پر ہی تھا۔ گاؤں کی طرف والی جھیل میں لوگ نہانے کے لئے آتے تھے اور یہاں بہت رش ہوتا تھا۔ یہاں ایک دکان بھی تھی جو نہانے کے لئے نیکریں اور بکنی فروخت کرتی تھی۔ اس کے علاوہ چھوٹی چھوٹی لائف بوٹ اور دوسرا سامان بھی تھا جس میں ہوا بھر کر ان کے اوپر لیٹا جا سکتا تھا۔ جھیل میں اٹھنے والی لہریں سکون دیتی تھیں تو لوگ سارا دن ان کے اوپر لیٹے اونگھتے رہتے تھے۔

ایسگارڈ نے دکان سے کافی سارا سامان خریدا اور پھر ایک اور دکان میں داخل ہو گئی۔ وہاں سے اس نے چپس (Chips) اور دوسری نمکین اشیاء خریدیں اور ہم لوگ ایک بار پھر واپس جھیل پر آ گئے۔ اس نے کپڑے اتار کر بکنی (BIKNI) پہنی اور جھیل میں کود گئی۔

''آجاؤ راضی! تم بھی آجاؤ یار! پانی بہت زبردست ہے۔'' وہ باقی لڑکوں کے پاس چلی گئی اور مجھے بھی نہانے کے لئے کہنے لگی۔

شکیل بھائی کے پاس ایک اور لڑکا مچھلی پکڑنے کے لئے آ گیا تھا۔ ہمارے پاس صرف دو ہی کانٹے تھے۔ میں ان دونوں کے پاس جا کر بیٹھ گیا اور انہیں مچھلی پکڑتے ہوئے دیکھنے لگا۔ وہ کافی دیر تک مجھے نہانے کے لئے بلاتی رہی لیکن میں ادھر ہی بیٹھا رہا۔ آخر تنگ آ کر وہ میرے پاس آ گئی۔

''راضی صاحب! اتنے بھی چوہدری نہیں ہو۔۔۔ساری دنیا نہا رہی ہے اور تم نخرہ کر رہے ہو۔سیدھی طرح پانی میں جاتے ہو یا اٹھا کر پھینکوں پانی کے اندر؟'' اس نے مجھے کپڑوں سے پکڑتے ہوئے کہا۔

''یار! مجھے تیرنا نہیں آتا ہے اور پانی سے ڈر لگتا ہے۔'' میں نے بہانہ بناتے ہوئے کہا۔

''تین فٹ سے اوپر پانی نہیں ہے یہاں پر اور تمہیں ڈر لگ رہا ہے؟ کونسی دنیا سے آئے ہو تم؟'' اس نے میرے جسم کے گرد اپنے بازوؤں کو پھیلاتے ہوئے کہا۔جھیل کا پانی سمندر کی طرح بتدریج گہرا ہو رہا تھا۔ یہاں ایک فٹ سے لے کر تین فٹ تک گہرائی تھی۔مزید اندر جا کر جھیل 20 فٹ سے بھی زیادہ گہری تھی۔

''شرٹ اتارتے ہو یا میں پھاڑ دوں؟'' اس نے غصے سے کہا۔

''ٹھیک ہے! میں ایسے ہی نہا لوں گا۔'' میں نے جلدی سے پانی میں اترتے ہوئے کہا۔

''اوئے بیوقوف! یہ کیا کر رہے ہو؟ اس نے مجھے پیچھے سے پکڑتے ہوئے کہا۔

''آرام سے کپڑے اتارو اور نیکر پہنو! میں سپیشل تمہارے لئے دکان سے خرید کر لائی ہوں۔'' وہ مجھے کھینچتے ہوئے گاڑی تک لے گئی اور اس نے کار سے ایک نیکر نکال کر دے دی۔

''ابھی اس کو پہنو اور میرے ساتھ چلو!'' میں نے اس سے نیکر لی اور کار کی دوسری طرف جا کر پہن لی۔

''ادھر ہی میرے سامنے بدل لیتے ، دوستوں کے سامنے کونسی شرم ہوتی ہے؟'' اس نے مجھے آنکھ مارتے ہوئے کہا تو میں نے منہ دوسری طرف کر لیا۔

''چلو چلو! ابھی میرے آگے لگو!'' اس نے مجھے بازو سے پکڑا اور آگے کر دیا۔میری پیٹھ اس کی طرف ہوئی تو اسے زخموں کے نشانات نظر آ گئے۔

''راضی! یہ نشانات کیسے ہیں؟'' اس نے میری پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ہم دونوں گھٹنوں تک پانی کے اندر آ چکے تھی۔

''یار! یہ تو مار کے نشانات ہیں۔۔۔تمہاری پوری کھال ہی ادھڑی ہوئی ہے۔کوئی اس قدر بھی ظلم کر سکتا ہے؟'' وہ ان نشانات پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔ میں رُخ بدل کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔اس کی آنکھوں سے ہلکی ہلکی نمی جھلکنے لگی تھی۔

''یہ مار کے نشانات نہیں ہیں۔بچپن میں ایک شیشے پر گر گیا تھا، یہ اس کے نشانات ہیں۔کوئی ظلم نہیں ہوا ہے مجھ پر۔'' میں نے بات کو ٹالتے ہوئے کہا۔

میں اسے سچ نہیں بتانا چاہتا تھا۔ یہ نشانات نمبردار اور پھر پولیس کے لگائے ہوئے تھے۔ میں نے ایمان کے عشق میں یہ زخم سہے تھے۔ یہ ایمان کی محبت کی مہریں تھیں جو میرے جسم پر ثبت ہو گئی تھیں۔ میں اسے یہ سب کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا اسی لیے جھوٹ بول گیا۔

''راضی صاحب! ڈاکٹر ہوں، بیوقوف بنانے کی کوشش مت کرو۔شیشے کے نشانات لمبے اور پتلے نہیں ہوتے۔'' وہ ایک بار پھر میرے نشانات پر ہاتھ پھیر کر انہیں دیکھنے لگی۔

''تمہاری ساری پشت خراب ہو گئی ہے۔لوگ اتنے بھی ظالم ہوتے ہیں کیا؟'' اس کی نظریں ابھی تک میرے نشانات پر جمی ہوئی تھیں۔

''ایسگارڈ! دنیا اس سے بھی زیادہ ظالم ہے۔ہم لوگ ظلم کرتے وقت بڑے بڑے جانوروں کو بھی پیچھے چھوڑ دیتے ہیں۔'' میں پلٹ گیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

''راضی! تمہاری کہانی بہت بڑی ہو گی۔ پوری دنیا کا درد تمہاری آنکھوں میں نظر آتا ہے۔کچھ تو خاص ہے تمہاری شخصیت میں جو اتنا درد چھپائے بیٹھے ہو۔'' اس نے آگے بڑھ کر مجھے گلے سے لگا لیا۔

محبت ایک بار پھر میرے آنگن میں اترنے کی کوشش کرنے لگی تھی۔ میں نے اپنے دل کے دروازے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کر لیے تھے۔ایمان کے علاوہ اور کوئی بھی اس دل تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔میری تو زندگی کی خواہش بھی ختم ہو گئی تھی۔ایمان کی خواہش اور اس کی لگائی ہوئی قسمیں ہی مجھے خودکشی سے روکتی تھیں ورنہ میں تو کب کا مر چکا ہوتا۔ مجھے اسی دنیا میں زندہ رہ کر ایمان کی اس محبت کا امتحان دینا تھا تاکہ آخرت میں خدا سے ایمان کا ساتھ مانگ سکتا۔اس محبت میں جو درد اور اذیت میں برداشت کر رہا تھا اس کا ایک فیصد بھی

ایسگارڈ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

یورپین لوگ روح کی بجائے جسم سے محبت کرتے ہیں۔ وہ ڈاکٹر تھی اور میرا اور اس کا کوئی جوڑ نہیں تھا۔ میرا کسی کے ساتھ بھی جوڑ نہیں تھا۔ شام کو ہم جھیل سے واپس آئے تو مالک ڈیرے پر آیا ہوا تھا۔ اس نے آتے ہی ایسگارڈ سے اس کا حال احوال پوچھا اور اسے گھر چلنے کے لئے کہا لیکن ایسگارڈ ابھی ادھر ہی ہمارے ساتھ ہی رہنا چاہتی تھی۔ مالک نے دو تین بار کہا لیکن اس نے منع کر دیا۔ مالک گھر جانے لگا تو ہم بھی علیحدہ گاڑی میں اس کے ساتھ ہی شہر چلے گئے۔

ایسگارڈ نے گھر سے اپنا سامان اور کپڑے لئے اور واپسی میں ایک سپر مارکیٹ میں گھس گئی۔ وہ گھر کے لئے خریداری کرنے لگی۔ ہم ٹرالی لے کر مارکیٹ میں گئے تھے اور پوری ٹرالی بھر کر ہی باہر آئے۔ کار کی پچھلی ڈگی بھر گئی تھی۔ اس نے سب کچھ ہی خرید لیا تھا۔ ڈیرے پر لڑکے اتنا سامان دیکھ کر پاگل ہو گئے۔ ہم عید پر بھی اتنا سامان نہیں لے کر آتے تھے جتنا وہ اٹھا کر لے آئی تھی۔ کوستا اور سبرینہ ویک اینڈ پر گئے ہوئے تھے۔ وہ سوموار کی شام کو آئے۔ ایسگارڈ پچھلے چار دن سے ہمارے ساتھ رہ رہی تھی۔ مالک کے توسط سے اسے پتہ چل گیا تھا کہ ایسگارڈ مجھ میں دلچسپی لینے لگی ہے اور وہ میرے ساتھ رہ رہی ہے۔

''راضی! بہت برے ہو یار! تم تو آخر میری دوست کو اڑا کر لے ہی گئے ہو۔'' سبرینہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے ہی شور مچانا شروع کر دیا۔ ہم سب کمرے میں بیٹھے CD دیکھ رہے تھے۔ جب اس نے آتے ہی میری کلاس لینی شروع کر دی۔

''نہیں سبرینہ! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم صرف دوست ہیں۔'' میں نے وضاحت دینا چاہی تو اس نے مجھے درمیان میں ہی روک لیا اور مجھے پکڑ کر باہر لے آئی۔ ایسگارڈ بھی ہمارے پیچھے پیچھے باہر آ گئی۔

''تو ایسگارڈ! آخر تمہیں میرا بھائی پسند آ ہی گیا ہے؟'' سبرینہ نے اسے مصنوعی غصے سے گھورتے ہوئے کہا۔

''مجھے تو پسند آ گیا ہے لیکن تمہارے بھائی کو شاید میں پسند نہیں آئی ہوں۔ ابھی تک نخرے دکھا رہا ہے۔'' ایسگارڈ نے شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا۔

’’کیوں؟ کیا تم ساتھ ساتھ نہیں ہو؟‘‘ سبرینہ اس کی بات سن کر الجھ گئی تھی۔

’’نہیں! ساتھ ساتھ تو ہیں لیکن ابھی تک گرل فرینڈ کا سٹیٹس نہیں ملا مجھے، ہم دونوں صرف دوست ہیں۔‘‘ ایسگارڈ نے مجھے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

’’بہت تنگ کر رہا ہے تمہارا بھائی، بہت زور لگا رہی ہوں لیکن ہاتھ ہی نہیں آ رہا۔‘‘ اس نے ہونٹ بھینچتے ہوئے کہا۔

’’کیوں بھائی جان! کیا بات ہے؟ میری کزن خوبصورت ہے، پیاری ہے اور ڈاکٹر بھی ہے۔ کسی چیز کی کمی نہیں ہے اس کے اندر تو پھر تمہیں کس چیز کی تلاش ہے؟ تمہاری دوستی کے لئے اب کوئی شکیرہ یا مائلی سائرس تو نہیں آئے گی؟‘‘ سبرینہ نے مجھے بازو سے پکڑتے ہوئے کہا۔

’’سبرینہ! بات خوبصورتی کی نہیں ہے بلکہ میں کسی سے تعلق رکھنا ہی نہیں چاہتا۔ میں کسی اور سے محبت کرتا ہوں۔‘‘ میں نے زمین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

’’ہاں! اسی سے جو تمہیں چھوڑ کر کراچی بھاگ گئی ہے اور جس نے کراچی میں شادی بھی کر لی ہے؟ دوسری شادی۔۔۔ راضی صاحب! تم دنیا کے بیوقوف ترین لڑکے ہو۔ اس دنیا میں محبت نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ ہمیں ایک دوسرے کی ضرورت ہوتی ہے، ایک دوسرے کے ساتھ رہنا اچھا لگتا ہے تو ہم اسے محبت کا نام دے دیتے ہیں۔ میں کوستے کے ساتھ رہتی ہوں۔ اس کے لئے پولیس اکیڈمی جوائین کر رہی ہوں، تو کیا مجھے کوستے سے محبت ہے؟ مجھے وہ اچھا لگتا ہے اور ہم ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ اگر کل کو وہ مجھے چھوڑ دے گا تو کیا میں گلیوں کی خاک چھاننی شروع کر دوں گی؟ نہیں! کچھ بھی نہیں ہوگا۔ پانچ چھ مہینے دکھ ہوگا اور اس کے بعد کہیں اور اچھے اور نائیس لڑکے کی تلاش کر لوں گی۔ کوئی بھی شخص کسی دوسرے کے لئے لازمی نہیں ہوتا۔ سب کے اپنے اپنے دائرے ہوتے ہیں اور یہ دائرے ایک دوسرے کے ساتھ جڑتے اور ٹوٹتے رہتے ہیں۔ اسی کو زندگی کہتے ہیں۔ رومیو اور جولیٹ کا پیار صرف کتابوں میں ملتا ہے۔ بغیر جیون ساتھی کے 60 سال سے اوپر کے ہو گے تو پھر اکیلے پن کی تلخ حقیقتوں کا پتہ چلے گا۔ بڑھاپے میں ساری عاشقی ناک کے راستے باہر نکل جاتی ہے۔ پیار اور محبت سب بچپن کے کھیل ہوتے ہیں۔ ابھی بڑے ہو گئے ہو، پیار اور محبت بھی کرو لیکن جسم کی باقی ضروریات بھی ہوتی ہیں، انہیں بھی پورا کرو۔ خدا نے ایک مرد اور عورت کی

کچھ جسمانی ضروریات بھی رکھی ہیں۔انہیں بھی سمجھنے کی کوشش کرو راضی صاحب!'' سبرینہ نے پیار سے میرے گالوں کو سہلایا اور اندر کمرے میں چلی گئی۔

''یار! تھوڑی تھوڑی محبت تو ہمیں بھی آپ سے ہونے لگی ہے۔'' ایسگارڈ نے میرے قریب آتے ہوئے کہا۔

''تمہاری چھٹی کب ختم ہو رہی ہے؟ تم نے واپس امریکہ کب جانا ہے؟'' میں نے سپاٹ لہجے میں اس سے پوچھا۔

''میری آج دن کی فلائیٹ تھی اور میں نے کینسل کروادی ہے۔نوکری سے بھی استعفیٰ دے دیا ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''نوکری سے استعفیٰ کیوں دیا؟ تم چھٹی مزید بڑھا لیتی!'' میں نے فکرمندی سے کہا۔

''نہیں یار! نوکری میں صرف شوقیہ کر رہی ہوں۔اکلوتی اولاد ہوں، اگر گھر میں بیٹھ کر ساری زندگی بھی کھاتی رہوں تو پھر بھی میرے باپ کا پیسہ ختم نہیں ہوگا۔میرے باپ کے پاس ایکٹروں کے نہیں کلومیٹروں کے حساب سے زمین ہے۔'' وہ میرے نزدیک آ گئی۔

''ایسگارڈ! تم غلط سمت میں زور لگا رہی ہو۔ساری زندگی بھی زور لگاتی رہو گی تو تب بھی میرے دل تک نہیں پہنچ سکتی۔اس بات کو جتنی جلدی سمجھو گی اتنا ہی تمہارے لئے آسان رہے گا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا اور اسے وہیں چھوڑ کر اندر کمرے میں سبرینہ کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ایسگارڈ بھی میرے پیچھے پیچھے آ گئی۔

''کیوں یار! کچھ اثر ہوا ہے اس پر میری باتوں کا یا پھر ابھی تک ویسے کا ویسا ہی ہے؟'' سبرینہ اس سے میرے متعلق پوچھنے لگی۔

''نہیں! بہت ڈھیٹ ہے۔اتنی آسانی سے کہاں ماننے والا ہے۔'' اس نے میرے ساتھ بیٹھتے ہوئے کہا۔

رات کو کھانا کھانے کے بعد سبرینہ واپس چلی گئی لیکن ایسگارڈ یہیں رہ گئی۔ وہ پکی پکی ادھر شفٹ ہو گئی تھی۔ اگلے ایک ہفتے تک وہ مسلسل مجھے پگھلانے کی کوشش کرتی رہی۔ اس بار سبرینہ بھی اس کے ساتھ مل گئی تھی۔ اس نے اکیڈمی سے ایک ہفتے کی چھٹی لے لی تھی۔ میری جگہ پر کام شکیل بھائی نے سنبھال لیا تھا اور مجھے مکمل طور پر چھٹی مل گئی تھی۔ میں سارا دن ایسگارڈ اور سبرینہ کو سنبھالتا رہتا۔ سبرینہ رات کو کوستے کے ساتھ شہر چلی جاتی اور صبح آجاتی لیکن ایسگارڈ رات کو میرے ساتھ ہی سوتی تھی۔

سبرینہ نے ایسگارڈ کو میری زندگی میں لانے کا پکا تہیہ کر لیا تھا۔ وہ صحیح معنوں میں ایک بہن ہونے کا حق ادا کر رہی تھی۔ جو اپنے بھائی کو محبت کی دلدل سے باہر نکال کر ایک نئی زندگی شروع کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میرا ہر آنے والا دن مشکل سے مشکل ترین ہوتا جا رہا تھا۔ میں ان دونوں عورتوں کو اپنے لئے اتنا فکر مند دیکھتا تھا تو کھول کر رہ جاتا تھا۔ ایسگارڈ نے نوکری سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ سبرینہ بھی مزید چھٹی کی درخواست دے رہی تھی اور درخواست منظور نہ ہونے کی صورت میں پولیس اکیڈمی چھوڑ دینے کی باتیں کر رہی تھیں۔ وہ دونوں اب ہر طرح سے مجھے بلیک میل کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

مجھے ایسگارڈ کی بجائے سبرینہ کی فکر تھی۔ اس نے مجھے بھائی بولا تھا اور اپنے بھائی کے لئے وہ اپنے خواب (پولیس اکیڈمی) سے دستبردار ہو رہی تھی۔ میری وجہ سے اس کی اپنی زندگی متاثر ہو رہی تھی۔ میں ایمان کی جگہ کسی اور کو نہیں دے سکتا تھا اس لئے میں نے ایک بڑا فیصلہ کر لیا۔ میں نے ڈیرے کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں خاموشی سے ان سب کو چھوڑ کر چلا جاتا تو پیچھے کچھ دن تک وہ سب نارمل ہو جاتے۔ ویسے بھی میں پکا ادھر رہنے کے لئے تو نہیں آیا تھا۔

مجھے آگے امریکہ جانا تھا۔ میں یونان کے کسی اور شہر میں چلا جاتا اور ادھر کام کرنے لگتا۔ یونان سے امریکہ کی کوئی گیم نہیں نکلتی تھی۔ میں یہاں سے اب فرانس جانا چاہتا تھا۔ فرانس سے کینیڈا کی گیم ہوتی تھی۔ اگر میں کینیڈا پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا تو ادھر سے امریکہ جانا انتہائی آسان تھا۔ کینیڈا اور امریکہ کے درمیان کوئی سخت بارڈر نہیں تھا۔ کینیڈا سے امریکہ جانا ایسے ہی تھا جیسے ایک شہر سے دوسرے شہر جانا۔ دونوں ملکوں کے شہری ایک دوسرے کے ملک میں بغیر ویزے اور پاسپورٹ کے آتے جاتے تھے۔ میں نے ڈیرے کو چھوڑنے کا پکا ارادہ کیا اور رات ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

رات کو گیارہ بجے تھیوا شہر سے ایک ٹرین سلونیکی کے لئے نکلتی تھی۔سلونیکی یونان کا دوسرا بڑا شہر تھا۔ مجھے یہاں آسانی سے کام مل سکتا تھا۔یہ تھیوا سے 421 کلومیٹر شمال کی طرف ہے۔سلونیکی سے صرف 80 کلو میٹر دور بلغاریہ کا بارڈر ہے۔میں رات کو ساڑھے دس بجے گھر سے نکلتا تو بڑے آرام سے گیارہ بجے سے پہلے تھیوا کے ٹرین اسٹیشن پر پہنچ سکتا تھا۔موریکی گاؤں ڈیرے سے صرف 10 منٹ کے فاصلے پر تھا۔اگر میں سوا دس بجے ٹیکسی کو فون کرتا تو ٹھیک ساڑھے دس بجے پہنچ جاتی۔ میں اسے رستے سے ہی لے لیتا اور اسٹیشن پہنچ جاتا۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد ہم سب اکٹھے فلم دیکھنے لگے۔میں بیڈ پر لیٹا ہوا تھا اور ایسگارڈ میرے سینے پر سر رکھ کر لیٹی ہوئی فلم دیکھ رہی تھی۔چپس کا کھلا ہوا پیکٹ اس کے سامنے پڑا ہوا تھا اور وہ وقفے وقفے سے اس سے چپس نکال کر کھا رہی تھی۔تقریباً 10 بجے کے قریب میں کھڑا ہو گیا۔

''کدھر جا رہے ہو؟'' ایسگارڈ نے مجھے اٹھتے ہوئے دیکھا تو پوچھنے لگی۔

''یار کہیں بھی نہیں جا رہا ہوں، واش روم جا رہا ہوں۔وہ بھی اب تم سے اجازت لینا پڑتی ہے۔'' میں نے مصنوعی غصے سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں نہیں یار! آپ کوئی ہمارے غلام تھوڑی ہیں۔غلام تو ہم آپ کے ہیں۔آپ کی ایک نظر کے غلام۔۔۔راضی صاحب! آپ سے محبت سی ہو گئی ہے۔ایک پل کے لئے بھی جدا ہوتے ہو تو دل کو کچھ ہونے لگتا ہے۔پتہ نہیں تم نے مجھ پر کونسا جادو کر دیا ہے۔'' وہ لگاتار بولے جا رہی تھی۔کمرے میں موجود باقی لڑکے اس کی بات سن کر مسکراتے رہے اور میں خاموشی سے باہر آ گیا۔

باہر آ کر میں نے جلدی جلدی کپڑے تبدیل کئے۔میرے پاس 400 یورو کے قریب نقد رقم موجود تھی۔اس کے علاوہ بینک میں کوئی 8 ہزار یورو سے اوپر رقم تھی۔ATM کارڈ کی مدد سے میں کہیں سے بھی پیسے نکلوا سکتا تھا۔سوا دس بجے کے قریب میں نے کپڑے تبدیل کر لئے تھے اور ٹیکسی کے لئے فون کر دیا۔ میں نے انہیں سڑک پر پہ آنے کا کہا تھا۔میں آہستہ آہستہ سڑک پر شہر کی طرف چلنے لگا۔10 منٹ کے اندر

اندر ہی ٹیکسی آ گئی تو میں اس کے اندر بیٹھ گیا۔ میں کمرے میں جانوروں کو چارہ وغیرہ ڈالنے کا کہہ کر آیا تھا۔

آدھے گھنٹے تک کسی نے بھی میری غیر موجودگی کا نوٹس نہیں لینا تھا اور جب تک انہیں میری غیر موجودگی کا احساس ہوتا اور وہ مجھے ڈھونڈنے کی کوشش کرتے تب تک میں تھیوے سے نکل جاتا۔ ٹرین اگر ایک بار تھیوے سے نکل جاتی تو پھر اس کے بعد وہ کبھی بھی مجھے ڈھونڈ نہیں سکتے تھے۔ میں نے تھیوے اسٹیشن پر اتر کر ٹیکسی کو کرایہ ادا کیا اور سلونیکی کی ٹکٹ لے کر ٹرین کا انتظار کرنے لگا۔

ٹھیک گیارہ بجے ٹرین آئی تو میں اس کے اندر بیٹھ گیا۔ 420 کلومیٹر کا یہ سفر ٹرین 6 گھنٹوں میں طے کرتی تھی۔ یہ رات کی آخری ٹرین تھی اور ہر اسٹیشن پر رکتی ہوئی جاتی تھی اور اس کا کرایہ بھی باقی ٹرینوں سے انتہائی کم تھا۔ میں نے ٹرین کے اندر ایک خالی سیٹ تلاش کی اور اس پر بیٹھ کر سر سیٹ کی پشت سے لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

میں ایک بار پھر ایک نئے سفر پر نکل پڑا تھا۔ میں پچھلے سات سالوں سے بھاگتا پھر رہا تھا۔ منزل ابھی بھی بہت دور تھی۔ پتہ نہیں اور کتنے سال اس منزل کے لئے بھاگنا پڑ سکتا تھا۔ مجھے کوئی پتہ نہیں تھا لیکن میں پھر بھی بھاگ رہا تھا۔ ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف اور ایک ملک سے دوسرے ملک کی طرف۔۔۔ ایمان کی محبت مجھے کہیں بھی آرام سے بیٹھنے نہیں دے رہی تھی۔ سبرینہ کہتی تھی رومیو اور جولیٹ کا پیار صرف کتابوں میں ملتا ہے۔ وہ معصوم تھی عشق کی راہوں پر ابھی اس نے چل کر نہیں دیکھا تھا۔ جب ہر چیز گھر میں آسانی سے مل جائے تو پھر ایسی ہی سوچ جنم لیتی ہے۔ دنیا میں ابھی بھی رومیو اور جولیٹ والی داستانیں پائی جاتی ہیں۔ سبرینہ اور ایسا گارڈ نے مجھے سمجھنے میں غلطی کر دی تھی۔ ہر شخص ہی مجھے سمجھنے میں غلطی کر دیتا تھا۔

ٹرین صبح 5 بجے کے قریب سلونیکی سٹیشن پر اتری تو میں ٹرین سے اتر کر باہر آ گیا۔ ٹرین سٹیشن سلونیکی شہر کے تقریباً درمیان میں تھا۔ ابھی صبح کے 5 بجے تھے۔ میں شہر کے اندر گھومنے لگا۔ میرے پاس ریڈ کارڈ تھا اس لئے پولیس کا کوئی خوف نہیں تھا۔ ویسے بھی اب یونان کے حالات ٹھیک ہو گئے تھے اور جرمنی نے مہاجرین کو لینا شروع کر دیا تھا۔ وہ مہاجرین کے اوپر بے پناہ خرچ کر رہا تھا۔ جرمنی کے اندر رہائش اور

کھانا پینا سب فری میں گورنمنٹ دے رہی تھی۔اس کے علاوہ فی مہاجر 350 یورو دیتی تھی۔

لڑکے یونان چھوڑ کر جرمنی کی طرف جانا شروع ہو گئے تھے۔ یونان میں کھیتی باڑی کا کام انہی مہاجرین کے بل بوتے پر قائم تھا۔مہاجرین کے جرمنی کی طرف نقل مکانی کی وجہ سے یونانی مارکیٹ میں مزدور کی قلت ہونے لگی تھی تو پولیس نے بھی نرمی کر دی تھی۔ پولیس والے روک کر صرف کارڈ چیک کرتے تھےاوراسی وقت چھوڑ دیتے تھے۔

آٹھ بجے کے قریب شہر کے اندر کام شروع ہونے لگا۔دکانیں اور فیکٹریاں کھلنے لگیں تو میں بھی کام کا پتہ کرنے لگا۔شہر میں دکانوں اور فیکٹریوں پر کام ہمیشہ واقفیت کے بل بوتے پر ملتا ہے۔کسی انجان لڑکے پر کبھی بھی کوئی مالک اعتبار نہیں کرتا۔میں 12 بجے تک مسلسل کام کی تلاش میں گھومتا رہا لیکن کہیں بھی کام نہ مل سکا۔میں نے بس کی چھوٹی ٹکٹ لی (یہ ڈیڑھ گھنٹے کی ٹکٹ ہوتی ہے جو مین شہر اور اس کے آس پاس کے چھوٹے چھوٹے دیہات کے لئے ہوتی ہے۔آپ ایک بار ٹکٹ کو پنچ کر کے ڈیڑھ گھنٹے تک کہیں بھی آ جا سکتے ہیں)اوراپنے سامنے سے گزرنے والی ایک بس میں بیٹھ گیا۔

یہ بس شہر سے باہر کی طرف جا رہی تھی۔شہر کے اندر کام تھوڑا مشکل سے ملتا تھا اس لئے میں نے مضافات میں سبزی کا کام تلاش کرنے کا ارادہ کرلیا تھا۔تقریباً آدھے گھنٹے کے سفر کے بعد بس اپنے آخری سٹاپ لگادہ (LAGKADAS) لے آئی۔سلونیکی کے مضافات میں 20 ہزار کی آبادی والا یہ ٹاؤن سلونیکی شہر کا ہی حصہ ہے۔سرسبز پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے ٹاؤن سے باہر بھیڑوں کے بہت سے فارم تھے۔

بھیڑوں کا کام بہت سخت ہوتا ہے۔جس لڑکے کو بھی شہر میں کام نہیں ملتا ہے وہ ادھر آ جاتا ہے۔مہینہ دو مہینے کام کرتا ہے، کچھ پیسے اکٹھے کرتا ہے اور بھاگ جاتا ہے۔اس کام میں کوئی چھٹی نہیں ہوتی ہے۔صبح 5 بجے اٹھ کر پہلے بھیڑوں کا دودھ نکالا جاتا ہے اور پھر ان کو لے کر پہاڑوں کی طرف لے جاتے ہیں۔بھیڑیں سارا دن انہی پہاڑوں پر چرتی رہتی ہیں۔ یہاں لاتعداد چھوٹی چھوٹی جھلیں ہیں اس لئے پانی کا کوئی مسئلہ نہیں

ہوتا۔ رات کو دس بجے کے قریب ایک بار پھر دودھ نکالا جاتا ہے۔ ایک ہی ملازم تین سو سے اوپر بھیڑوں کو سنبھال لیتا ہے۔

مالک صرف صبح شام دودھ نکالنے کے لئے آتا ہے۔ لڑکے کے لئے کھانا بھی وہ گھر سے لے کر آتا ہے۔ صبح شام بھیڑیں ہی بھیڑیں ہوتی ہیں۔ رات کو دس بجے چھٹی ہوتی ہے تو پھر کسی اور چیز کا ہوش ہی نہیں رہتا۔ بندہ ایک سال کے اندر ہی تقریباً نیم پاگل ہو جاتا ہے۔ یہاں پیسے بہت بنتے ہیں۔ مالک تقریباً 700 سے لیکر 900 یورو تک تنخواہ دیتا ہے اور کوئی اضافی خرچہ نہیں ہے۔ یہ پاکستانی ایک لاکھ روپے سے اوپر بنتے ہیں۔ کھانا تو مالک لا ہی دیتا ہے، ملازم کے کپڑے بھی مالک گھر سے دھلوا کر لاتا ہے۔

میں ٹاؤن سے باہر نکل کر ان ڈیروں کی طرف چل پڑا۔ تین چار ڈیروں سے پتہ کر کے آخر میں ایک ڈیرے پر کام تلاش کرنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ مالک کا لڑکا 3 دن پہلے کام چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ مالک بوڑھا آدمی تھا۔ وہ بھیڑوں کو باہر پہاڑیوں پر چرانے کے لئے نہیں لے جا سکتا تھا اس لئے اندر ہی خشک چارا ڈال رہا تھا۔ وہ ابھی تک نیا لڑکا تلاش نہیں کر سکا تھا۔

''کالی میرا فندیکو! ایغو تھیلی دلیا؟'' میں نے گریکی زبان میں اسے سلام کر کے کام کا پوچھا تو وہ مجھے سر سے لے کر پاؤں تک دیکھنے لگا۔ پانچ فٹ آٹھ انچ قد کے ساتھ میرا وزن اس وقت صرف 57 کلوگرام تھا۔

''کام کرلو گے؟ ذرا مشکل کام ہے۔'' میرا جسم دیکھ کر وہ تذبذب کا شکار ہو گیا تھا۔

''جی فندیکو! کرلوں گا۔ میں پہلے بھی یہ کام کر چکا ہوں، مجھے اس کام کا تجربہ ہے۔'' میں نے اطمینان سے اسے جواب دیا۔

''پہلے کدھر کر چکے ہو؟'' اس نے اگلا سوال کر دیا۔

''تھیوا میں کر چکا ہوں۔ اس کے علاوہ میں پاکستان میں بھی یہی کام کرتا تھا۔'' مجھے رات سے پہلے پہلے کام کی تلاش تھی، میں فارغ نہیں بیٹھ سکتا تھا بلکہ مجھے فارغ بیٹھنا آتا ہی نہیں تھا۔ سخت سے سخت ترین کام بھی مجھے تھکنے نہیں دیتا تھا۔

''ٹھیک ہے، ادھر آؤ! مجھے ایک بار بھیڑوں کا دودھ نکال کر دکھاؤ اس کے بعد پیسوں کی بات کر لیتے ہیں۔'' وہ مجھے لے کر اندر باڑے کی طرف لے گیا۔

اندر آ کر اس نے ایک بھیڑ پکڑی اور اسے لے کر دودھ نکالنے والی جگہ پر لے گیا۔ یہ کچھ صاف جگہ تھی۔ باڑے کے اندر پورشن بنے ہوئے تھے۔ وہ ساری بھیڑوں کو ایک پورشن میں اکٹھا کرتا جس کے ایک سرے پر چھوٹا سا راستہ ہوتا۔ ساری بھیڑیں ایک ایک کر کے ادھر سے ہی نکلتی تھیں۔ وہ بھیڑ کو پکڑتا، اس کا دودھ نکالتا اور دوسرے پورشن میں چھوڑ دیتا۔

بھیڑ اور بکری یہ چھوٹا جانور بہت سمجھدار ہے۔ یہ دودھ نکلوانے کے لئے خود بخود پاس آتا ہے۔ میں نے مالک کے ہاتھ سے بھیڑ پکڑی اور ایک برتن پکڑ کر اس کا دودھ نکالنے لگا۔ یہ دودھ دینے والی بھیڑیں ہوتی ہے۔ اوسطاً ایک ٹائم کا ایک کلو کے قریب دودھ ہو جاتا ہے۔ یہ خالص اور مہنگی نسل کی نہیں ہوتی ہیں ورنہ خالص نسل کی بھیڑیں 4 کلو سے اوپر دودھ بھی دے جاتی ہیں۔ میں نے تیزی سے بھیڑ کا دودھ نکالا تو وہ دوسری بھیڑ پکڑ کر لے آیا۔ میں نے اس کے سامنے 5 بھیڑوں کا دودھ نکالا۔ اس کے بعد وہ مجھے باہر لے کر آ گیا۔ میری دودھ نکالنے میں مہارت سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ میں اس کام کو جانتا ہوں۔ وہ تسلی کے لئے مزید 10 منٹ تک مختلف سوالات کرتا رہا اور بالآخر وہ کام دینے پر راضی ہو گیا۔

''ٹھیک ہے! میں کام دینے کے لئے تیار ہوں، پیسوں کی بات کر لیں۔ مہینے کے کتنے پیسے لو گے؟ اس سے پہلے جولڑ کا میرے پاس کام کرتا تھا اسے میں 600 یورو دیتا تھا۔'' اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا تو میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔ میرا کام اسے پسند آ گیا تھا اور اسے بندے کی ضرورت بھی تھی۔

''آپ 600 یورو دیتے تھے اسی لیے وہ کام چھوڑ کر چلا گیا۔ مزدور کو اس کی صحیح تنخواہ دو گے تو وہ کام نہیں چھوڑے گا۔ مجھے آٹھ سو یورو چاہئیں۔'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اوہو! 800 یورو بہت زیادہ ہیں۔ میرے پاس صرف 200 بھیڑیں ہیں اور کام بہت زیادہ نہیں ہے۔ روزانہ صبح شام کا کھانا بھی میں گھر سے لا کر دے جایا کروں گا اور تمہارے ساتھ مل کر دودھ بھی نکال دیا

کروں گا۔'' وہ پیسے کم کروانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''دودھ سب مالک مل کر نکلواتے ہیں اور کھانا بھی گھر سے آتا ہے۔ پانچ بجے سے لے کر 10 بجے تک اگر آپ بھیڑیں چرواؤ گے تو کھانا بنانے کا ٹائم ہی نہیں بچتا۔ٹھیک ہے! آپ کی مرضی ہے، میں باقی ڈیروں سے پتہ کر لیتا ہوں۔'' میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

''ٹھہرو! تم کام جانتے ہو، میں تمہیں پہلے مہینے 700 یورو دوں گا۔اس کے بعد پچاس پچاس کر کے تین مہینوں میں آٹھ سو کر دوں گا۔ اس نے مجھے روکتے ہوئے کہا۔لیکن میرا ارادہ آٹھ سو کروانے کا تھا۔ صرف ایک مہینہ ہی میں اس کے پاس کام کرتا تو اگلے مہینے 900 یورو کا بول دیتا۔اس کے پاس دوسو بھیڑیں تھیں۔ وہ دودھ سے مہینے کا 30 ہزار یورو سے اوپر کماتا تھا اور مزدور کو 800 یورو دینے میں بھی اسے تکلیف ہو رہی تھی۔ بھیڑیں سارا دن پہاڑوں پر ہی چرتی رہتی ہیں۔صرف سردیوں کے چار مہینے ہی انہیں شیڈ میں خشک چارا دیا جاتا ہے۔اوسطاً مہینے کا 10 ہزار یورو بھی خرچ نہیں آتا۔

''سوری فندیکو! میں دوسرے ڈیروں سے پتہ کر لیتا ہوں۔آپ کا بہت شکریہ!'' میں اٹھ کر جانے لگا تو اس نے 750 کر دیا لیکن میں اڑ گیا اور آخر کار وہ 800 یورو پر ہی مان گیا۔

ابھی تو دن گزر چکا تھا اور بھیڑوں کو باہر لے جانے کا ٹائم نہیں تھا۔اس لئے مالک مجھے ڈیرے کا کام سمجھانے لگا۔ میں نے اس کے ساتھ مل کر سارے ڈیرے کا چکر لگایا۔اس کے بعد اس نے مجھے وادی میں بھیڑیں چرانے کی جگہ بتائی جدھر جدھر میں بھیڑیں لے جا سکتا تھا۔اس کے علاوہ اس نے مجھے دو مختلف جھیلیں بھی بتائی جدھر ان کو پانی پلانا تھا۔رات کو میں نے مالک کے ساتھ مل کر بھیڑوں کا دودھ نکالا اور پھر ڈیرے پر ہی موجود ایک چھوٹے سے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔

دوسرے دن مالک صبح ساڑھے پانچ بجے کے قریب آیا۔ہم دونوں نے مل کر پہلے بھیڑوں کا دودھ نکالا اور پھر انہیں لے کر وادی میں چلے گئے۔مالک پہلے دن میرے ساتھ ساتھ ہی رہا۔وہ مجھے مختلف جگہیں دکھاتا رہا جہاں میں بھیڑیں چرا سکتا تھا۔ یہاں سانپوں کی بہتات تھی۔ یہ سانپ بے ضرر تھے لیکن پھر بھی

احتیاطی طور پر لمبے بوٹ پہنے جاتے تھے۔ سارا دن پہاڑوں پر بھیڑوں کے پیچھے پیچھے چلنا نارمل بوٹوں کا کام نہیں تھا۔ سادا بوٹ بہت جلدی ٹوٹ جاتے تھے۔ اس کے علاوہ بارش کا پانی بھی کھڑا ہوتا تھا اور لمبے بوٹ ہی ادھر کام آتے تھے۔ مالک نے مجھے بوٹوں کی ایک جوڑی دے دی تھی جنہیں میں نے پہنا ہوا تھا۔

بارہ بجے کے قریب ہم ایک چھوٹی سی جھیل پر بھیڑوں کو لے کر آ گئے۔ یہاں بھیڑیں پانی پی کر بیٹھ گئیں۔ وہ سارا دن چرتے چرتے تھک گئی تھیں۔ اب دو تین گھنٹے ادھر ہی بیٹھی رہتیں۔ بھیڑیں ہمیشہ گروپ میں رہنا پسند کرتی ہیں۔ اکیلی بھیڑ کبھی بھی ادھر ادھر نہیں ہوتی ہے۔ جس وقت بھیڑیں آرام کر رہی ہوں تب انہیں چھوڑ کر نہیں جا سکتے ہیں لیکن ادھر ہی کسی درخت کے سائے میں لیٹ کر دو تین گھنٹے آرام ضرور کر سکتے ہیں۔ مالک نے مجھے سارا دن ساتھ رہتے ہوئے تمام کام سمجھا دیئے تھے اور رات کو دودھ نکالنے کے بعد وہ گھر چلا گیا۔ دوسرے دن سے میں نے اکیلے ہی جانا تھا۔

میں اس کام کو پہلے سے ہی جانتا تھا اس لئے مجھے کوئی پرابلم نہیں ہوئی اور میں نے آسانی سے سارا کام سنبھال لیا۔ ایتھنز میں خلیل بھائی اور شفاقت جبکہ تھیوے میں سارے لوگ ہی یاد آتے تھے لیکن میں نے ان سے کوئی رابطہ نہیں رکھا۔ مجھے ان کے ساتھ رابطہ رکھنا بھی نہیں تھا۔ میں ایسگارڈ سے بچنا چاہتا تھا۔ میرے دل میں کسی کے لئے بھی محبت کے کوئی جذبات نہیں تھے۔ وہ نادان ڈاکٹر ایسے ہی مجھ سے دل لگانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مجھے سبرینہ بھی یاد آتی تھی۔ پردیس میں اس معصوم سی لڑکی نے مجھے کبھی بھی اکیلے محسوس نہیں ہونے دیا تھا۔ وہ ایک بہن کی طرح ہی میرا خیال رکھتی تھی۔ وہ بہت پیاری تھی، جس نے ہر پل میرا ساتھ دیا تھا۔ میں نے اس معصوم لڑکی کا بھی دل توڑ دیا تھا۔ میں ان سب کو چھوڑ کر آ گیا تھا لیکن شاید یہی ہم سب کیلئے اچھا تھا۔ دس پندرہ دن تک وہ مجھے تلاش کرتے اس کے بعد ایسگارڈ واپس امریکہ چلی جاتی تو حالات معمول پر آ جاتے۔ وہ بھی مہینے دو مہینے تک سب کچھ بھول کر کسی دوسرے لڑکے سے دوستی لگا لیتی۔ یہ یورپ تھا یہاں ایسی ہی محبتیں ہوتی ہیں۔ کوئی بھی کسی کے لئے نہیں مرتا ہے بلکہ سب اپنے لئے جیتے ہیں۔

میرا ارادہ یہاں دو مہینے کام کرنے کا تھا۔ دو مہینے تک حالات ٹھیک ہو جاتے تو پھر ایک بار تھیوے فون کر لیتا اور واپس چلا جاتا۔ ایسگارڈ بہن تھی میری، اگر دل سے اس سے معافی مانگتا تو وہ بھی معاف کر دیتی۔

یہاں صبح سے شام تک بھیڑوں کے ساتھ رہنا پڑتا تھا جبکہ مجھے شہر میں رابطہ رکھنا تھا تاکہ میں آگے جرمنی یا فرانس کے لئے کوئی ایجنٹ تلاش کرسکتا۔ میں نے ارادہ تو بہت زیادہ کیا ہوا تھا، پروگرام بہت لمبا بنایا ہوا تھا لیکن مجھے یہاں صرف ایک مہینہ ہی رہنا نصیب ہوا۔

میں مالک سے ایک مہینے کی تنخواہ لے کر اسے بینک میں ڈالنے کے لئے ''لگادے'' آیا۔ میں نے بینک میں پیسے جمع کروائے اور باہر نکلا تو پولیس والوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ انہوں نے مجھے روک کر کاغذ دکھانے کا کہا۔ میرے پاس ریڈ کارڈ (یونان میں رہنے کا پرمٹ) موجود تھا۔ میں نے اسے ریڈ کارڈ دکھایا تو پولیس والے میرے ریڈ کارڈ کا سیریل نمبر تھانے میں لکھوانے لگے۔ تھانے سے یہ سیریل نمبر ایتھنز کے مرکزی امیگریشن آفس جاتا ہے اور وہاں سے تصدیق ہونے کے بعد یہ لوگ چھوڑتے ہیں۔ یہ ٹوٹل 10 منٹ کا پراسس ہوتا ہے۔ امیگریشن والے ہماری فائل چیک کرتے ہیں اور اگر ہمارا کارڈ ایکسپائر ہوگیا ہو، کوئی جرمانہ وغیرہ ہو یا پھر کوئی اور مجرمانہ سرگرمی ہو تو پولیس والے پکڑ لیتے ہیں۔ اگر سب کچھ کلیئر ہو تو وہ چھوڑ دیتے ہیں۔ میرے ریڈ کارڈ پر کچھ بھی نہیں تھا۔ میرا کوئی مجرمانہ ریکارڈ یا جرمانہ نہیں تھا اس لئے میں اطمینان سے کھڑا رہا۔ تقریباً 5 منٹ بعد ہی ان کو وائرلیس پر پیغام آ گیا۔ انہوں نے پیغام سنا اور اسی وقت مجھے ہتھکڑی لگادی۔ شاید کوئی مسئلہ ہو گیا تھا۔

''سوری رضوان صاحب! آپ کو تھانے لے جانا پڑے گا۔ زیادہ سیریس معاملہ نہیں ہے بس آپ کی فیکس واپس نہیں آئی ہے۔ تھانے میں جا کر ایک بار پھر فیکس بھیجیں گے اگر آپ کے پاس اصل ریڈ کارڈ ہے تو آپ کو پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ چار پانچ گھنٹے تک چھوڑ دیں گے۔'' انہوں نے مجھے کار میں بٹھایا اور تھانے لے آئے۔

پولیس اسٹیشن لگادے ٹاؤن کے اندر ہی دو گلیاں چھوڑ کر تھا۔ پولیس کی کار دو منٹ میں ہی مجھے تھانے لے کر آ گئی۔ یہاں آ کر انہوں نے میری تلاشی لی اور میری جیب سے موبائل نکال کر مجھے سیل میں بند کر دیا۔ میرا ریڈ کارڈ انہوں نے پہلے ہی سے رکھ لیا تھا۔ سیل کے اندر دو پاکستانی اور ایک انڈین بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے ہاتھ ملایا اور ایک کونے میں جا کر بیٹھ گیا۔ مجھے اب انتظار کرنا تھا اور یہ انتظار لمبا ہوتے

ہوتے دو گھنٹے سے زیادہ ہو گیا۔ میرا مالک مجھے ڈیرے پر نہ پا کر فون کرتا رہا تھا لیکن میرا موبائل بند تھا۔

یہاں لگا دے میں ایک ہی تھانہ تھا۔ جب میں دو گھنٹے تک ڈیرے پر نہ پہنچا تو وہ میرا پتہ کرنے تھانے آ گیا۔ اس نے تھانہ انچارج سے کچھ دیر بات کی اور پھر میری طرف آ گیا۔ میں مالک کو دیکھ کر مطمئن ہو گیا اور اٹھ کر دروازے کی سلاخوں کے نزدیک آ گیا۔

''ہاں بھئی رضوان صاحب! کیا حال ہے؟'' اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''پولیس تھانے میں کیسا حال ہوتا ہے؟'' میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

''کیا کہہ رہے ہیں پولیس والے۔۔۔کتنی دیر تک چھوڑ دیں گے۔'' میں اپنے مالک سے پوچھنے لگا۔

''یہ مزید چار گھنٹے تک رکھیں گے، ابھی انہوں نے تمہاری فیکس بھیجی ہے۔ پوری انکوائری ہونے میں تین چار گھنٹے تو لگ جاتے ہیں۔'' اس نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''تسلی رکھو! کوئی بات نہیں۔ زیادہ پریشان مت ہونا، میں ڈیرے کا ایک چکر لگا کر اور بھیڑوں کو باڑے میں بند کر کے پھر آ جاتا ہوں۔ تب تک امید ہے تمہاری فیکس آ جائے گی۔'' انہوں نے مجھے تسلی دی اور واپس چلے گئے۔

میں واپس کمرے کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ مالک شام کو بھیڑوں کو ڈیرے پر بند کر کے آیا لیکن میری امیگریشن آفس سے فیکس واپس نہیں آئی تھی۔ مالک تھانے والوں سے لڑنے لگا۔ وہ وکیل لے کر آنے کا کہہ رہا تھا لیکن تھانے والوں نے انہیں منع کر دیا۔ انہوں نے مزید آدھا گھنٹہ مانگا تو مالک تھانے سے باہر نکل کر ایک کیفے ٹیریا میں جا کر بیٹھ گیا۔ وہ آدھا گھنٹہ پورا کر کے پھر آ جاتا۔ مالک میرے کام سے بہت خوش تھا۔ میرے ساتھ اس کی آٹھ سو یورو میں بات ہوئی تھی لیکن اس نے پہلی بار ہی 900 یورو دے دیا تھا اور اگلے مہینے سے پکی ایک ہزار تنخواہ دینے کی بات کی تھی۔

میں صرف بھیڑیں چراتا ہی نہیں تھا بلکہ ان چھوٹے چھوٹے معصوم جانوروں سے محبت بھی کرتا تھا۔

رات کو دودھ دھونے کے بعد کمرے میں جا کر سوتا نہیں تھا۔ میں پانی گرم کر کے ان بھیڑوں کے پاؤں دھوتا تھا۔ میں بھیڑوں کے نومولود بچوں کی نشوونما اور ان کا صحیح طریقے سے خیال رکھتا تھا۔ صرف ایک مہینے میں ہی مالک نے مجھے پہچان لیا تھا اور اس نے بغیر کہے ہی میری تنخواہ بڑھا دی تھی۔ ابھی بھی وہ باہر کیفے ٹیریا میں بیٹھ کر انتظار کر رہا تھا۔

ابھی صرف پندرہ منٹ ہی گزرے تھے جب ایک پولیس والا سیل کی طرف آیا۔ اس کے پیچھے پیچھے کوستا، سبرینہ اور ایسگارڈ تینوں ہی آ رہے تھے۔ مجھے تھانے میں انہی لوگوں کی وجہ سے پچھلے چھ گھنٹے سے روکا ہوا تھا۔ کوستے نے میرے ریڈ کارڈ کا سیریل نمبر امیگریشن آفس میں لکھوا دیا تھا۔ وہ پولیس والا تھا اور اس کی واقفیت امیگریشن آفس میں بھی تھی۔ میرا نمبر جیسے ہی امیگریشن میں گیا انہوں نے فوراً کوستے کو مطلع کر دیا۔ کوستے نے ہی تھانے میں فون کر کے مجھے روکنے کا کہا تھا۔ میرے کاغذات بالکل ٹھیک تھے اور میں صرف کوستے کی وجہ سے ادھر رکا ہوا تھا۔ وہ مجھے لینے کے لیے تھیوے سے آ گئے تھے۔

پولیس والے نے لاک اپ کا دروازہ کھول کر مجھے باہر نکالا تو ایسگارڈ نے آگے بڑھ کر مجھے گریبان سے پکڑ لیا۔ میں نے ایک لمحے کے لیے صرف اس کی آنکھوں میں جھانکا اور فوراً نظریں نیچی کر لیں۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ شاید بہت زیادہ رونے یا بہت زیادہ جاگنے کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں سرخی اتر آئی تھی۔ وہ اگلے کئی لمحوں تک میرے چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔ شاید وہ بہت کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ اس سے ایک بھی لفظ نہیں بولا جا رہا تھا۔ میرے اندر اس سے نظریں ملانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی اس لیے میں مسلسل نیچے زمین کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے آہستگی سے میرا گریبان چھوڑا اور دیوار کے ساتھ پڑے ہوئے بنچ پر بیٹھ گئی۔

''سوری سبرینہ! مجھ سے غلطی ہو گئی، مجھے معاف کر دینا۔'' سبرینہ آگے آئی تو میں اس سے معافی مانگنے لگا۔

''راضی! تم بہت ہی گھٹیا انسان ہو۔۔۔ مجھے اپنے آپ پر افسوس ہو رہا ہے کہ میں نے تم جیسے گھٹیا انسان کو اپنا بھائی بنایا ہوا ہے۔ تم سب پاکستانیوں کی فطرت ہی ایسی ہوتی ہے۔ صرف اپنے بارے میں ہی

سوچتے ہو کبھی دوسروں کے بارے میں بھی سوچا ہے؟'' اس نے میرے چہرے پر تھپڑ مارتے ہوئے کہا۔

''سوری سبرینہ! میں آپ سب سے معافی مانگ رہا ہوں۔'' میں نے بے اختیار اپنے چہرے پر ہاتھ رکھ لیا۔

''بات معافی کی نہیں ہے راضی! جب تم کسی کو اپنا ہی نہیں سمجھتے تو پھر معافی کس بات کی؟ میری محبت، میرا پیار، میرا یہ، میرا وہ۔۔۔کبھی دوسروں کے بارے میں بھی سوچا ہے کہ وہ کیا احساسات رکھتے ہیں تمہارے بارے میں؟ کبھی میرے بارے یا کوستے کے بارے میں سوچا ہے؟ یہ جو پاگل سی لڑکی بیٹھی ہوئی ہے بنچ پر۔۔۔اس کے بارے میں بھی سوچا ہے یہ کسی بھی زاویے سے Phd ڈاکٹر لگ رہی ہے؟ غور سے دیکھو اس کے چہرے کی طرف! اسے کس چیز کی سزا دے رہے ہو؟ مجھ سے قسم لے لو جو پچھلے ایک مہینے سے یہ ایک بھی پل کے لیے آرام سے سوئی ہو۔'' اس نے ایسگارڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ بنچ پر بیٹھی ابھی تک میرے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ایک مہینے کی جدائی کا زخم ایک پل میں ہی بھرنا چاہتی تھی۔ میں نے اپنا رخ ایسگارڈ کی طرف موڑا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

''راضی! دوسروں کی محبت کی قدر کرو گے تو تمہیں اپنی بھی محبت مل جائے گی۔'' وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی اور باہر چلی گئی۔

''چلو راضی! گھر چلو! تھیوے میں سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔'' سبرینہ نے میرا ہاتھ پکڑا اور باہر لیکر آ گئی۔ میرا مالک باہر ہی کھڑا تھا۔کوستے نے اسے ساری بات سمجھا دی تھی۔ مالک کو میرے جانے کا دکھ تو بہت ہو رہا تھا لیکن وہ مجھے روک نہیں رہا تھا۔ میں سیدھا مالک کے پاس چلا گیا۔

''فندریکو!''

''نہیں راضی! کوئی بات نہیں ہے۔تم بہت اچھے تھے،تمہارے ساتھ کام کر کے بہت مزا آیا۔ یہ سارے تمہارے اپنے لوگ ہیں اور میں تم کو ان کے ساتھ جانے سے نہیں روکوں گا۔ یار! مزدور کا کیا ہے ایک جاتا ہے تو دوسرا آ جاتا ہے۔خوش رہا کرو!'' اس نے جیب سے بٹوا نکالا اور اس میں موجود ساری رقم

نکال کر میرے ہاتھ پر رکھ دی۔

''یہ میری طرف سے ہے۔تمہارا اپنا ڈیرا ہے، جب دل چاہے آ جانا! تمہارے لیے ہمیشہ میرے پاس کام ہوگا۔'' ہم سب گاڑی میں بیٹھے اور واپسی کا سفر شروع ہو گیا۔

ایسگارڈ کار میں میرے ساتھ پیچھے بیٹھ گئی تھی۔اس نے بیٹھتے ہی میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔شاید میرے موجود ہونے کا احساس لینا چاہتی تھی۔''دوسروں کی محبت کی عزت کرو تو اپنی محبت بھی مل جاتی ہے۔'' مجھے اس ڈاکٹر کا کہا ہوا فقرا یاد آ گیا۔میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔

''سو جاؤ یار! بہت لمبا سفر ہے۔'' میں آہستگی سے اس کی گردن اور گالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔اسے سکون ملا تو وہ چند منٹوں میں ہی میری گود میں سر رکھے سو گئی۔

سلونیکی سے تھیوا کار کا تقریباً پانچ ساڑھے پانچ گھنٹے کا سفر ہے۔ہم نو بجے رات تک ڈیرے پر پہنچ گئے۔ڈیرا ویسا ہی تھا جیسے چھوڑ کر گیا تھا۔ایک مہینے میں کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔کوستے نے ان کو فون کر دیا تھا اور وہ سارے کھانا بنا کر ہمارا ہی انتظار کر رہے تھے۔مجھے دیکھتے ہی سارے مجھ سے لپٹ گئے۔اس ایک مہینے میں جتنا مِس میں نے انہیں کیا تھا اس سے کہیں زیادہ انہیں میں یاد آتا تھا۔

دوسرے دن کوستے اور سبرینہ دونوں کی چھٹی تھی۔میں ایک مہینے کے بعد ان سے ملا تھا اور وہ مجھ سے میری داستان سننا چاہتے تھے۔ان کا اتنی جلدی اپنے گھر جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

''راضی بھائی! ایک بار اپنی کہانی سنا دو۔اتنے عرصے سے ہمارے ساتھ رہ رہے ہو لیکن تم نے کبھی اپنے ماضی سے پردہ نہیں اٹھایا۔'' سبرینہ نے CD بند کر دی اور میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

''راضی بھائی! آج ہم بھی سننا چاہتے ہیں، آخر وہ کونسی طاقت ہے جو تم کو بھاگنے پر مجبور کرتی ہے۔'' سبرینہ اصرار کرنے لگی۔

''نہیں یار! ابھی سفر سے واپس آئے ہیں۔۔۔کہانی بہت لمبی ہے، پھر کسی دن سناؤں گا۔'' میں نے

ٹالتے ہوئے کہا۔

''نہیں یار! آج کوئی تھکے گا نہیں اور نہ کوئی سوئے گا۔ آج رات سب تجھ کو ہی سنیں گے۔۔۔ میں سنوں گی۔'' ایسگارڈ نے مجھے بازو سے ہلاتے ہوئے کہا۔

میں مزید کچھ دیر انہیں ٹالتا رہا لیکن آخر کار میں نے ہار مان لی اور اپنی داستان سنانے کی ہامی بھر لی۔ اس کا نام ایمان ہے 10 سال کی تھی جب پہلی بار ہمارے گاؤں میں بِک کر آئی تھی۔ میں نے کہانی سنانی شروع کی تو پھر لگاتار بولتا ہی چلا گیا۔ میں ان کو ایک ایک بات کی تفصیل بتاتا رہا۔ محبت، نفرت، اذیت اور تڑپ سب کچھ ہی۔۔۔ میں بہاولپور سے نکلا تو کراچی آ گیا۔ نوید، نرما سے ہوتا ہوا ایران آیا تو احمد کا گاؤں یاد آ گیا۔ ارمیہ (URMIA) جھیل کے کنارے آباد وہ خوبصورت سا گاؤں بھی یاد آ گیا جس کے سرسبز پہاڑوں میں معصوم احمد کے قہقہوں کی آوازیں گونجتی تھیں۔ میتلنی (MITILINI) جزیرے کا وہ ٹھنڈا سمندر بھی یاد آیا جس کے سرد پانیوں میں احمد کا ہاتھ میرے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ صبح 6 بجے کے قریب میری کہانی ختم ہوئی تو ان تینوں کی آنکھوں میں پانی آ گیا تھا۔

''ایسگارڈ! میری اس کہانی میں ظالم اور مظلوم سب ایک دوسرے میں اس طرح الجھ گئے ہیں کہ ان کی پہچان ہی ختم ہو گی ہے۔ سبھی ظالم ہیں اور سبھی مظلوم، سزا بھی سبھی کو مل رہی ہے۔ یہ محبت بہت ظالم چیز ہے یار! میں اس سے بھاگ رہا ہوں۔ کوئی اور اس محبت کی بھینٹ چڑھے میں اس سے پہلے ہی یہاں سے چلا گیا تھا۔ تم بہت نازک ہو ایسگارڈ! محبت کی ان راہوں پر چل نہ سکو گی۔ میری آس رکھنا چھوڑ دو! میں اپنے حصے کی محبت کر چکا ہوں۔'' میں خاموشی سے اٹھا اور باہر آ گیا۔

سورج کی روشنی چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ لڑکے توریاں توڑنے کے لئے چلے گئے تھے۔ سامنے ہی کھیت تھا جہاں وہ سارے توریاں توڑتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلایا تو میں بھی ان کی طرف ہاتھ ہلانے لگا۔ ایسگارڈ اور سبرینہ دونوں میری پیچھے آ کر کھڑی ہو گئیں۔

''راضی! میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔'' ایسگارڈ نے میرے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

سبرینہ اور کوستا دونوں اس کی بات سن کر شاک میں آ گئے۔ چار دن ساتھ رہنا یا ایک دوسرے کو پسند کرنا یہ اور بات ہے لیکن شادی بہت بڑی بات تھی۔ کوئی بھی لڑکی اتنی جلدی شادی کے لئے تیار نہیں ہوتی تھی۔ وہ ڈاکٹر تھی اور اس کے والد مانٹانہ (MONTANA) کے بہت بڑے زمیندار تھے۔ دو ہزار ایکٹرز رعی زمین کے مالک۔۔۔ ان کے پاس کھیتوں پر سپرے چھڑکنے کے لئے بھی ہوائی جہاز تھا۔ جبکہ میرے پورے خاندان نے آج تک کسی ہیلی کاپٹر کو بھی نزدیک سے نہیں دیکھا تھا۔ ہمارے پورے گاؤں کی زمین ملا کر بھی 1500 ایکٹر سے زیادہ نہیں تھی جبکہ وہ دو ہزار 2000 ایکٹر کی اکلوتی وارث تھی۔ میرا اس کا کوئی جوڑ نہیں تھا۔

''نہیں ایسگارڈ! میں تم سے شادی نہیں کر سکتا، میں نے اپنی زندگی ایمان کے نام لکھ دی ہے۔ اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے۔ دنیا کی کوئی بھی عورت مجھے متاثر نہیں کر سکتی۔'' میں کھیتوں کی طرف جانے لگا تو اس نے مجھے بازو سے پکڑ لیا۔

''راضی! میں تمہیں امریکہ لے جانے کے لئے شادی کر رہی ہوں۔ اگر تم مجھ سے شادی کر لو گے تو میں تمہارے ویزے کے لئے اپلائی کروں گی۔ دو تین مہینے تک ویزا لگ جائے گا تو لیگل طریقے سے تم امریکہ جا سکو گے۔ اگر ایمان دوبارہ تمہاری زندگی میں آئی تو میں خاموشی سے پیچھے ہٹ جاؤں گی۔ ایمان کے ملنے تک تو میرے ساتھ رہو گے نا؟ میرے لئے یہ عرصہ ہی کافی ہے۔'' اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''راضی صاحب! محبت کے جن راستوں پر میں نکل آئی ہوں وہاں منزل ملتی ہے یا رستے میں ہی زندگی تمام ہوتی ہے۔ یہ وقت پر چھوڑ دیتے ہیں۔'' اس نے ایک ہاتھ سے میرے چہرے کو نزدیک کیا اور اپنے جلتے ہوئے ہونٹ میری گالوں پر رکھ دیے۔

''امریکہ جانے کی تیاری کرو یار! جنت صرف 12 گھنٹے کی فلائیٹ کے فاصلے پر ہے۔'' وہ باہر لگی ہوئی ٹوٹنی پر منہ ہاتھ دھونے لگی۔

''راضی بھائی! میرے ایک انکل وکیل ہیں، وہ ادھر ہی تھیوے میں ہوتے ہیں۔ آج چھٹی ہے، وہ گھر پر ہی ہوں گے۔ 10 بجے تک وہ اٹھ جائیں گے تو پھر چلتے ہیں۔ یہ شادی جتنی جلدی ہو اتنی ہی اچھی ہے۔ اس سے پوچھ لیں گے کہ کون کون سے کاغذات کی ضرورت پڑے گی۔'' سبرینہ نے پرجوش انداز سے کہا۔

میرے پاس شناختی کارڈ یا پاسپورٹ کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے کوئی چیز بھی نہیں بنائی تھی۔ پہلے وکیل سے مل لیتا تو پھر پاکستان ایمبسی سے شناختی کارڈ اور پاسپورٹ کے لئے اپلائی کر دیتا۔ پاکستان سے میں نے FSc کیا تھا۔ اس کی سندیں اور ب فارم گھر میں پڑا ہوا تھا۔ میں وہ وہاں سے منگوا سکتا تھا۔ شکیل بھائی نے صبح صبح اٹھ کر ہم سب کے لئے پراٹھے بنا کر رکھ دیے تھے۔ رات والا سالن بھی پڑا ہوا تھا۔ میں نے وہ سالن گرم کیا اور ہم سب اکٹھے بیٹھ کر ناشتہ کرنے لگے۔

ایسگارڈ نے امریکہ فون کر کے اپنے والد کو اپنی شادی کے بارے بتا دیا تھا۔ یہاں بچے اپنے فیصلوں کے خود مختار ہوتے ہیں۔ والدین ان پر دباؤ نہیں ڈالتے ہیں۔ ہر کام بڑی آسانی اور تیزی سے ہو رہا تھا۔ شاید میری ساری آزمائشیں ختم ہو گئی تھیں۔ 10 بجے کے قریب ہم سب وکیل کے پاس پہنچ گئے۔

''رضوان علی! آپ قانونی طور پر یونان میں شادی کر سکتے ہیں لیکن امریکہ کے ویزے کے لئے اپلائی نہیں کر سکتے ہیں۔ آپ غیر قانونی طور پر یونان میں داخل ہوئے ہیں اور آپ کو یونان میں سیاسی پناہ ملی ہوئی ہے، آپ یہاں پر شادی کر سکتے ہو۔ آپ کو یونان کا ایک سال کا ویزہ مل جائے گا لیکن امریکہ کا ویزہ آپ اسی صورت اپلائی کر سکتے ہیں جب آپ کے ہاں بچہ پیدا ہوگا۔ ویزہ لگتے لگتے بھی تین چار سال لگ جائیں گے۔ یہ بہت لمبا پراسس ہے۔'' وکیل نے میرے ریڈ کارڈ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہم دونوں سادگی سے شادی کر رہے ہیں۔'' میں ایسگارڈ کے ساتھ جسمانی تعلق نہیں رکھنا چاہتا تھا۔

''کوئی تو راستہ ہوگا نا آخر؟'' سبرینہ ان سے پوچھنے لگی۔

''نہیں! مجھے تو پتہ نہیں ہے۔ آپ ایتھنز چلے جاؤ وہاں بڑے بڑے امیگریشن کے وکیل ہیں۔ شاید وہ کوئی راستہ نکال دیں۔'' انہوں نے معذرت کے ساتھ میرا کارڈ واپس کر دیا۔

ہم وہاں سے ایتھنز آ گئے۔ سات آٹھ وکیلوں سے پتہ کروایا لیکن ہر طرف سے انکار سن کر واپس تھیوا آ گئے۔

''انکل! آخر کوئی تو راستہ ہوگا؟ یہ غیر قانونی یونان آیا ہے تو ابھی قانونی شادی کر رہا ہے۔'' ہم ایک بار پھر سبرینہ کے وکیل انکل کے پاس آ کر بیٹھے ہوئے تھے۔

''دو راستے ہیں۔۔۔ ایک، یہ پاکستان چلا جائے اور ادھر جا کر شادی کرے اور ویزے کے لئے اپلائی کرے۔ پاکستان میں جاری دہشت گردی کی وجہ سے ویزہ لیٹ ضرور ہوگا لیکن مل ضرور جائے گا۔ اگر یہ لڑکی ثابت قدم رہی تو دو تین سال کے اندر اندر ویزہ لگا کر تم امریکہ جا سکتے ہو۔''

''انکل! دوسرا راستہ کونسا ہے۔'' سبرینہ دو تین سال سن کر ہی پریشان ہوگئی تھی۔

''دوسرا راستہ نسبتاً آسان ہے۔ تم یہاں سے ڈنمارک یا سوئیزرلینڈ چلے جاؤ، ادھر جا کر شادی کرو اور میرج سرٹیفکیٹ لے کر جرمنی چلے جاؤ۔ جرمن ویزے کے لئے اپلائی کرو گے تو تمہیں ایک مہینے کے اندر اندر جرمن ویزہ مل جائے گا۔ اس جرمن ویزے کے اوپر آپ پھر امریکہ کا ویزہ حاصل کر سکتے ہو۔ یہ بہترین ہے۔ آپ ادھر سے سوئیزرلینڈ چلے جاؤ اور شادی کرو۔ چھ مہینے کے اندر اندر امریکہ۔''

''ہم سب اکٹھے ہی امریکہ جائیں گے۔ میں بھی ایک ہفتے کی چھٹی لے لوں گی۔'' سبرینہ نے خوش ہوتے کہا۔

''یہ سوئیزرلینڈ کیسے جائے گا؟ اس کے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔'' اس نے سبرینہ کو درمیان میں ٹوکتے ہوئے کہا۔

''ہاں! انکل یہ تو مسئلہ ہے، یہ سوئیزرلینڈ کیسے جائے گا؟''

''ایجنٹ 1500 یورو لیتے ہیں ہنگری جانے کا اور 500 یورو آگے جرمنی کے لئے، ٹوٹل 2000 یورو میں جرمنی جایا جا سکتا ہے۔ جرمنی سے سوئیزرلینڈ آسانی سے جایا جا سکتا ہے۔ کوئی بھی راستے میں نہیں

پوچھتا۔'' میں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں! اب تم ایجنٹوں کے ہاتھوں میں نہیں جاؤ گے۔ ساری زندگی ایسے ہی غیر قانونی بارڈر کراس کرتے رہے تو کسی دن ریل کی پٹڑی پر مرے پڑے ہو گے اور کسی کو پتہ بھی نہیں ہو گا۔'' ایسگارڈ نے جلدی سے بولتے ہوئے کہا۔

ان دنوں یونان سے جرمنی کے لئے روزانہ گیمیں نکلتی تھیں۔ سینکڑوں کی تعداد میں لڑکے بارڈر کراس کر رہے تھے اور جرمنی کی طرف جا رہے تھے۔ راستے میں افریقی لٹیرے ٹرکوں کو لوٹتے رہتے تھے۔ اکثر لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں اور یہ لوگ مارنے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔ ان کے پاس بڑے بڑے چاقو ہوتے تھے۔ بہت سے لڑکے ان کے ہاتھوں جنگل میں موت کے گھاٹ اتر گئے تھے۔ اس کے علاوہ سرنگوں میں ریل کی پٹڑی پر چلتے ہوئے لڑکے ریل کے نیچے آ جاتے تھے۔

پہاڑوں میں سرنگوں کے اندر پیدل چلنے کا کوئی راستہ نہیں ہوتا ہے۔ سرنگ کراس کرتے ہوئے اگر پیچھے سے ٹرین آ جائے تو بچنے کا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔ مقدونیا(MACEDONIA) میں سینکڑوں لڑکے ان سرنگوں کی نظر ہو گئے تھے۔ آئے دن ٹی وی پر ان لڑکوں کے مرنے کی خبریں آتی رہتی تھیں۔ ایسگارڈ مجھے ان ایجنٹوں کے ذریعے نہیں بھیجنا چاہتی تھی۔

''اور کوئی راستہ بھی تو نہیں ہے نا جرمنی جانے کا؟'' میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

صرف مقدونیا کا 160 کلومیٹر کا ایریا ہی خطرناک تھا۔ 25 ہزار مربع کلومیٹر کا یہ چھوٹا سا ملک ہی خطرناک تھا۔ یہاں کی پولیس لڑکوں کو پکڑ کر واپس یونان ڈی پوٹ کر دیتی تھی۔ اس لیے ایجنٹ چوری پیدل یہ ملک کراس کرتے تھے۔ 160 کلومیٹر کا یہ فاصلہ ایک ہفتے میں کراس ہو جاتا ہے۔ درمیان میں کوئی چالیس پچاس کلومیٹر کا سفر کاروں یا ٹرکوں میں بھی کروایا جاتا ہے۔ مقدونیا سے آگے سربیا(SARBIA) کا ملک ہے اور یہاں کوئی سختی نہیں ہے۔ ایجنٹ پوری کی پوری بس کرائے پر حاصل کرتے ہیں اور 500 کلومیٹر کا سفر سات گھنٹوں میں طے کر کے بس ہنگری کے بارڈر پر پہنچا دیتی ہے۔ اصل پرابلم صرف مقدونیا کے اندر

تھی۔مقدونیا کا راستہ بہت خطرناک تھا۔آئے دن حادثات ہوتے رہتے تھے۔

''نہیں راضی! میں تمہیں اس راستے سے جانے کی اجازت نہیں دوں گی۔اگر خدانخواستہ تمہیں کچھ ہو گیا تو میں ساری زندگی اپنے آپ کو معاف نہیں کروں گی۔بائی ائیر بھی تو ایجنٹ لیکر جاتے ہیں نا؟'' سبرینہ نے درمیان میں بولتے ہوئے کہا۔

''نہیں! بائی ائیر پہ بہت سختی ہو گئی ہے۔یہ بہت مشکل ہے اور بوٹ کی گیم بھی تقریبا ختم ہو گئی ہے۔ اٹلی کی نیوی فورس ایک بھی بوٹ کو گزرنے نہیں دیتی۔صرف ایک ہی راستہ کھلا ہوا ہے۔خطرناک ضرور ہے لیکن پہنچ رہے ہیں۔ہر روز سینکڑوں لوگ بارڈر کراس کر رہے ہیں۔'' میں نے ان کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''اور سینکڑوں ہی مر رہے ہیں۔مقدونیا کی سرنگیں خون آشام ہیں۔یہ خون پیتی ہیں۔'' ایسگارڈ نے چیختے ہوئے کہا۔

''تو پھر کیا کریں؟ اس کے علاوہ اور کوئی حل بھی تو نہیں ہے نا؟'' میں نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔

''اگر میں تمہیں اپنے ساتھ کار میں بٹھا کر لے جاؤں تو؟ میرے پاس امریکن پاسپورٹ ہے،کوئی بھی راستے میں نہیں روکے گا۔''

ہنگری سے یورپی یونین کا شینگن زون شروع ہو جاتا ہے۔یونان سے صرف چھ گھنٹے کار کی ڈرائیو، گرمیوں کے دنوں میں ہزاروں کی تعداد میں روزانہ کاریں آتی اور جاتی ہیں۔یہ موٹروے ہے جو سلونیکی سے شروع ہوتا ہے اور ہنگری آسٹریا سے ہوتا ہوا جرمنی کے شہر میونخ تک چلا جاتا ہے۔جہاں سے آگے پورے یورپ کے لئے راستے نکلتے ہیں۔سلونیکی سے کار نکلتی ہے اور دس ملکوں کے بارڈر کراتی ہوئے کسی بھی چیک پوسٹ پر رکے بغیر انگلینڈ تک چلی جاتی ہے۔یہی یورپ ہے۔پاسپورٹ اور ویزے کا تصور تک نہیں ہے ان ملکوں میں۔۔۔آپ ایک ملک کا ویزہ لو تو آپ کو یورپی یونین کے باقی 28 ملکوں کی فری انٹری مل جاتی ہے۔ایسگارڈ یہی کہہ رہی تھی۔

میں کی کار کی ڈگی میں آسانی سے سفر کر سکتا تھا۔اس کے پاس امریکن پاسپورٹ تھا۔اگر کوئی پولیس کار

اسے روک بھی لیتی تو پاسپورٹ دیکھ کر ہی چھوڑ دیتی۔ پکڑے جانیکا چانس زیرو پرسنٹ تھا لیکن پھر بھی ڈر تو تھا۔ اگر وہ پکڑی جاتی تو انسانی سمگلنگ (HUMAN TRAFFICKING) کے کیس میں اسے سات آٹھ سال کی جیل ہو سکتی تھی۔

یورپ انسانی سمگلروں کے بہت خلاف تھا اور سزائیں بھی بہت سخت تھیں۔ یہ ٹرکوں کو تو اسی وقت واپس ڈی پورٹ کر دیتے تھے لیکن اگر کوئی ڈرائیور یا ایجنٹ ان کے ہاتھ لگ جاتا تو پھر اس ڈرائیور کی زندگی تباہ ہو جاتی تھی۔ میں یہ رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔

''نہیں ایسگارڈ! یہ ناممکن ہے۔ میں اپنی زندگی کا رسک لے سکتا ہوں۔ میں گھر سے نکلا ہی مرنے کے لئے ہوں۔ موت تو نہایت آسان راستہ ہے ایمان تک پہنچنے کا۔۔۔ دنیا کی سبھی اذیتوں سے نجات مل جاتی ہے۔'' میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''نہیں راضی! تم نے ساری زندگی اپنی مرضی کی ہے، ایک بار ہماری مرضی سے بھی چل کر دیکھ لو! کچھ بھی نہیں ہو گا۔ میں سینکڑوں بار یونان سے بذریعہ کار جرمنی گئی ہوں۔ کوئی بھی راستے میں نہیں پوچھتا ہے۔ میں کار بھی جرمن سے منگوالوں گی۔ جرمنی کی نمبر پلیٹ اور سٹیکر لگا ہوا ہو گا تو مقدونیا کی پولیس کی ہمت بھی نہیں ہو گی اس کو روکنے کی، اور اگر اس خدانخواستہ انہوں نے روک بھی لیا تو میرا امریکن پاسپورٹ ہی کافی ہو گا۔'' اس نے مجھے دوبارہ بٹھاتے ہوئے کہا۔

''یار! تم سمجھ نہیں رہی ہو، یہ بہت خطرناک ہے۔ آٹھ سال کی سزا ہے اگر میں تمہاری گاڑی میں سے پکڑا گیا۔ مجھے تو وہ اسی وقت واپس یونان ڈی پورٹ کر دیں گے مگر تم انسانی سمگلنگ کے جرم میں 8 سال کے لئے جیل چلی جاؤ گی۔ 8 سال کی سزا کاٹ کر امریکہ جاؤ گی تو جوانی آدھی نکل چکی ہو گی۔ تمہاری ساری زندگی تباہ ہو جائے گی۔ حالات کی سنگینی کو سمجھنے کی کوشش کرو۔'' میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''راضی صاحب! محبت بھی کرتے ہو اور اس محبت کی توہین بھی کر رہے ہو۔ جب تم ایمان کی خاطر اپنی پوری زندگی تباہ کر رہے ہو تو پھر میں آٹھ سال بھی نہیں گزار سکتی۔ ہم امریکی لوگ اتنی جلدی کسی سے محبت نہیں

کرتے ،لیکن اگر محبت کرنے پر آجائیں تو پھر بڑے بڑے شہ زوروں کو بھی مات دے دیتے ہیں۔محبت کرتے ہوتو بہادر بنو یار! ڈر پوک کیوں بن رہے ہو؟'' اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔اس بار باقی بھی مجھ پر زور ڈالنے لگے تو میں مان گیا۔

ایسگارڈ نے اسی دن جرمنی کی ایک پرائیوٹ فرم میں فون کر کے کار کا آرڈر دے دیا اوران کا ڈرائیور دوسرے دن ہی گاڑی دے کر چلا گیا۔ یہ سفید جرمن رولکس ویگن (VW)2009 ماڈل تھی۔نمبر پلیٹ پر یورپی یونین کے ستاروں کا نشان اوران کے اندر (D) لکھا ہوا تھا۔گاڑی آگئی تو ہم نے اگلے دن ہی صبح صبح نکلنے کا ارادہ کرلیا۔ دوسرے دن صبح صبح 10 بجے کے قریب ہم تھیوا سے روانہ ہوئے اور 4 بجے کے قریب سلونیکی پہنچ گئے۔

سلونیکی سے مزید ایک گھنٹے کا سفر پولیکاسترو (POLIKASTRO) کا ہے۔اگر آپ کے پاس یونان کا رہائشی پرمٹ (RED CARD) ہے تو آپ بس کے ذریعے آسانی سے یہاں تک آسکتے ہیں۔یہ ایک چھوٹا سا ٹاؤن ہے۔سلونیکی سے ٹرین بھی اس ٹاؤن میں آتی ہے جو آگے مقدونیا اور پھر پورے یورپ جاتی ہے۔ٹرین کا سفر خطرناک ہے۔انٹرنیشنل یورپین ٹرین ہوتی ہے اس لئے سختی بھی ہوتی ہے۔صرف ایک گھنٹے کا سفر ہے اور بس سے زیادہ محفوظ ہے۔

پولی کاسترو سے بس نکلتی ہے جو آگے ایوزونی (EVZONOI) اور آخری سرحدی گاؤں چولیادیس (TSOLIADES) تک جاتی ہے۔ یہ صرف 20 منٹ کا سفر ہے۔ایجنٹ اس سفر کے لئے پیدل یا پھر پرائیویٹ گاڑیوں کا انتظام کرتے ہیں۔ پولیس مہاجرین کو پولی کاسترو سے آگے نہیں جانے دیتی۔ اس لئے ایجنٹ چوری چھپے گاڑیوں سے لڑکوں کو لیکر جاتے ہیں۔کوستا اور سبرینہ بھی علیحدہ کار میں ہمارے ساتھ ہی آگئے تھے۔ وہ دس کلومیٹر آگے آگے کار رکھتے اور اگر کہیں چیکنگ وغیرہ ہو رہی ہوتی تو وہ ایسگارڈ کو فون کر دیتے اور ایسگارڈ راستہ تبدیل کر لیتی۔

میں نے ایسگارڈ کے ساتھ بارڈر کراس کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ میں ایجنٹ کی مدد سے بارڈر کراس

کرتا اور ایجنٹ مجھے 5 کلومیٹر اندر مقدونیا میں ایک چھوٹے پٹرول پمپ پر چھوڑ دیتا۔ جہاں سے ایسگارڈ مجھے لے لیتی۔ یونانی حدود سے مقدونیا کے پٹرول پمپ تک دس کلومیٹر ٹوٹل ڈنکی تھی۔ یہ ٹوٹل 4 گھنٹے کی ڈنکی ہے۔ ہم رات کو بارا بجے ادھر سے نکلتے تو صبح صبح 4 بجے ادھر پہنچ جاتے۔ ایسگارڈ نے شام کو 7 بجے کے قریب مجھے ایجنٹوں کے پاس چھوڑا اور خود وہ سارے مقدونیا چلے گئے۔

انہوں نے جیوجیلیا (GEVGELIJA) میں ایک ہوٹل میں دو کمرے کرائے پر لئے اور ادھر رک گئے۔ 16 ہزار کی آبادی والا یہ مقدونیا کا شہر یونانی بارڈر سے صرف دو کلومیٹر دور تھا۔ ایجنٹ اس شہر کو کراس کر کے بیرونی طرف ایک پٹرول پمپ تک مجھے لیکر آتے۔ ایسگارڈ نے بھی شہر سے باہر کی طرف پٹرول پمپ سے نزدیک ہی ہوٹل کا کمرہ لیا تھا۔ رات کا سفر کرنا خطرناک تھا۔ میں رات ادھر ہی ایسگارڈ کے ساتھ گزارتا اور پھر دن کو بارہ بجے کے بعد جب ہائے پر انتہائی رش ہوتا تب ہم ادھر سے نکلتے۔

رات کو بارہ بجے کے قریب ایجنٹوں نے ہم لڑکوں کو جگایا اور ہم سب پیدل بارڈر کی طرف چلنے لگے۔ ہماری ڈنکی میں تقریباً 60 کے قریب لڑکے تھے اور تین ایجنٹ تھے۔ ہم دریائے وردار (VARDAR) کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ یہ نیم پہاڑی علاقہ تھا اور سارا علاقہ ہی فصلوں سے بھرا ہوا تھا۔ یہاں سبزی کا کام نہیں ہوتا تھا۔ زیادہ تر گندم اور تمباکو ہی کاشت ہوتی تھی۔ مکئی کے بھی بڑے بڑے کھیت تھے۔ ایک گھنٹے کے سفر کے بعد ہم بارڈر پر پہنچ گئے۔ بارڈر کے اوپر کوئی تار یا نشان نہیں تھا۔ ایسے ہی مکئی کے ایک کھیت کو کراس کر کے دوسرے کھیت میں داخل ہوئے تو ایجنٹ نے بتایا کہ ہم مقدونیا میں داخل ہو گئے ہیں۔

اس علاقے میں صرف ایک ہی سرحدی چیک پوسٹ تھی جو ہم سے کوئی دو کلومیٹر دور ایک پہاڑی چوٹی پر تھی۔ مکئی کے کھیتوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ ہم آرام سے بارڈر کراس کر گئے۔ مزید دو گھنٹے تک مسلسل سفر کرتے ہوئے ہم نے جیوجیلیا (GEVGELIJA) کراس کیا تو ایک ایجنٹ نے مجھے لیا اور گاؤں کی طرف چل پڑا۔ باقی لڑکے آگے نکل گئے اور میں اس ایجنٹ کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ ایجنٹ مختلف کچے پکے راستوں پر چلاتا ہوا مجھے پٹرول پمپ پر لے کر آ گیا۔ اس نے دس منٹ پہلے ہی ایسگارڈ کو کال کر کے بتا دیا تھا اور وہ ایک اندھیرے کچے روڈ پر کار لئے کھڑی تھی۔ ہم دونوں اس کے پاس پہنچے تو اس نے جلدی سے

آگے بڑھ کر مجھے گلے سے لگا لیا۔

''راضی! شکر ہے تم آ گئے ہو، میں بہت ڈر رہی تھی۔'' وہ مجھے گلے سے لگائے بولنے لگی۔

''ابھی ادھر سے نکلو یار! خطرہ ہے یہاں پر۔'' میں نے اسے خود سے علیحدہ کر دیا۔

''اچھا یار! میں اب چلتا ہوں۔'' ایجنٹ پاکستانی تھا۔ اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور واپس جانے لگا۔ میری ساری رقم کی ادائیگی ایڈوانس ہی ہو گئی تھی۔

''یہ تھوڑے سے پیسے رکھ لو بھائی!'' ایسگارڈ نے اسے روکا اور پرس سے پیسے نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔ اس نے پیسے لیکر ایسگارڈ کا شکریہ ادا کیا اور واپس چلا گیا۔

''پیسے تو پہلے دے دیئے تھے، اب اتنے پیسے کیوں دیئے تم نے اس کو؟'' میں اس سے پوچھنے لگا۔

''راضی! جو چیز وہ لے کر آیا ہے نا اس کے بدلے میں تو یہ معمولی سے پیسے کچھ بھی نہیں ہیں۔ یہ بہت اونچے درجے کی باتیں ہیں تم جیسے معمولی محبت کرنے والے انہیں نہیں سمجھ سکتے۔'' وہ ایک بار پھر مجھ سے گلے ملنے لگی لیکن میں نے اسے روک دیا۔

''یار جلدی سے اب ادھر سے نکلو!'' اس نے گاڑی کی ڈگی سے نئے کپڑے اور جوتے نکالے اور مجھے پکڑا دیئے۔

''کپڑے تبدیل کر لو! ہوٹل والوں کو شک نہ ہو جائے۔'' مکئی کے کھیتوں کے اندر سے گزرنے کی وجہ سے میرے سارے کپڑے اور جوتے گندے ہو گئے تھے۔

میں نے کار کی دوسری سائیڈ پر جا کر کپڑے تبدیل کئے۔ پرانے کپڑے اور جوتے اس نے ایک شاپر بیگ میں ڈالے اور ایک ڈسٹ بن میں پھینک دیئے۔ میں اس کے ساتھ بیٹھ کر ہوٹل میں آ گیا۔ کوستا اور سبرینہ جاگ رہے تھے۔ وہ کوئی آدھا گھنٹہ تک ہمارے کمرے میں بیٹھے رہے۔ مجھ سے خیریت دریافت کرتے رہے اور پھر واپس اپنے کمرے میں چلے گئے۔

دوسرے دن بارہ بجے کے قریب ہم ہوٹل سے نکل آئے۔ کوستا اور سبرینہ تو سیدھے ہی ہائی وے پر نکل گئے جبکہ ایسگارڈ 10 منٹ ٹھہر کر نکلی۔ میں ہوٹل کی پارکنگ سے ہی ڈگی میں چلا گیا۔ وہ آہستہ آہستہ ڈرائیو کرتے ہوئے ہائی وے پر آ گئی۔ اس نے سبرینہ کو فون کر کے آگے کے حالات پوچھے تو سب ٹھیک تھا۔ اس نے کار کی رفتار بڑھائی اور پھر کار تیز رفتاری سے سڑک پر دوڑنے لگی۔ ہماری منزل مقدونیا کے شہر کمانوہ (KUMANOVO) سے 15 کلومیٹر دور ایک چھوٹا سا گاؤں رونیکا (RUNICA) تھی۔

یہ چھوٹا سا پہاڑی گاؤں اسپانوی نژاد مسلم زمینداروں کا تھا۔ یہاں سے سربیا کا بارڈر 5 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ جبکہ اسی گاؤں سے شمال مغرب کی طرف چھ کلومیٹر کے فاصلے پر کوسوہ (KOSOVA) کا نیم خود مختار علاوہ ہے۔ ایسگارڈ مجھے اس گاؤں میں اتار دیتی، جہاں سے ایجنٹ مجھے وصول کر کے سربیا کا بارڈر کراس کرواتے۔ سربیا (SARBIA) میں کوئی سختی نہیں ہے۔ سربیا سے ایجنٹ بسوں کے ذریعے بلغراڈ (BELGRADE) اور پھر بلغراڈ سے سبوتیچا (SUBOTICA) پہنچا دیتے ہیں۔

صرف مقدونیا کا ملک ہی خطرناک ہے۔ یہاں ایجنٹ ریل کی پٹڑی پر ہی پیدل ڈنکی لگواتے ہیں اور آئے دن حادثات ہوتے رہتے ہیں۔ یہاں ادائیگی یورو میں ہوتی ہے۔ ایک لڑکے کا ایک ہزار یورو، 100 لڑکوں کی ڈنکی ہو تو ایک لاکھ یورو (پاکستانی ایک کروڑ بیس لاکھ روپے) جتنا زیادہ خطرہ ہوتا ہے اتنا زیادہ ہی پیسہ ہوتا ہے۔

مقدونیا کا سفر ڈیڑھ گھنٹے کا تھا اور ایسگارڈ تیز رفتاری سے اس سفر کو طے کر رہی تھی۔ میں گاڑی کی ڈگی میں لیٹا دعائیں کر رہا تھا لیکن شاید میری دعاؤں کی قبولیت کا ابھی وقت نہیں آیا تھا۔ کچھ اور بھی آزمائشیں ابھی رہتی تھیں۔ پولیس کی گاڑی کے سائرن کی آواز آئی اور کار کی رفتار آہستہ ہونے لگی۔ پولیس ایسگارڈ کو رکنے کا اشارہ کر رہی تھی۔ ایسگارڈ نے کار سڑک کے کنارے پر کر کے روکی تھی۔ پولیس والوں نے اس کے پاس آ کر اس سے لائسنس اور پاسپورٹ مانگا۔ ایسگارڈ نے انہیں لائسنس اور پاسپورٹ پکڑا دیا۔

''امریکہ (USA)؟'' پولیس والوں نے اس سے پوچھا تو اس نے سر ہلا دیا۔

''گاڑی کی ڈگی کھولو! ہمیں دیکھنا ہے۔'' ایک پولیس آفیسر نے اس کا پاسپورٹ اور ڈرائیونگ لائسنس واپس کرتے ہوئے کہا۔ میں ڈگی کے اندر ساری گفتگو سن رہا تھا۔

''جی! ایک منٹ میں کھولتی ہوں۔'' اس نے کار کے اندر سے ڈگی کا لیور کھینچا تو کڑک کی آواز سے ڈگی کھل گئی۔

اندر چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ ایک پولیس والے نے آگے بڑھ کر ڈگی کا ڈھکن فل کھول دیا۔ میرے سامنے پولیس والا آیا تو میں نے ایک زوردار دھکا ڈگی کھولنے والے پولیس والے کو مارا اور ڈگی سے باہر چھلانگ لگا دی۔ کار سے باہر آتے ہی میں ہائی وے سے نیچے کی طرف بھاگنے کی کوشش کرنے لگا لیکن ایک پولیس والے نے جلدی سے ٹانگ اڑا دی اور میں منہ کے بل ادھر ہی گر گیا۔ دوسرا پولیس والا پیچھے ہی کھڑا تھا۔ مجھے بھاگنے کا موقع ہی نہ ملا اور اس نے مجھے پکڑ لیا۔ ایک منٹ سے بھی کم وقفے میں انہوں نے مجھے ہتھکڑی لگا دی۔ انہوں نے ایسگارڈ کو بھی کار سے باہر نکال لیا۔ ایک پولیس والے نے اس کا پاسپورٹ اور ڈرائیونگ لائسنس لے لیا اور دوسرے پولیس والے نے کیمرہ نکالا اور تصویریں بنانے لگا۔ انہوں نے ایسگارڈ کو ہتھکڑی پہنانے سے گریز کیا تھا۔ ویسے بھی وہ لڑکی تھی اور میری طرح نہیں بھاگ سکتی تھی۔ ہم دونوں پکڑے گئے تھے۔

''سوری ایسگارڈ! آج میری وجہ سے تمہاری زندگی تباہ ہوگئی ہے۔'' میں اس سے معافی مانگنے لگا۔ وہ امریکی ڈاکٹر آج ایسے ہی میری محبت کی بھینٹ چڑھ گئی تھی۔

''سوری ایسگارڈ! میری قسمت ہی ایسی ہے۔ جو بھی مجھ سے ملتا ہے، بچھڑ جاتا ہے۔'' میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ زندگی بہت آسان ہوتے ہوتے پھر سے مشکل ہوگئی تھی۔

''راضی! اتنی جلدی ہار مان گئے ہو؟ ابھی عشق کے امتحان شروع ہوئے ہیں۔ محبت اتنی آسانی سے مل جائے تو اس کی اہمیت نہیں رہتی۔'' وہ مسلسل میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

''راضی! مجھے تم سے محبت ہوگئی تھی۔ عشق کرنے لگی ہوں تم سے۔۔۔ وہی عشق جو تم نے ایمان سے کیا تھا۔ تم تو آٹھ سال کے لئے معافی مانگ رہے ہو یار! میں تو آٹھ صدیاں بھی تمہاری محبت کی خاطر نکال سکتی ہوں۔ تم

میرے ساتھ رہتے ہو یا مجھ سے دور چلے جاتے ہو۔ یہ ایسگارڈ ہمیشہ تمہاری محبت کی تلاش میں رہے گی۔ تمہارے عشق میں فنا ہو کر ہی قیامت کے دن اس خدا کے دربار جاؤں گی۔'' وہ آہستہ سے چلتی ہوئی میرے پاس آئی اور میری آنکھوں میں دیکھنے لگی۔

''راضی! قیامت کے دن اسلم کے ساتھ ساتھ میں بھی کھڑی ہوں گی۔ اگر وہ ایمان کی محبت مانگے گا تو میں بھی تمہاری محبت کے لئے جھولی پھیلاؤں گی اور پھر دیکھوں گی کہ خدا کس کی جھولی میں کس کی محبت ڈالتا ہے۔'' وہ مجھے گلے سے لگائے مسلسل رو رہی تھی۔

پولیس والے ہمارے چاروں طرف کھڑے تھے۔ دو کاروں میں آٹھ پولیس والے تھے۔ انہوں نے ہیڈ کوارٹر وائرلیس کر دی تھی اور وہ اگلے احکامات کے منتظر تھے۔ میری آواز بند ہو گئی تھی۔ مجھ سے کچھ بھی بولا نہیں جا رہا تھا۔ ایسگارڈ محبت میں بہت آگے نکل چکی تھی۔ وہ اگلے کئی لمحوں تک ایسے ہی مجھ سے لپٹی روتی رہی۔ آخر پولیس والوں کو وائرلیس آ گئی۔ وہ ایسگارڈ کو تھانے جبکہ مجھے ڈی پورٹ کیمپ میں لے جانے لگے تھے۔

''میم! ابھی یہاں سے آپ دونوں الگ ہو جاؤ گے۔ یہ واپس یونان ڈی پورٹ ہو جائے گا اور آپ کو ابھی سکوپیا (SKOPJE) لے جایا جائے گا۔ وہیں آپ کے کیس کا فیصلہ ہو گا۔ اگر کچھ کہنا ہے تو آپ اس سے کچھ کہہ سکتی ہیں۔'' ایک پولیس آفیسر نے آگے بڑھ کر ہمیں علیحدہ کرتے ہوئے کہا۔ ایسگارڈ آہستگی سے مجھ سے علیحدہ ہو گئی۔

''راضی! ایک کس نہیں دو گے؟ تمہارے ہونٹوں کا لمس مجھے آٹھ سال بھلا دے گا۔'' اس نے حسرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں آگے بڑھا تو اس نے اپنا گال آگے کر دیا۔ میں نے ہتھکڑی والے ہاتھوں سے اس کا چہرہ سیدھا کیا اور اس کے جلتے ہوئے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ نرم گلابی ہونٹوں کا اپنا الگ ہی نشہ ہوتا ہے۔ میں ایمان کے ساتھ 6 سال تک رہا تھا لیکن ہماری محبت ہونٹوں تک ہی پہنچی تھی اور ایسگارڈ کی محبت شروع ہی ہونٹوں سے ہوئی تھی۔ جنت کی حوریں شاید اتنی ہی شدت سے محبت کرتی ہیں۔ ایک پولیس افسر نے مجھے جیپ میں بٹھایا اور

جیپ ڈی پورٹ کیمپ کی طرف فراٹے بھرنے لگی۔منزل ابھی بہت دور تھی۔

محبت کا یہ سفر جو بہاولپور کے ایک چھوٹے سے ریگستانی گاؤں سے شروع ہوا،مقدونیا تک پہنچ گیا تھا۔ منزل ابھی بھی دور ہے۔ میں سربیا ہنگری اور آسٹریا سے ہوتا ہوا جرمنی پہنچا اور اٹلی میکسیکو سے ہوتا ہوا امریکہ۔۔۔میں اس سفر کی داستان اگلی کتاب میں لکھوں گا۔میری اگلی کتاب اس سفر کی آخری کتاب ہوگی۔ محبت کی ایک اور طلبگار بھی آ گئی تھی۔۔۔

Continue.....

پنجاب کدوں چاہندا سی انج ٹوٹ جانڑ نوں

آزادی کنوں ملی اے پچھ لو جہانڑ نوں

کنداں پے گیاں نے تاراں لگ گیاں نیں

دونویں سی پر او یکھواج رہ گئے نیں رونڑ نوں

پنجاب کدوں چاہندا سی انج ٹوٹ جانڑ نوں

دلّی تے اسلام آباد دونویں وڈے شہر نیں

ٹینک بندوق توپاں تے جہاز وی ڈھیر نیں

مردے پنجابی ماردے پنجابی خون ساڈا اکو اے

یار چھڈ دیو لڑائی ہیر رانجھا ساڈا اکو اے

وارث شاہ نوں وی اج لگدا اے ویزا تواڈے کول آنڑ نوں

پنجاب کدوں چاہندا سی انج ٹوٹ جانڑ نوں

امرتسر دیاں گلیاں یاد جدوں آؤندیاں

دادا میرا رو پیندا اکھاں میریاں وی بلدیاں

کرو کوئی سبب ایسا دونویں مل جایئے

تسی آؤ ننکانے تے اسی اکھیاں وچھایئے

بابے نانک دی زمین تے راضیؔ ڈردے پر اجیھی پانڑ نوں

پنجاب کدوں چاہندا سی انج ٹوٹ جانڑ نوں

رضوان علی راضیؔ



رضوان علی گھمن اردو ادب کے نئے ابھرتے ہوئے لکھاریوں میں سے ایک ہیں۔ بنیادی طور پر بہاولپور کے ایک چھوٹے سے ریگستانی گاؤں سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ذریعہ معاش کے لئے پچھلے گیارہ سال سے جرمنی میں مقیم ہیں۔

بہاولپور کے ایس ای (صادق ایجرٹن) کالج سے ایف ایس سی تک تعلیم حاصل کی ہے۔ یورپی سیاست اور یورپین طرزِ حکومت کو بڑی تفصیل سے پڑھا ہے۔ اس لئے ان کی اکثر تحریروں میں سیاست اور حکومت کی بڑی گہری جھلک نظر آتی ہے۔

متعدد پاکستانی اور یورپی اخبارات میں کالم لکھ چکے ہیں۔ اردو میں ان کے چند ناول بھی شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں دوسرا خدا اور مہاجر سرِ فہرست ہیں۔ کالا چاند ناول یونان میں رہنے والے پاکستانی مہاجرین کے غم و آلام اور مصائب کو بیان کرتی داستان ہے جس میں پیار، محبت اور رومانس کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔

کتاب کے پسند آنے پر اپنے دوستوں اور چاہنے والوں سے ضرور شیئر کریں اور اپنی مفید آراء سے ضرور آگاہ کریں۔